سید حسن غزنوی

(حیات اور ادبی کارنامے)

ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں

Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi
Preserved in Punjab University Library.

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ

سید حسن غزنوی

حیات اور ادبی کارنامے

(فارسی کے بزرگ شاعر سید حسن غزنوی کی حیات اور فکر و فن کا محققانہ جائزہ)

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

ادارہ یادگار شیفتہ

بہ اشتراک

پاکستان رائٹرس کوآپریٹو سوسائٹی۔ لاہور

129966

جملہ حقوق محفوظ

کمپوزنگ احمد گرافکس۔ کراچی، 219534
طابع
قیمت

ملنے کے پتے
کوآپرابک شاپ اینڈ آرٹ گیلری
۷۰ شاہراہ قائداعظم۔ لاہور
۵۔ ساؤتھ سی یوایونیو۔ ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی فیز۲۔ کراچی

سلّموا یا قومِ بل صلّوا علی الصدر الامین
مصطفیٰ ماجآء الاّ رحمةً للعالمین

(سید حسن)

بارگاہِ مصطفوی (صلی اللہ علیہ و آلہ واصحابہ وسلم) میں ایک نادار "غلام" یہ ناچیز سرمایۂ "مکاتبت" کے لئے نہیں بلکہ دائمی غلامی کے لئے پیش کرتا ہے۔

غلام مصطفیٰ خان

۱۲ ربیع الاول ۱۳۷۱ھ

عرضِ حال

باسمہ تعالیٰ۔ حامداً و مصلیاً

علی گڑھ سے راقم الحروف نے ۱۹۲۹ء میں میٹرک پاس کیا اور ۱۹۳۶ء تک دو ایم اے اور ایل ایل بی کے امتحانات پاس کر کے اپنے وطن جبل پور کو واپس ہوا۔ چند ماہ بے کار رہا۔ پھر ناگپور یونیورسٹی سے ملحقہ کنگ ایڈورڈ امراؤتی (برار) میں دس سال اور مارس کالج ناگ پور میں قریب ایک سال پڑھاتا رہا۔ علی گڑھ کے قیام کے زمانے میں بعض اساتذہ کے تحقیقی کاموں کو دیکھ کر مجھے بھی تحقیق کا شوق پیدا ہوا۔ وہاں سے آنے کے بعد فاضل یگانہ پروفیسر ضیاء احمد ابدایونی" (م ۱۹۷۳ء) سے زیادہ تعلق رہا۔ چنانچہ انھوں نے ۴ مارچ ۱۹۳۸ء کو مجھے گرامی نامہ لکھا اور مشورہ دیا کہ سید حسن غزنوی پر کام کرو۔(۱) میں نے ناگپور یونیورسٹی کو اس موضوع پر کام کرنے کی اجازت کے لیے درخواست دی اور وہ منظور ہو گئی۔ پھر میں نے علی گڑھ، حبیب گنج، رام پور، بریلی، کاکوری، لکھنو کے مختلف کتب خانے، ریواں ریاست، پٹنہ، الہ آباد، بھوپال، عثمانیہ یونیورسٹی، آصفیہ لائبریری، بمبئی کے مختلف کتب خانے اور برہان پور وغیرہ کے کتب خانے دیکھے۔ وہاں سے شاعر کے کلام اور اس کے متعلق تاریخیں اور تذکرے تلاش کیے۔ پھر لندن اور پیرس سے اس شاعر کے دیوان کے عکس حاصل کیے۔ اس معاملے میں ناگ پور یونیورسٹی نے مجھ سے ہر طرح کا تعاون کیا بلکہ میرے بعض تحقیقی مقالات کی بنا پر مجھے بغیر نگراں کے کام کرنے کی اجازت دی۔

شاعر کا کلام دیکھنے سے معلوم ہوا کہ وہ سنائی (م ۵۴۵ھ) کا معاصر تھا، اور اس نے

(۱) راحت الصدور (دیباچہ ص ۱۱) میں ڈاکٹر محمد اقبال نے سید حسن کو فارسی کے بزرگ ترین شعراء میں شمار کیا ہے۔

افغانستان وایران کے مختلف مقامات' بلکہ ہندوستان کی بھی سیر کی تھی۔ اور بغداد وغیرہ کی سیر کرتے ہوئے وہ مدینہ منورہ حاضر ہوا اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک فارسی ترجیع بند پیش کیا جس کا ترجیعی شعر عربی میں یہ تھا۔

سلّموا یا قوم بل صلّوا علی الصدر الامین
مصطفیٰ ماجآء الاّ رحمۃً للعالمین

اس ترجیع بند کے چھ بند ہیں چھٹے بند کا ایک شعر ہے

لافِ فرزندی نیارم زد دریں حضرت ولیک
مدحتے آوردم اینک ' خلعتے بیروں فرست

بعض تذکروں میں ہے کہ روضۂ اقدس سے ایک حلّہ حاصل ہوا اور آواز آئی "یا بنی خذ"

بہر حال اس ترجیع بند کا ترجیعی شعر (عربی والا) بہت مشہور ہوا۔ رومی (م ۶۷۲ھ) نے اسے سنائی کا سمجھ کر اس طرح کہا ہے۔

اے سنائی رو مدد خواہ از روانِ مصطفیٰ
مصطفیٰ ما جآء الا رحمۃ العالمین
(کلیات شمس تبریز۔ لکھنو ۱۳۰۲ھ صفحہ ۶۳۶)

یہ عربی شعر اس قدر مقبول ہے کہ آج بھی میلاد خواں حضرات (ہندوستان اور پاکستان میں) پڑھا کرتے ہیں۔

مقالے میں عرض کیا گیا ہے کہ سید حسن اپنے معاصرین اور متاخرین میں بھی مقبول ہوا ہے۔

ہندوستان کے منشی محمد پادشاہ کی قابلِ فخر فرہنگ انندراج' نیز مصطلحات الشعرا' اور فرہنگ جہانگیری میں سید حسن کے کئی اشعار بطور سند پیش کیے گئے ہیں۔

سید حسن کی سب سے زیادہ مقبولیت غالباً یہ ہے کہ سلطان بہرام شاہ (م ۵۵۲ھ) کے ایک سکّے میں اس کا شعر کندہ تھا۔ راورٹی (طبقات۔ صفحہ ۱۱۰۔ نوٹ نمبر ۱) نے لکھا ہے کہ

بہرام شاہ کے سکّے کی پشت پر یہ شعر کندہ تھا۔

منادی برآمد زہفت آسماں

کہ بہرام شاہ است شاہِ جہاں

راورٹی نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ سکّہ ۵۴۸ھ میں مضروب ہوا۔ اس میں یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ ۵۱۴ھ بہرام شاہ کی تخت نشینی کا وہ پانچواں سال تھا۔ تفصیل دیکھیں۔ راقم الحروف کی کتاب (A History of Behram shah صفحہ ۲۱)۔

سید حسن کی ایک غزل ہے:

اے آرزوے دیدۂ بینا چگونہٴ

وے یارو مونسِ دلِ تنہا چگونہٴ

اے نور چشمِ مہر و گلِ بوستان حسن

ما بے تو درہمیم تو بے ما چگونہ ء

اسی کی تقلید میں فیضی (م ۱۰۰۴ھ) کی غزل ہے:

ما بے تو در غمیم تو بے ما چگونہٴ

بہرام شاہ نے دوبارہ غزنی فتح کیا تو سید حسن نے ایک طویل قصیدہ لکھا۔ اس کا ایک شعر یہ ہے

روم روزِ محرم سال برثے میم دال الحق

برآمد نامور فتحے کزاں گویند تا محشر

یعنی ۲ محرم ۵۴۴ھ میں یہ فتح حاصل ہوئی۔ اس طرح حروف سے سنہ نکالنا انوری (م ۵۸۷ھ) وغیرہ کے یہاں بعد میں ہوا ہے۔ (گو کہ راقم الحروف کا خیال ہے کہ فردوسی اور شاہ نامہ دونوں تاریخی نام ہیں)۔

سید حسن کے کلام کی ایک اور اہمیت جو بعد میں ظاہر ہوئی وہ یہ ہے کہ اس میں بہرام شاہ اور سلطان سنجر کے تاریخی واقعات کے اشارے بہت ہیں۔ راقم الحروف نے سید حسن

اور اس کے معاصرین (نظم و نثر والوں) کے کلام سے تاریخی اشارات جمع کر کے سلطان بہرام شاہ کی تاریخ (انگریزی میں) لکھی تھی۔ جو لاہور سے ۱۹۹۴ء میں اور کراچی سے ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی اور اس پر فاضلِ بے بدل ڈاکٹر محمد شفیع صاحب مرحوم کا پیش لفظ ہے۔

سید حسن پر یہ مقالہ ۱۹۴۶ء / ۱۳۶۷ء میں ناگ پور یونیورسٹی میں پیش کیا گیا تھا۔ مقالے کے دو حصے تھے ایک شاعر سے متعلق تھا جو اردو میں تھا۔ اور دوسرا شاعر کے ممدوح بہرام شاہ کے متعلق تھا اور وہ انگریزی میں تھا۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب نے صرف اردو والے حصے پر ڈگری کی سفارش کی تھی اور ڈاکٹر ہادی حسن صاحب نے صرف انگریزی والے حصے کو ڈگری کے لیے کافی سمجھا تھا۔

ایک بات اور عرض کروں گا کہ مولوی عبدالحق صاحب اسے دہلی سے شائع کرنا چاہتے تھے۔ لیکن یہ مقالہ اور دوسری کتابیں ۱۹۴۷ء کے اواخر میں نذر آتش ہو گئیں۔ اناللّٰہ ....

ایک اور بات یاد آئی کہ آقای تقی مدرس نے ۱۳۲۸ میلادی (یعنی ۱۳۶۸ھ) میں دیوان سید حسن غزنوی' ایران سے شائع کیا تھا' مجھے بعد میں علم ہوا۔ پھر جب علامہ ڈاکٹر محمد شفیع صاحب نے ضمیمہ اورینٹل کالج میگزین (اگست ۱۹۴۸ء تا فروری ۱۹۵۰ء) کے طور پر میرا مقالہ شائع کیا تو اس کے اوراق مجلد کر کے میں نے آقای تقی مدرس کو بھیج دیے۔ انہوں نے ازراہ کرم وہ دیوان اپنے دستخط کے ساتھ ۱۳۳۱ میلادی (یعنی ۱۳۷۱ھ) میں مجھے روانہ فرمایا۔ اس میں ان کا مقدمہ بھی بڑا فاضلانہ ہے لیکن شاید مجھ حقیر کا مقالہ بھی فضلا کو پسند آجائے۔

راقم الحروف اس کتاب کی اشاعت کے لئے اپنے ہم جماعت اور دوست جی اے مدنی مرحوم کے برادر خورد افتخار احمد صاحب عدنی کا ممنون ہے۔ یہ کتاب مدت سے اورینٹل کالج میگزین کے ایک ضمیمے کے طور پر خاموشی کی نیند سو رہی تھی۔ عدنی صاحب کی ہمت، حوصلے اور ذوق اشاعت نے اسے بیدار کیا اور اس عاجز کی اولین تحقیقی کاوش کو اہل علم تک پہنچایا ہے۔ عزیز گرامی ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب اپنے زمانہ طالب علمی ہی سے میرے علمی

کاموں میں معاونت کرتے رہے ہیں۔اس کتاب کی اشاعت میں بھی وہ اوّل سے آخر تک سرگرم رہے۔ اسلم صاحب نے بڑی محنت اور محبت سے کمپوزنگ، تصحیح اور اشاعت کے سارے مرحلوں کی نگرانی کی ہے۔ عزیزی پروفیسر لطیف اللہ صاحب نے پروف بڑی توجہ سے پڑھے۔ اقبال احمد صاحب نے کمپوزنگ میں خصوصی دلچسپی لی۔ راقم الحروف ارشادِ ربانی "هل جزاء الاحسان الا الاحسان" کے مطابق ان سب کا شکر گزار ہے۔دعا ہے کہ اللہ پاک ان سب کے مراتب بلند سے بلند تر فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

بجاہ رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم

۲۔ سندھ یونیورسٹی۔ پرانا کیمپس

حیدر آباد۔ سندھ

۱۱ رجب الرجب ۱۴۱۹ھ

۲۔ نومبر ۱۹۹۸ء

احقر

غلام مصطفیٰ خاں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"سید اشرف الدین حسن غزنوی"

(۱۹۴۱ء)

ٹیپو سلطان شہید علیہ الرحمۃ کے مجموعے میں سے سید حسن غزنوی کا دیوان انڈیا آفس لندن میں محفوظ ہے (Ethe No 931)۔ اس کے اہم مقدمے کے کچھ اقتباسات یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

" الحمد الله رب العالمین والصلواة علی رسوله محمد واله الطاهرین و سلمه تسلیماً کثیراً...... واگرچہ امروز سید امام اجل اظہر انور مرتضی عمدۃ الدین عمدۃ الاسلام افضل الزمان اشرف العالم۔ مفخر اللسانین۔ محترم الحرمین، افتخارِ خراسان ذو الشہادتین، ابو العلی حسن بن محمد الحسینی الغزنوی حشرہ اللہ مع الطاہرین من آباہ واکرمہ برضوانہ ولقانہ روئے در نقابِ تراب آورد بحمد اللہ والمنۃ کہ چندیں ہزار خلف الصدق از نظم رفیع ونثر بدیع تازی وپارسی از انواعِ علوم شرعاً ورسماً وعقلاً یادگار گذاشت کہ ہر یک ازاں گوہرے ثمین ودرے سمین، ست کہ سببِ بقائے ذکرِ جمیلِ این شہید خواہد بود۔ چوں نظم ونثر او در بلاغت وفصاحت اکمل کلمات افاضلِ وقت بود علماے عہد در اقتباسِ آں چہ بدیشان می رسید از انفاس او استفادت می نمودند...... و آن شہید...... در حالِ ارتحال وصیت فرمود کہ اشعارِ تازی وپارسی وانواعِ تصانیف مرا بنام بادشاہ عالم، عادل، منصور، موید، مظفر، خاقانِ اعظم، جلال الدنیا والدین، نصرۃ الاسلام والمسلمین، کہف الامہ

فی العالمین، ذخر الملوک والسلاطین، یمین الدولۃ القاہرہ امین الملۃ الباہرہ، ملک الترک و الصین، شمس الملوک بلکا تنکا بغرا قرا ابو القاسم محمود بن محمد بن محمد بن بغراخان، یمین امیر المومنین، خلد اللہ ملکہ و متع بشبابہ ودینہ ودنیاہ وقہر اعداہ ونصر اولیاہ جمع کنند تا...... رای عالیِ جلال الدنیا والدین را معلوم می شود کہ حسنِ عہد و صدقِ وفا و خلوص ولائے او بحدّے بودہ است کہ در وقتِ مفارقت ازین ممر غرور و انتقال بدان مقر سرور آنچہ زبدۂ عمر و خلاصۂ زندگانی و تحصیل او بودہ جملہ بیادگارِ نثارِ جنابِ کریم کردو دیگر کہ وصلت و قرب و قضائے حقِ خدمت مولف معلوم بر رائے انور گردد و اقتدارِ او بنظر رای آن شہید برافت و عاطفت بدین بندۂ مخلص سوختہ دل نہ گردد...... پس بحکم ارشاتِ این بزرگوار...... حالا اشعار لطیفِ او را بنام جمشیدِ سریرِ سیادت و خورشیدِ آسمانِ سعادت جمع کردہ آمد...... و در مبداء دیوان ابتدا بہ یک دو قصیدہ تازی کردہ آمد تیمن و تبرک را و تقرب بدان صدر انبیا و سید اصفیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہٗ وسلم اذکان ھو بالمدح اولی۔ اگرچہ اشعار تازی خود بنفسہا جمعے مفرد خواہد بود توقع بحسنِ نظر متاملِ این مجموع آنست کہ اگر در نظم یا در نثر وی خللے یا غلطے از تحریفِ حرفے یا تغییر معنیی بیند از منشی داند چو کمالِ حالِ آن شہید در بحارِ علوم خاص و عام را معلوم است...... و آن مخدوم در ایام خود از طلبِ دیگر علوم بجمع کردنِ سخنانِ خود نہ رسیدے و کرا معلوم بود کہ دست قضای بے محابا چنان باکورۂ را از بوستانِ خاندانِ نبوت و چنان ثمرۂ را از شجرۂ باغِ رسالت بدین زودی در خاک افکند و آن ہلالِ نوال و افضال را پیش از رسیدن بہ بدرے عمر بخسوفِ وفات متواری گرداند غرض آنست کہ اگر بر زلتے و قوف افتد عیب از مولف مکلف نہ بینند کہ من صنّف فقد استھدف و بہ اصلاح منت نہند و مدد دہد۔ تا باقی تصانیف او بہ قوت ایشان بر حکمِ وصیتِ آن شہید جمع شود و بہ اربابِ فضیلت رسد کہ حقوقِ دینی و دنیاوی بیست سالۂ وی در ذمّتِ من است و مدتے مدید بود تا این ضعیف از فرطِ ولائے آن شہید بہ غربت در خدمت او غربت را بر قربتِ اقارب اختیار کردہ بود و مولد و منشا را وداع کردہ اکنون عزیمتِ مصمم

است کہ بقیتِ عمر در خدمتِ تربت و نشر فضل و منقبت او گذارد و بہ جمیع تالیفات و شرح تصنیفات او مشغول باشد کہ چوں سفینۂ عمر بہ ساحل رسد چنان کہ در دنیا مقبولِ آن سعیدِ شہید بود در آخرت از شفاعت وے بے نصیب نہ ماند ......"

مقدمے کے ان اقتباسات سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ مقدمہ لکھنے والا اس شاعر کا شاگرد یا معتقد ہے جس کا بیس سال سے تعلق ہے اور وہ ایک مدت سے اپنے وطن (غزنین) کو چھوڑ کر غریب الوطنی میں اپنے استاد کے ساتھ رہا تھا۔

۲۔ شاعر کا پورا نام مع القاب یہ ہے: سید امام اجل، عمدۃ الدین، عمدۃ الاسلام افضل الزمان، اشرف العالم، مفخر اللسانین، محترم الحرمین، ذوالشہادتین، ابوالعلی حسن بن محمد الحسینی الغزنوی، ان القاب پر بحث آگے آئے گی۔

۳۔ شاعر کا انتقال ابوالقاسم محمود خان (التوفی ۵۵۷ = ۱۱۶۲ھ) کی حکومت کے زمانے میں ہوا۔ بلکہ اس عہد میں شاگرد نے اشعار کا مجموعہ بھی مرتب کر لیا تھا۔ اسی لئے اس بادشاہ کے لئے شاگرد نے خلد اللہ ملکہ ...... وغیرہ دعائیہ کلمے کہے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ عام تاریخوں میں اس بادشاہ (بلکہ خاقان) کو "محمود خان بن محمد بن محمد بن بغرا خان" لکھا ہے۔ جس کی تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔

۴۔ ان الفاظ سے کہ "اشعار تازی خود بنفسہا جمع مفرد خواہد بود" معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے عربی اشعار بھی خاصی بڑی تعداد میں لکھے ہوں گے۔ دوسرے الفاظ ایسے بھی ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی دوسری تصانیف بھی تھیں۔ لیکن افسوس ہے کہ سوائے کلیات فارسی کے اب سب ناپید ہیں۔

۵۔ شاعر کی وصیت کے مطابق اس کی تمام تصانیف ممدوح مذکور کے نام معنون ہونے والی تھیں۔

۶۔ شاعر کو جگہ جگہ شہید کہا گیا ہے۔ اور "ذوالشہادتین" بھی کہا ہے۔ جس سے

خیال ہو سکتا ہے کہ غریب الوطنی اور طالب علم (و آن مخدوم در ایامِ خود از طلبِ دیگر علوم......) کے دوران میں انتقال ہوا ہے۔(۱)

آ گے چل کر ہم ان اہم معلومات سے فائدہ اٹھائیں گے اور اب تفصیلی بحث پر آتے ہیں۔

نام کنیت اور القاب

شاعر کا نام حسن تھا۔ اور حسینی سید ہونے کے متعلق خود ایک شعر میں کہتا ہے ؎

از پیِ آنکہ حسن نام و حسینی نسبم

کار نا سازم چون کارِ حسین و حسن ست (۲)

اسی نسب کے متعلق ایک اور جگہ کہتا ہے اور فخر کرتا ہے ؎

داند جہان کہ قرۃِ عینِ پیمبرم

شایستہ میوۂ دلِ زہرا و حیدرم (۳)

"حسینی" سیادت کے متعلق شاعر کا مقدمہ بھی شہادت دینے کے لئے کافی تھا۔ اس کے علاوہ قریب العہد تصنیف یعنی راحتؔ الصدور (مصنفہ ۵۹۹ھ = ۱۲۰۲ء صفحہ ۱۸۷) بھی شاہد ہے۔ لیکن کنیت "ابو العلی" صرف شاگردوں کے بیان میں ملتی ہے۔

شاعر کے القاب مختلف تذکروں میں مختلف ہیں۔ "تاج الدین" دو جگہ ہے۔ ایک تو حسن بن لطف اللہ کے "میخانہ" (ق ۱۲۰ الف۔ برٹش میوزیم سپلیمنٹ ۱۰۷) میں۔ اور دوسرے اسی شاعر کے اس دیوان کے مقدمہ میں ہے جس کا نگارندہ ملک محمد انیس اخوند ہے۔ اور رام پور کے شاہی کتاب خانہ میں محفوظ ہے۔ "تذکرہ حسینی" (ق ۱۶۳ الف۔ حبیب گنج) اور انڈیا آفس کی فہرست مخطوطاتِ فارسیہ (صفحہ ۲۰۴۔ ۱۱۳ انڈکس) میں "شرف الدینؒ" ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اس کے شروع کا الف کاتب کے قلم سے رہ گیا ہے۔ اور نقل کرنے والوں کو اس کی ضرورت کا گمان بھی نہ ہوا ہو گا کیونکہ "اشرف الدین" لقب دوسرے مستند تذکروں میں ملتا ہے۔ مثلاً لباب الالباب (ج ۲۔ ص۔ ۱۰۵) مجمع الفصحا (ج ۱۔ ص ۱۹۲) ریاض العارفین (ص

۱۸۵) ریاض الشعرا (ق ۹۶/ الف۔ امپیریل لائبریری کلکتہ) وغیرہ۔

"اشرف الدین" یا محض اشرف (اشرف العالم) شاعر کے شاگرد کے مقدمے میں بھی ہے۔ اور راحت الصدور میں اکثر مقامات پر یہی لقب (اشرف) پایا جاتا ہے، یعنی صفحات ۵۷۔ ۱۸۷۔ ۱۹۳۔ ۲۴۵۔ ۲۵۱۔ ۲۷۵۔ ۳۱۳ وغیرہ پر۔

جمال الدین محمد عبدالرزاق اصفہانی (م سنہ ۵۸۸ھ = ۱۱۹۲ء) نے بھی ایک قصیدہ میں جو اسی شاعر کی تقلید میں ہے اسے صرف "اشرف" کہا ہے۔

بزرگوارا، صدرا، قصیدۂ گفتم
کہ خواستند ر دیفش بہ امتحان آتش
بدان نہاد کہ گفتند اشرف و وطواط
ازیں نمط دو قصیدہ ردیف شاں آتش (۴)

(۱) حسن کے شاگرد کے علاوہ (۲) راحت الصدور اور (۳) جمال الدین محمد عبدالرزاق کی شہادت بھی وقیع سمجھی جائے گی۔ کیونکہ یہ سب ایک ہی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔

شاگرد نے اس کو "عمدۃ الدین" بھی لکھا ہے۔ لیکن یہ محض عقیدت مندی کی بنا پر معلوم ہوتا ہے۔ ذوالشہادتین" بھی اس نے کہا ہے اور یہ راحت الصدور (ص ۱۸۷) میں بھی ملتا ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ اس لقب کی شہرت ضرور رہی ہوگی اور کیوں نہ ہو جبکہ یہ عظیم الشان لقب اور خطاب سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی حضرت خزیمہ بن ثابتؓ سے منسوب تھا۔ جن کی نسل سے صاحبِ تاریخ بیہق ہیں۔ (۵) اب ذرا ملاحظہ فرمائیں کہ متاخرین ان کو کن القاب کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ نمونہ کے طور پر تقی اوحدی کی عرفات العاشقین (ق ۴ ب۔ حبیب گنج) کا اقتباسِ ذیل ملاحظہ فرمایئے۔ دیکھئے وہ کس طرح گل افشانیاں کرتے ہیں۔

"جمشید مسندِ مراتب، خورشیدِ مشرقِ مناقب، درخشندہ نجمِ ثاقب، سید المدققین، سند

المحققین" اشرف الکاملین، احسن الواصلین، صاحبِ کمالات صوری و معنوی، اشرف الدین حسن...... الغزنوی، نیرّ آفاقِ سخن، مظہر اخلاقِ حسن، مرشد بہ وادیِ سخندانی رہبر شوارعِ معانی، خسر واقلیمِ حال و قال۔ جامعِ صفاتِ جلال و جمال است......"

ہم نام

شاعر کے والد کا نام شاگرد کے مقدمہ مذکورہ میں اور راحت الصدور (ص ۱۸۷) میں محمد ہے۔ اور یہی صحیح مانا جائے گا۔ لیکن غالباً سب سے پہلے محمد عوفی نے (لباب الالباب ج ۲۔ ص۔ ۲۷۰) ناصر علوی لکھا ہے اور اسی کی تقلید میں ریاض الشعرا (ق ۹۶ الف) مخزن الغرائب (ج ا حبیب گنج) مجمع الفصحا (ج ا۔ ص ۱۹۲) ہفت اقلیم (ق ۱۱۹ ب۔ رام پور) عرفات العاشقین (ق ۴۔ ب، حبیب گنج) وغیرہ میں یہی نام پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ نام دراصل ایک شاعر شرف الدین محمد غزنوی کے والد کا تھا۔ سنائی (۵۴۵ھ۔ ۱۱۵۰ء) نے اس کی مدح کی ہے:

"بمدح العمید سید شرف الدین محمدؒ بن ناصر العلوی":

بتے کہ گر فگند یک نظر بر آتش و آب
شود ز لطفِ جمالش مصور آتش و آب
سرِ محامدِ سید محمد آن کہ شدہ ست
بلند ہمت و تطمش بہ گوہر آتش و آب
بہ ہفت کشورِ نثرت رسید و نظم آرے
جدا کہ دید خود آن ہیچ کشور آتش و آب
زقدرِ نظم تو دارندہ بہرہ زان بشدند
چو خاک و باد کثیف و مدور آتش و آب (۶)

مسعود سعد سلمان (م ۵۱۵ھ۔ ۱۱۲۱ء) نے بھی اس کی شاعری کی تعریف میں ایک

قطعہ لکھا تھا۔ جو اس طرح شروع ہوتا ہے

شعر سید محمدِ ناصر

دلِ من شاد کرد و خرم کرد(۷)

لباب الالباب (ج ۲۔ ص ۲۶۷) میں غلطی سے اس شاعر کو ہمارے سید حسن کا بڑا بھائی کہا گیا ہے اور ہفت اقلیم (ق ۱۲۰۔ الف) میں ایک شاعر (جو دراصل مسعودِ سعد ہے) کے اشعار جو اسی سید حسن بن ناصر علوی (یعنی محمدِ ناصر کے بھائی) کے مرثیے کے ہیں ہمارے شاعر سے متعلق کر دیئے گئے ہیں' وہ اشعار یہ ہیں:

بر تو سید حسن دلم سوزد
کہ چو تو ہیچ غمگسار نہ داشت
تنِ من زار بر تو می نالد
کہ تنم ہیچ چون تو یار نہ داشت
زان ترا خاک در کنار گرفت
کہ چو تو شاہ درکنار نہ داشت
زان اجل اختیارِ جانِ تو کرد
کہ دگر چون تو اختیار نہ داشت
سی نہ شد سالِ عمر تو دیحک
سالِ زادِ ترا شمار نہ داشت
زار مسعود ازآں ہمی گرید
کہ بحق ماتمِ تو زار نہ داشت
ماتمِ روزگار داشتہ ام
کہ دگر چون تو روزگار نہ داشت (۸)

مسعود سعد سلمان (م ۵۱۵ھ = ۱۱۲۱ء) کے مذکورہ بالا اشعار میں سے پانچواں شعر

صاف ظاہر کر رہا ہے کہ وہ سید حسن (جو سید محمد بن ناصر علوی کا بھائی تھا) (۹) تقریباً تیس سال کی عمر میں اور مسعود سعد کی زندگی میں یعنی ۵۱۵ھ سے پہلے قضا کر گیا تھا۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ ہمارا شاعر سید حسن (بن محمد الحسینی) جو اس عہد سے ۴۰۔۴۱ سال بعد تک زندہ رہا۔ یقیناً دوسرا شخص ہے۔ اور محمد عوفی اور صاحبِ ہفت اقلیم کو محض ہمنام ہونے کی وجہ سے دھوکا ہوا

جامعہ عثمانیہ کے ایک مخطوطہ ۸۷۸ میں بھی ایک سید حسن کا کچھ کلام ملتا ہے لیکن وہ بہت بعد میں ہوا ہوگا۔ کیونکہ اس کے ورق ۱۲۹۔ب میں غالباً شہاب الدین غوری کی مدح ہے ؎

پادشاہِ جہاں شہاب الدین

اور شہاب الدین کے بھانجے غازی (لباب۔ ج۔ ا ص ۳۳۱) والیِ ہرات (التوفی ۶۰۰ھ) کے صدر مہذب الدین (منصور بن علی اسفزاری؟) کی مدح بھی اس کے ورق ۱۲۹۔ الف میں موجود ہے۔ ورق ۱۲۹ب میں ایک اور صدر کی مدح ہے۔

بہاء الدین خلفِ صدقِ خاندانِ ادیب

اور اس سید حسن کا کوئی استاد شرف الدین (شفروہ؟) ہے جس کی مدح میں (ق ۱۲۹۔ب) وہ کہتا ہے:

شرف الدین زطبع چون دریا
دادِ نظمِ گہر فشاں دادی
کاغذے پر زلولوے منظوم
سوئے شاگردِ خود فرستادی
سخنم تو طراوت افزودم
کہ ہمہ عمر جان فزا بادی
بر منت مننت فراوان است
مننت چہ کہ حقِ استادی

سنائی کے متعلق اسی شاعر نے (ق ۱۲۸۔ب) ایک قصہ لکھا ہے۔

آن شنیدی کہ مر سنائی را
گفت روزے یکے کہ اے مشہور
چہ شود گر بیک دو بیت مرا
درجہان ہمچو خود کنی مذکور
خواجہ گفتا کہ ذکرِ باقی را
شعر حشرے ست بے توسطِ صور
زندۂ گر سخن بود کم نیست
زان کہ دارد بہشت حور و قصور

ولادت

شاعر کے وطن کے متعلق سب تذکرے متفق ہیں کہ وہ غزنین کا تھا۔ اور شاگرد کی تصدیق (مقدمہ) کے بعد کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا۔ اہل غزنین تو اب بھی پورے آٹھ سو سال گزر جانے کے بعد اس پر فخر کرتے ہیں۔ خود شاعر نے ایک جگہ امام برہان الدین ابوالحسن علی بن ناصر غزنوی المقلب بہ "بریان گر" (جس کے نام ایک منظوم خط حدیقہ سنائی کے آخر میں ہے اور جو بغداد میں تھا) کی مدح میں غزنین وطن کے متعلق اشارہ کیا ہے ۔

امام حق برہانِ دین لسان الحق
توئی کہ خامہ زدستِ تو مے گسار شود
منم کہ بازِ ہمایونِ آشیانِ توام
وفائے باز نہ پرواز راشکار شود (۱۰)

شاعر کے سال ولادت کے متعلق سب تاریخیں اور تذکرے خاموش ہیں لیکن اس کے کلام سے کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس نے ۵۰۰ھ = ۱۱۰۶ء (۱۱) میں فخر الملک مظفر بن

نظام الملک کے قتل پر اس کے بیٹے نظام الملک صدر الدین محمد کے درجۂ وزارت پانے پر یہ قصیدہ لکھا تھا۔

نسیم عدل ہمی آید از ہوائے جہان
شعاعِ بخت ہمی تابداز بقائے جہان
خرد کہ جای ندارد نہ داند این کہ چہ کرد
خدایگانِ جہان از کرم بجائے جہان
سزد کہ دولت و دین ہر دو تہنیت گویند
خدا یگانِ جہان رابہ کد خدائے جہان
نظامِ ملک محمد کو یمنِ صورت او
خجستہ آمد بر ملک پادشائے جہان
بکار بستہ میانِ وگرہ کشادہ ' ببین
کہ نقش بندیِ او شد گرہ کشای جہان
تو آمدی بسزا صاحبِ جہاں ورنہ
نہ کردہ بود مہیا فلک سزای جہان
مراست۔ ملکِ سخن مطلق و تومی دانی '
اگر نہ دانی ' داند ہمی خدای جہان

آخری شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر پہلے بھی کافی شاعری کر چکا ہے۔ لیکن ہمیں اس کے کلّیات میں یہی اشعار قدیم ترین معلوم ہوتے ہیں۔ اب اس سے خیال ہوتا ہے کہ اس قصیدے کے لکھنے کے وقت یعنی ۵۰۰ھ = ۱۱۰۶ء میں اس کی عمر کم از کم بیس سال کی تو ضرور ہو چکی ہو گی۔ اس لئے ایک موٹا حساب لگایا جائے تو یہی کہنا پڑے گا کہ وہ ۴۸۰ھ۔ ۱۰۸۷ء تک ضرور پیدا ہو چکا ہو گا۔ بہر حال یہ محض گمان ہے۔ کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہے۔

تعلم و تعلم

تتمۂ صوان الحکمہ (ص ۹۶۔ فارسی۔ لاہور ۱۹۳۹ء) سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سید اشرف حسن غزنوی کے استاد محمد بن مسعود غزنوی تھے۔ جو فلسفی' ادیب اور مہندس بھی تھے۔ اورانہوں نے فلسفہ پر ایک کتاب (۱۲) احیاءالحق لکھی تھی۔ چونکہ ہم کو حسن کا صرف کلیات ملتا ہے اور بقیہ تصانیف نہیں ملتیں۔ اس لئے ہم اس قدر اندازہ ضرور لگا سکتے ہیں کہ اس نے اپنے استاد سے صرف ادب کی تعلیم حاصل کی۔ کیونکہ اس کے کلام میں جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے فلسفہ یا دوسرے علوم کا کوئی عکس نظر نہیں آتا۔ ادب اور شاعری کا دور دورہ اس عہد میں زیادہ تھا۔ اس لئے اسی طرف زیادہ توجہ کی ہوگی اور یہ کیا کم ہے کہ اس کی تقلید میں بڑے بڑے شعرا مثلاً جمال الدین محمد عبدالرزاق (م ۵۸۸ھ۔ ۱۱۹۲ء) مجیر الدین بیلقانی (م ۵۹۴ھ۔ ۱۱۹۸ء) کمال الدین اسما

یہ قصیدے محمود خان بغراخانی (م ۵۵۷ھ۔ ۱۱۶۲ء) کی مدح میں ہیں۔ اور ان کی تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔ ہمارا شاعر تحصیل علوم میں "اطلب العلم من المهد الی اللحد" پر عامل معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس کے شاگرد کے اس قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ...... "آن مخدوم در ایام خود از طلب دیگر علوم بجمع کردنِ سخنانِ خود نہ رسیدے"۔ لیکن صرف اس اجمال سے علوم کی تفصیل پر کوئی روشنی نہیں پڑتی اور کلام سے بھی اس کے دوسرے کمالات کا پتہ نہیں چلتا۔

مجمع الفصحا (ج ۱۔ ص ۳۵۲) اور دولت شاہ (براؤن۔ ص ۷۱) سے حسن کا ایک شاگرد عماد زوزنی (۱۷) معلوم ہوتا ہے۔ اور انڈیا آفس کے مذکورہ مخطوطہ نمبر ۹۳۱ کا مقدمہ نگار ایک دوسرا شاگرد ہے۔ مقدمہ کے کچھ اقتباسات ہم اوپر دے چکے ہیں۔ کچھ اور پیش کئے جاتے ہیں۔ جس سے شاگرد کی قابلیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ "الحمد لله رب العالمين والصلواة و السلام على رسوله محمد و اله الطاهرين و سلم تسليماً كثيراً كثيرا۔ واجب است برارباب عقل وفطنت، شرفِ نطق وفضیلتِ سخن کہ آدمی از حیوانات دیگر ممیز است ولازم است برارباب علم و حکمت لطائف وظرائف طبع دانستن و شناختن کہ خردمند از غیر مستثناست و بحقیقت آدمی شجرے بدیع است کہ از و ثمراتِ کلماتِ غریب می زاید و نہالی شریف است کہ آز و میوۂ معقولاتِ عجیب می آید و عجب تر آن کہ درخت کہ جسم / جوہر است فانی می شود و میوۂ کہ عرض است باقی می ماند و متکلمے کہ موصوفِ مطلق است مجہول و معدوم می شود، وکلامے کہ صفتِ محض است موجود و معلوم می نماید و اگر چہ سخن عرض است، غرض اصلیِ آدمی بہ وی باز بستہ است کہ شرفِ مردم بقدر معالی سخن متعالی می شود و رتبت آدمی بہ اندازۂ بلاغتِ او مترقی می گردد و صیتِ شمایل خردمند او را زندہ میدارد و آوازۂ فضائل ہنرمند او را تازہ می نماید وما يعقلها الا العالمون...... پرواداشتہ نیامد کہ دررِ غرر در سلکِ تالیف و تصنیف منظوم و منثور منتظم بگشتے و آن شہید گوئی بنور الہی المومن ینظر بنور الرب عزوجل...... می دید کانہ ینظر الی الغیب من ستر دقیق کہ در حالِ ارتحال وصیت فرمود...... وغیرہ۔

ان اقتباسات کے اندارج سے مقصد یہ ہے کہ شاگرد کی قابلیت کا اندازہ ہو سکے اور یہ

129966

بھی معلوم ہو سکے کہ ایسی مرصع نثر اس زمانے میں رائج تھی۔

یہ ہے جو کچھ کہ ہم حسن کی تعلیم و تعلم کے متعلق جانتے ہیں۔اس کے علاوہ کوئی معلومات حاصل نہیں ہیں۔

واقعاتِ زندگی

حسن کے واقعات زندگی کے لئے تاریخیں اور تذکرے بہت کم ہماری رہنمائی کرتے ہیں' البتہ اس کے کلام سے بہت کچھ اخذ کیا جاسکتا ہے اور وہ یہ ہے:

سید حسن نے ایسے زمانے میں آنکھ کھولی جبکہ فارسی کے بڑے بڑے شعرا پیدا ہو چکے تھے۔اور خود معاصرین میں معزی (۱۸) (م ۵۴۲ھ۔۱۱۴۷ء) سنائی (م ۵۴۵ھ۔۱۱۵۰ء) عمادی (۱۹) (م تا ۵۴۵ھ۔۱۱۵۰ء)' عثمان مختاری (۲۰) (م ۵۴۴ھ۔۱۱۴۹ء) ادیب صابر (۲۱) (م ۵۴۷ھ۔۱۱۵۲ء) وطواط (م ۵۷۸ھ۔۱۱۸۲ء) سوزنی (۲۲) (م ۵۶۹ھ۔۱۱۷۳ء) جیسے متعدد اکابر شعرا موجود تھے' اور ان سب کی شاعری کا دارومدار زیادہ تر قصیدہ گوئی پر تھا۔ چنانچہ حسن نے بھی اپنی شاعری کی ابتدا قصیدہ گوئی سے کی۔لیکن شاید وطن کا ماحول راس نہ آیا' تو وہ سنجر کے دربار میں پہنچا۔جہاں اس نے ۵۰۰ھ۔۱۱۰۶ء میں فخر الملک مظفر بن نظام الملک کے قتل کے بعد اس کے بیٹے نظام الملک صدر الدین محمد کو درجہ وزارت (۲۳) حاصل ہونے پر ایک قصیدہ پڑھا' جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔اس کا مطلع یہ ہے ؎

نسیمِ عدل ہمی آید از ہوائے جہان
شعاعِ بخت ہمی تابد از لقائے جہان

اس وقت شاید صرف اسی ممدوح سے ہمارا شاعر تعلق پیدا کر چکا تھا۔اور اگر کسی اور سے بھی تعلق تھا' تو اس کے موجودہ کلام سے ہم کو معلوم نہیں ہوتا۔پھر وہ شاید سنجر کی فوج کی معیت ہی میں ۵۱۰ھ۔۱۱۱۷ء غزنین آیا ہوگا اور اس نے بہرام شاہ کی تخت نشینی پر ایک قصیدہ پڑھا جس کا مطلع یہ ہے ؎

منادی بر آمد زہفت آسمان
کہ بہرام شاہ است شاہِ جہان (۲۴)

بہرام شاہ کی تخت نشینی کے متعلق ایک دوبیتی بھی ملتی ہے، جس میں لفظ "یمینے" سے مراد اس کا خطاب "یمین الدولہ" ہو گا۔

شاہا بز تخت بہ نشینے باید
چون شاہ نشست آفرینے باید
بر تختِ فلک ہمین یمینے باید
برجائے چنان شاہ چنینے باید (۲۵)

سنجر نے جب بہرام شاہ کو تخت نشین کرایا تو جیسا کہ ہم تاریخ بہرام شاہی میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں، وہ چالیس دن یعنی جمعہ یکم ذی الحجہ ۵۱۰ھ (۶/اپریل ۱۱۱۷ء) تک غزنین میں رہا۔ یہیں "نوروز" اور "نوبہار" کا زمانہ بھی گزرا ہو گا۔ ہمارے شاعر نے بہرام شاہ کے اسی زمانہ یعنی تخت نشینی کے عہد کو اس طرح یاد کیا ہے۔

بشگفت در بہارِ سعادت نہالِ ملک
تازہ ست روی بخت کہ نو گشت سالِ ملک
از چشم گوش ساز کہ بی ترجمان وصوت
گوید ہمی ثنائے شہنشاہ حالِ ملک
خورشید سائبان کند از نور وقتِ بار
تا چشم اختران نہ رسد در کمالِ ملک
عین جمالِ ملک خداوند عالم است
عین الکمال دور ز عین جمالِ ملک
پشت سپاہ و روی سپہر و پناہِ دین
آرامِ تخت و رفعتِ تاج و جلالِ ملک

شد پاسبان سیاستِ بیدار او چنانک
فتنہ بخواب پیش نماید خیالِ ملک
از حملۂ تو خیزد بادِ وزانِ فتح
وز رحمتِ تو زاید آبِ زلالِ ملک
از آفتابِ روی تو چون روزِ نو بہار
ہر ساعتے فراغ تراست این مجالِ ملک
ایام را مباد فراق از لقاے تو
از عمر خویش برخورو باز از وصالِ ملک (۲۶)

اس قصیدے میں جو برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کے نسخوں سے لیا گیا ہے' ممدوح کا نام نہیں ملتا۔ لیکن اسی کا ایک شعر بدایونی کی منتخب التواریخ (ج ا۔ ص ۴۰' کلکتہ ۱۸۶۸ء) میں ملتا ہے جو بہرام شاہ ہی کی مدح سے متعلق ہے۔

بہرام شاہ کز ہوسِ لفظِ شکر بیش
طوطی برون دہد پس ازین نونہالِ ملک

غرض کہ اس قصیدے (ا۔۸) سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہار کا زمانہ تھا جبکہ بہرام شاہ کا سالِ جلوس (شعر ا۔ ۲۔ ۳) شروع ہوا۔ اسی زمانے میں سنجر نے محمودی خزانوں پر قبضہ کر کے انہیں اسی نظام الملک محمد کے سپرد کر دیا تھا۔ سید حسن نے وزیر کے اس اعزاز اور خلعت کے حصول پر ایک قصیدہ لکھا تھا' جس کے کچھ اشعار یہ ہیں:

مرا بہ وقت سحر دوش مژدہ داد نسیم
کہ شہر یارِ جہان پادشاہِ ہفت اقلیم
خزانہ ہائے ممالک ہمہ مفوض کرد
برائے آن کہ بحق یافت درجہان تقدیم

نظامِ ملک و قوامِ جہان خداوندے
کہ کرد جانب اورا خدایگان تعظیم
یگانہ صاحبِ عادل محمد آن کہ بود
بنزدِ جودش دریا بخیل و ابرلئیم
بزرگوارا بنود عجب کہ شاہِ جہان
گزید بہر خزائن ترا حفیظ و علیم
تو کوہِ حلمی و شاہ آفتاب' معلوم است
کہ کوہ باشد گنجورِ افتاب و مقیم
کنون بدیع نہ باشد کہ شکلِ تو سازد
برای نقدِ خزانہ زمہر و مہ زر و سیم
خجستہ خلعتِ شاہ جہان چو پو شیدی
بطالعے کہ تولّا کند بدو تقویم
چونائے دشمنِ جاہِ تو باد بپاید
کہ ہمچو ابر زند طبل رابہ زیرِ گلیم
ردا و چترِ تو شاہِ جہان چناں بادا
کہ آفتابِ فلک سازد افسرو دیہیم (۲۷)

ان اشعار میں سے دوسرا اور پانچواں شعر صاف ظاہر کر رہا ہے کہ یہ وزیر ''خزانہائی ممالک'' کا محافظ بنایا گیا تھا۔ اور آٹھویں شعر میں خلعت ملنے کا بھی ذکر ہے۔ آخری شعر سے واضح ہوتا ہے کہ شاعر نے ''شاہ جہان'' (سنجر) کی موجودگی میں یہ قصیدہ پڑھا ہوگا۔ لیکن وزیر کی بد قسمتی سے یہ اعزاز عرصے تک قائم نہیں رہا۔ آثار الوزراء (ق ۱۷۱۔الف بانکی پور) دستور الوزراء (ص ۱۸۹۔ طہران ۱۳۱۷ء) حبیب السیر (جزوِ چہارم۔ ج ۲۔ ص ۱۰۰) وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ (نظام الملک محمد) دراخذِ اموالِ سلطانی دلیری بسیاری نمود و

در آوان کہ سلطان (سنجر) دار الملکِ غزنین را مسخر و مفتوح گردانید دستِ تصرف بقبضِ جواہر گراں مایہ در خزاینِ آلِ سبکتگین موجود بود دراز کرد این معنی بہ عرضِ سلطان رسید۔ حکمِ عالی بقتلِ او صدور یافتہ بعضے از متجندہ صدر الدین (محمد) را بہ ضربِ گرز چماق ہلاک ساختند......"

چنانچہ یہ وزیر ۵۱۱ھ-۱۱۱۷ء میں سنجر کی غزنین واپسی پر مارا گیا ہوگا اسی ابتدائی عہد میں سید حسن نے غزنین میں یہ "بیتہائے امتحانی" بہرام شاہ کے دربار میں پیش کیے تھے۔

خاک را از باد بوئے مہربانی آمدہ ست
در دِہ آن آتش کہ آبِ زندگانی آمدہ ست
نرگسِ خوشبوی مخمورِ طبیعی خواستہ ست
بیدِ خرم روئے سرمستِ جوانی آمدہ ست
باغِ مہمان دوست' برگ میزبانی ساختہ ست
مرغِ اندک زاد' دربسیار دانی آمدہ ست
پیش تختِ شاہ چون من طوطیِ شکر فشان
بلبلم خوش ترکہ او را مداح خوانی آمدہ ست
خسروِ اعظم' خداوندِ جہان بہرام آنک
رسم او جان بخشی و عالم ستانی آمدہ ست
بندہ رابخشے ست درہر فن کہ شعر فارسی
چشمِ زخمش راچو خارِ گلستانی آمدہ ست
لیک حرصِ بندگی و آرزوئے مدح تو
موجب این بیتہائے امتحانی آمدہ ست
چون تو درہر کار سلطانی و خاصہ در سخن
من چہ گویَم کاین بدیہہ چندگانی آمدہ ست

اینک از اقبالِ تو پرداختہ شد خدمتے
کاندکش الفاظ و بسیارش معانی آمدہ ست
دُرِّ او در آب قدرت آشنا ور آن چنانک
راست گوئی، گوہر تیغِ یمانی آمدہ ست
گرم بکشادم قضاے برسرِ خوان شمات
گرچہ شیرین نیست بارے ناردانی آمدہ ست

چھٹے، ساتویں اور آٹھویں شعر سے واضح ہوتا ہے کہ شاعر شروع شروع میں یہ قصیدہ لکھ رہا ہے اور کچھ فیضیاب بھی ہو چکا ہے، لیکن مسابقت کے لئے "بدیہہ" اور "بیتہائے امتحانی" بھی لکھ رہا ہے۔ اس قصیدے کے متعلق یہاں کچھ بحث ضروری ہے۔ وہ یہ کہ یہی قصیدہ سنائی کے دو مطبوعہ دیوانوں (یعنی طہران ایڈیشن ۔۱۳۲۰۔ ص ۷۹ بعد۔ اور بمبئی ایڈیشن ص ۱۹ بعد) میں ملتا ہے اور وہ بہرام شاہ کی مدح میں نہیں بلکہ سنجر کی تخت نشینی کی تہنیت میں ہے۔ جیساکہ ان میں یہ شعر ہے:

چون بہ سلطانی نشستی تہنیت گویم ترا
ای کہ اسلافِ ترا سلطان نشانی آمدہ ست

اور اوپر کے بارھویں شعر کی جگہ یہ ہے:

برسر خوانِ عمادی من کشادم این فقع
گرچہ شیرین نیست بارے ناردانی آمدہ ست

چنانچہ اس شعر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اوپر کا قصیدہ جس میں "بدیہہ" اور بیتہائے امتحانی" ہیں وہ دراصل عمادی غزنوی کے مقابلہ پر لکھا گیا تھا۔ لیکن اب یہ ثابت کرنا ہے کہ یہ قصیدہ سنائی اور سید حسن میں سے کس کا ہو سکتا ہے۔ سنائی کے مطبوعہ نسخوں کے علاوہ کسی اور نسخے میں یہ قصیدہ کم از کم ہمارے ملک میں نہیں ملتا۔ بانکی پور میں دیوان سنائی کا جو نسخہ ہے، اس میں نہیں ہے۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں دو مجموعے ہیں۔ ایک ۱۰۴۵ھ کا لکھا ہوا ہے اور دوسرا

بغیر تاریخ کے ہے۔ اور ان دونوں میں یہ قصیدہ نہیں ہے۔ جامعہ عثمانیہ اور مکرمی پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب کے نسخوں میں بھی نہیں ہے۔ لیکن یہ نسخے ناقص ہیں، اور اس کے برعکس سید حسن کے دو مکمل نسخے (برٹش میوزیم ۴۵۱۴ اور انڈیا آفس ۹۳۱) اور دو ناقص نسخے (جامعہ عثمانیہ اور پروفیسر صاحب موصوف کا نسخہ) اس قصیدے کے حامل ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ قصیدہ سید حسن ہی کا ہوگا۔ کیونکہ اس کے شاگرد کا مرتب کیا ہوا دیوان (یعنی انڈیا آفس نمبر ۹۳۱) اس کا حامل ہے اور اس سے زیادہ مستند کوئی اور نسخہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے برخلاف سنائی کا مطبوعہ دیوان زیادہ مستند نہیں ہے کیونکہ اس میں بعض جگہ ایسا کلام بھی ملتا ہے جو دوسروں سے منسوب ہے۔ مثلاً ابو رجا غزنوی (م ۵۸۶ھ یا ۵۹۸ھ) کا یہ قطع:

آمد آن کودکِ مسیح پرست

نیشِ الماس گون گرفتہ بدست

جو بہرام شاہ کے متعلق ہے اور لباب الالباب (ج ۲۔ ص ۲۸۱) میں منقول ہے اور جس پر حافظ محمود شیرانی صاحب نے کتاب تنقیدِ شعر العجم (ص ۶۳۔ ۶۴) میں بحث کی ہے کہ وہ سنائی کے مطبوعہ دیوان (بمبئی۔ ص ۳۳۱ح۔ بعد) میں بھی کچھ تغیر کے ساتھ موجود ہے۔ اس کے علاوہ یہ باب بھی قابل غور ہے کہ وہ سنائی جو ایک عرصے سے شاعری میں مصروف ہے جیسا کہ عثمان مختاری نے مسعودِ سوم (م ۵۰۸ھ۔ ۱۱۱۵ء) کی مدح کے قصیدے میں (مخطوطہ پروفیسر مسعود حسن صاحب) کہا ہے۔

سنائی را صلتہا بخش تا او ہمچنین طرے

پر دازد کہ ہمتا نیست اندر شعر اقرانش

فرو اندیش تا اوراچہ قادر خاطری باشد

کہ در معنی ولفظِ خوش مسلم کرد عثمانش (۲۸)

اپنے ہم عصر عمادی غزنوی کی تقلید میں (ع۔ بر سر خوانِ عمادی من کشادم این فقع) کیوں قصیدے لکھتے؟ بلکہ خود عمادی نے ایک مرتبہ سنائی کی زمین (دیوان بمبئی۔

ص۔۸۱۔۸۲) اختیار کر کے یہ قطعہ (مجموعہ قصاید فارسی ۴۹/۲، ص ۲۷۷۔ جیب گنج) لکھا تھا:

چون سنائی اوفتاد از خطہ غزنین بہ بلخ
تازہ کرداز مدحتِ قاضی حسن روی سخن
چون مرا از لشکرِ سلطاں بہ ری پیوست بخت
بردرِ قاضی حسن دیدم معالی را وطن
اندران فکرت کہ این قاضی چو آن قاضی بود
از عرق در آب آتش رائے دیدم خویشتن
آسمان گفت آفتابا با عمادی گو (سرشت؟)
خاکِ این قاضی حسن از خونِ آن قاضی حسن
ای دریغا روی آن بودے کہ مدحش گفتمے
تازمانہ فرق کردے شعرِ او از شعر من

اس لئے خیال ہوتا ہے کہ سید حسن نے اپنے معمر معاصر عمادی غزنوی کی تقلید میں جس طرح یہ قصیدہ:

ای یافتہ از چہرۂ تو حسن کمالے
دادہ ست جمالیت خدا وَہ چہ جمالے

لکھا تھا اور جس کا ذکر آگے آئے گا، اسی طرح قصیدہ مذکور الصدر بھی لکھا ہوگا۔ اور بہرام شاہ کی مدح میں اشعار شامل کرنے سے پہلے اس نے سنجر کی تخت نشینی پر بھی اسے پیش کر دیا ہوگا۔ کیونکہ اُس میں یہ عادت ضرور تھی جیسا کہ راحت الصدور (ص ۱۹۲) سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے یہ قصیدہ مکہ معظمہ سے سنجر کو بھیجا تھا۔

ہرگز بود کہ باز ببینم لقائے شاہ
شکرانہ در دو دیدہ کشم خاکِ پائے شاہ

اور منتخب التواریخ بدایونی (ج ا۔ ص ۴۰۔ کلکتہ ۱۸۶۸ء) میں اس کے ساتھ یہ دو شعر بھی نقل کئے گئے ہیں جو بہرام شاہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

بہرام شاہ کہ جانِ سلاطین فداش باد
باشد کہ جانِ ایشان باشد سزائے شاہ
سیارگانِ چرخ درا فتند چون شہاب
پا از برون نہند زحدِ وفائے شاہ

چنانچہ جب یہ ثابت ہو گیا کہ وہ قصیدہ (خاک را از باد بوئے مہربانی آمدہ ست۔ الخ) سید حسن کا ہے تو پھر اس کے (شعر ۸۔۹) "بدیہہ" اور "بیتہائے امتحانی" کے دعوی کا راز بھی کھل جاتا ہے۔ گو کہ یہ ضرور صحیح ہے کہ وہ "بدیہہ گوئی" بھی کر لیتا تھا' جیسا کہ ہم بہرام شاہ کے یہاں قید ہونے پر اس کا حال پڑھیں گے۔

اس ابتدائی عہد کے متعلق شاعر کے کئی قصیدے ملتے ہیں۔ ہم یہاں چند کا ذکر کرتے ہیں۔ ایک قصیدہ (انڈیا آفس نمبر ۹۳۱۔ ق ۲۴' الف ۔ ۲۵ ب) یہ ہے۔

بادِ آتشباز چون از روی دریا برشود
خاکِ پژمردہ ز آبِ زندگانی ترشود
گو چو یوسفؑ شاہدے از چاہ تختے برشود
گہ چہ آدمؑ صورتے از خاک جان آور شود
یک قدم روید گیاہے را و باصد جان بود
یک بدن باشد نہالے را و باصد سر شود
ساغر خورشید پیدا عکس بر بندد چنان
کاندرو ساقیِ مہ پیکر چو دو پیکر شود
از فراوان سعیِ او برنکتۂ بندہ حسن
ہر زمان گوئی کہ موکب دُرجِ پر گوہر شود

بندہ وار این دُرج را امروز نو روزے برد
صورتِ دولت چو پیشِ خسروِ صفدر شود
شاہِ بہرام آن خداوندے کہ از فضلِ خدائے
دیر برناید کہ شاہنشاہ بحر و بر شود
بندگان داری بحمد اللہ کہ گر فرمان دہی
ہر یکے چون در رود در آب و در آذر شود

ساتویں اور آٹھویں شعر سے صاف ظاہر ہے کہ یہ قصیدہ بہرام کے ابتدائی عہد کا ہے اور چھٹے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ "نوروز" کے موقع پر لکھا گیا ہوگا۔ لیکن شاید وہ نوروز ۵۱۰ھ۔۱۱۱۷ء والا نہ ہوگا۔ ورنہ اس وقت سنجر کی موجودگی کی وجہ سے اس کی بھی مدح ہوتی۔ اسی طرح ایک اور قصیدہ اسی عہد کا (مخطوطہ ایضاً۔ ق ۱۷۔ الف) معلوم ہوتا ہے:

یا رب جہان یگانۂ بہرام شاہ دار
ایام رامسخّر آن پادشاہ دار
او را پناہِ دولت و دین کردۂ بہ عدل
اکنون بہ فضل ہم تو خودش در پناہ دار
از تاجِ تست عکسے صبحِ سفید پوش
وزچتر تست ظلّے شامِ سیاہ وار
گوشِ تو شاہوارِ بشارت شد و ازین
بسیار در رہ ست تو چشمے بہ راہ دار
وردِ فلک چو وردِ حسن این کہ تا بہ حشر
یارب جہان یگانۂ بہرام شاہ دار

ایک جگہ اور (مخطوطہ ایضاً۔ ق ۱۵۳۔ ب) کہتا ہے:

خاک را چاک زد اے دوست گیاہ
عمر برباد مدہ بادہ بخواہ
بے نظر چشم شگوفہ ست سپید
بے گناہے دل لالہ ست سیاہ
در چمن عود ہمی سوزد یار
بر فلک رنگ ہمی ریزد ماہ
شود آئینۂ گردوں تاریک
ہر زمانے کہ کند دریا آہ
نیک و بدی کند آن روز بروز
تا نیفتد ز طرب گاہ بگاہ
مے بہ دست آر، چہ خیزد ز خرد
گل شفیع است چہ ترسی ز گناہ
ہمہ بر صورتِ دیدہ نرگس
ہمہ بر شکلِ زبان ست گیاہ
تا ببینند بر آن صنعِ خدائے
تا بگویند بدین مدحتِ شاہ
شاہ بہرام کہ گیرد عالم
ہمہ تا یک دومہ ان شاء اللہ

آخری شعر سے بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ اشعار ابتدائی عہد میں لکھے گئے ہوں گے۔

سنجر کی واپسی پر بہرام شاہ کا بھائی ارسلان ہندوستان سے فوج لے کر حملہ آور ہوا' اور جیسا کہ ہم تاریخ بہرام شاہی میں تفصیل دے چکے ہیں' بہرام شاہ نے قلعہ بامیان میں پناہ لی اور سنجر نے بلخ سے کمک بھیجی' جو ۵۱۱ھ۔۱۸۔۱۱۱۷ء میں آئی ہو گی۔ اس سے ارسلان پسپا ہوا۔

آخر قید بھی ہوا اور بعد میں جمادی الآخر ۵۱۲ھ (ستمبر ۱۱۱۸ء) میں قتل کیا گیا۔

ارسلان کا وائسرائے (والیِ ہند) محمد ابو حلیم اپنے بادشاہ کی شکست کا حال سن کر بہرام شاہ کے خلاف باغی ہو گیا۔ یہ خبر سنتے ہی بہرام شاہ' غزنین سے روانہ ہوا' اور لاہور میں (شنبہ) ۲۷ رمضان ۵۱۲ھ (۱۱ جنوری ۱۱۱۹) کو اسے شکست دے کر گرفتار کر لیا۔ غالباً اسی کے متعلق حسن کہتا ہے:

زمانہ دامنِ اقبالِ شہریار گرفت
سعادتش بہ دل و دیدہ درکنار گرفت
ظفر بہ ہمتِ روی ظفر جمال نمود
جہان بہ دولتِ شاہِ جہان قرار گرفت
یمینِ دولت و دین' و امین ملت و ملک
کہ آرزو زیمینش رہِ یسار گرفت
ابو المظفر بہرام شاہ بن مسعود
کہ زرِ خورشیدہ ازرائے اوعیار گرفت
خدایگانا' شاہا' مظفرا ملکا
نظام بین کہ ز دورِ تو روزگار گرفت
مگر زچترِ تو شاہا سیاہ گردون خاست
چو فرِ تاجِ تو صبح سپیدہ کار گرفت
برنگ جزع نمود این سپہر پیروزہ
جہان زلشکر منصور چون غبار گرفت
تبارک اللہ ازین لشکرے کہ افزون باد
تمام صحنِ جہان سربسر سوار گرفت
غبارِ مرکبِ شان چشمِ روزگار بست
صدائے موکبِ شان گوشِ کوہسار گرفت

زمینِ معرکہ از چشمِ شان گرامی کرد
ہوائے ہاویہ از جانِ شان بخار گرفت
خدایگانا' گر مدبرے خطائے کرد
سزائے کردۂ خود دیدو اعتبار گرفت
تو ہم عنان کرم سوے عفو تاب کہ او
بہ دستِ خواہش فتراکِ زینہار گرفت (۲۹)

آخری دو شعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے مراد محمد ابو حلیم ہے' جو اپنی لیاقت اور تجربہ کی بنا پر معاف کر دیا گیا تھا۔

شاعر کی ہندوستان میں آمد

بہرام شاہ نے محمد ابو حلیم کو معاف کر کے پھر والیِ ہند بنا دیا اور خود ضرور ۵۱۲ھ کے آخر تک (یعنی ۱۱۱۹ء) کے شروع مہینوں میں غزنین کو واپس چلا گیا ہوگا کیونکہ اس کے جانے کے بعد ہی محمد ابو حلیم نے سوالک (۳۰) کے علاقہ میں ناگور کے مقام پر ایک قلعہ تعمیر کرایا اور ۵۱۳ھ۔۱۱۱۹ء میں پھر خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ بہرام شاہ نے جونہی یہ خبر سنی فوراً ایک بڑی فوج لے کر ہندوستان آیا' اور ندیوں کو عبور کرتا ہوا دشمن کے مقابلے پر پہنچا۔ آداب الحرب (ص ۴۵۔۷۴۔ لاہور مئی ۱۹۳۸ء) سے صاف واضح ہے کہ بہرام شاہ کو راستے میں کئی ندیاں پار کرنی پڑی تھیں۔ ہمارا شاعر حسن بھی ساتھ تھا۔ وہ کہتا ہے:

چون زغزنیں کردم آہنگِ رہِ ہندوستان
از سپاہِ روم خیلِ زنگ می بستد جہان (۳۱)

تاجِ نورانی ہمی افتاد درپائے زمین
رایتِ ظلمت ہمی افراخت سر بر آسمان

شاعر بھی گھوڑے پر سوار تھا:

ادہم شب در تحیّر کارِ من چون زراز آنک
ہم تکِ او نقرہ خنگے داشتم در زیرِ ران

اسی قصیدے میں آگے چل کر ندیوں اور کشتیوں کا ذکر آتا ہے۔

بر کرانِ آبہا از آسمان سیمائے او
بستہ کشتی ہائے طولانی زراہِ کہکشان
در گرایش چون سحاب و در نمایش چون ہلال
راست رو مانند تیر و گوشہ گشتہ چون کمان
پیشِ موسیٰ بحر قلزم گشتہ گوئی کوئے او
پیشِ سلطان چون شدے بر آب کشتی ہاروان
شاہ را چون دیدے بر تخت بر کشتی عروس
دیدے خورشید را در جرمِ ماہِ نو مکان
این چنین راہے مرا خوش تر زبر گشتن نمود
در پناہِ رایتِ منصورِ سلطانِ جہان
مہر بر جیس اقتدار و ماہِ مریخ انتقام
ابرِ دریا آستین و سعد گردون آستان
آفتابِ دین و دولت جانِ حق بہرام شاہ
آن ظفر سیمائے نصرت قدرت دولت توان

اسی موقع پر ہندوستان میں رہ کر شاعر نے ایک اور قصیدہ لکھا تھا جس کے کچھ اشعار یہ ہیں:

می بنازد باز گوئی خطۂ ہندوستان
شکرِ حق گوید ہمے بسیار، ہستش جائے آن
ہم حریمش روشنائی مے دہد بر آفتاب
ہم زمینش سرفرازی می کند بر آسمان

آفتابِ دین و وددولت ظلِّ حق بہرام شاہ
آن کہ چون اویک فرشتہ آدمی ندہد نشان
خسروا ہرکین سفر دریافت شد سیارۂ
منت ایزد را کہ ہستی خسروِ سیارگان
برخورد شاہی کہ امروز از فراوان خلعت
نو بہارِ ہفت رنگ آمد پدید اندر خزان
وقت شد کارِ جہان بکشائی سر تا سر ازانک
لشکرِ جرّار داری بستہ جانہا بر میان

تیغ زن تابر تو خواند رسمِ جدت آفرین
غزوکن تا از تو گردد جان جدّم شادمان
منکرانِ شرع را درہم شکن ہمچون عنب
خستگانِ شرک را درہم فگن چون ناردان
تابدین توفیق با کامِ دل و نامِ بزرگ
سوئے درالملک برتابی بہ فیروزی عنان (۳۲)

آخری شعری سے صاف ظاہر ہے کہ یہ قصیدہ ہندوستان میں لکھا گیا اور شاعر ارالملک (غزنین) کو فتح و نصرت کے ساتھ واپس چلنے کی آرزو کر رہا ہے۔ پانچویں شعر سے ظاہر ہے کہ یہ قصیدہ "خزان" کے زمانے والی جنگ سے متعلق ہے۔ چونکہ پہلی جنگ ۲۷ رمضان ۵۱۶ھ (۱۱ جنوری ۱۱۱۹ء) کو ہوئی اور وہ زمانہ خزان کا نہیں تھا اس لئے ظاہر ہے کہ یہ دوسری جنگ ۵۱۳ھ کو خزان (۲۱ ستمبر اور ۲۰ دسمبر ۱۱۱۹ء کے درمیان) میں کبھی ہوئی ہو گی۔

یہی دوسری جنگ جس میں محمد ابو حلیم کا قلعہ بھی فتح ہوا تھا ایک دوسرے قصیدے میں بھی مذکور ہے۔ اس کے کچھ اشعار یہ ہیں:

زہے رونقِ ملک از سر گرفتہ
بہ یک تاختن ہفت کشور گرفتہ
جلالِ ترا تاج برسر نہادہ
جمالِ ترا تخت در بر گرفتہ
براندہ بہ لاہور فالِ سعادت
بنامِ خدا و پیمبرؐ گرفتہ
زمشرق چو خورشید تیغے کشیدہ
ہمہ دشت چون ذرہ لشکر گرفتہ
زعکسِ سلاح و ز آوازِ مرکب
زمین و زمان برق و تندر گرفتہ
زپیلانِ چون کوہ تازان بہ ہیجا
فضای جہان، شکلِ محشر گرفتہ
تو برخنگِ دولت چو خورشید تابان
چو صبحِ جہان گیر خنجر گرفتہ
عدو ہمچو مہ مہرہ برچیدہ از تو
چومردانِ رہ آن جہان برگرفتہ
بنامیزذ این دزِّ با پشتوارہ
بہ تائید و توفیق داور گرفتہ
بحمد اللہ اکنون نہ بینم کہ بارے
مکانِ خداوند چاکر گرفتہ
بحمد اللہ اکنون جہانیست بارے
ثنای ملک بو المظفر گرفتہ (۳۴)

محمد ابو حلیم کے قلعہ کو "دزِّ با پشتوارہ" کہا ہے لیکن اب اس کے آثار بالکل ناپید ہیں۔
بہرام شاہ کی اسی فتح والی نہضت کا تذکرہ شاعر کے ایک دوسرے قصیدے میں ملتا ہے جس کے

کچھ اشعار یہ ہیں۔

به اعتدالِ هوا عدلِ شاه بارشده ست
چهار فصلِ جهان سربسر بهار شده ست
نه بود وقتِ شگوفه ولے ازین شادی
زخنده شاخِ درختان شگوفه بار شده ست
همای سایۂ شه آفتابِ ملک وشے
که بازِ چترِ رفیعش ظفر شکار شده ست
ابو المظفر بهرم شاه بن مسعود
که چرخ درکفِ او بزینهار شده ست
تبارک الله روزِ قدومِ شاه چه بود
که بحر گوئی در موج بے قرار شده ست
چنان نمود به چشم من و زیادت بود
که ربع مسکون همواره برسوار شده ست
وَاِن یکادُ بخوان بر سپاه منصورش
که هر یکیش ده وهر صدے هزار شده ست
به کارزار پدید آید و بخواهی دید
که بر مخالفِ ازایشان چه کارزار شده ست
خدایگانا این نهضتِ مبارکِ تو
طرازِ دولت و عنوانِ روزگار شده ست (۳۴)

ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ یہ فتح "خزان" کے موسم میں ہوئی تھی۔ اس کی مزید تصدیق اس قصیدے کے دوسرے شعر سے ہو جاتی ہے جس میں "نہ بود وقتِ شگوفہ" ایسے الفاظ ہیں جن سے کوئی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

۵۱۳ھ۔۱۱۱۹ء کی اس فتح اور محمد ابو حلیم کی ہلاکت کے بعد بہرام شاہ نے حسین ابن ابراہیم علوی کو ہندوستان کی حکومت سپرد کر دی تھی۔ اس کی مدح میں سید حسن نے ۴۷ اشعار کا ایک قصیدہ لکھا تھا جس کا انتخاب یہ ہے:

گہ دہد یار مرا از منِ بے دل خبرے
گہ کند سوی منِ خستہ بہ رحمت نظرے
باز راند زمن و قصۂ من حرفے چند
پیش آن بت کہ چنو نیست بخوبی دگرے
از شبِ زلفِ تو گمراہ نمانم کہ مرا
روزِ اقبال امیر ست نکو راہ برے
آفتابِ ہمہ سادات حسین آن کامروز
نیست در خطۂ اسلام ہمچو او نامورے
نہ چو تو باشد ہر کو بود از نسلِ علیؑ
گرچہ از کوہ بود لعل بدان سر حجرے
صفِ کفار چنان برشکنی کز تیغت
سقرے نقد بہ بینند و چہ سوزان سقرے
ای کہ در روضۂ ملک ازلی سرسبزی دین
شجرے کشتی نہمار و مبارک شجرے
چو توئی راچو منے شاید اگر بستاید
قدرِ خورشید کجا داند ہر بے بصرے(۳۵)

چوتھے اور پانچویں شعر میں حسین علوی کے نام کی وضاحت ہے اور اس کو ۶۔۷ شعر میں "کفار" کا قاتل اور روضہ ملک کو سرسبز کرنے والا کہا گیا ہے۔

شاعر کی ہندوستان سے واپسی

اس کے بعد ہمارا شاعر غزنین کو واپس ہوا ہو گا۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اسی ابتدائی عہد میں بہرام شاہ کی والدہ (اور ممکن ہے کہ سوتیلی والدہ جس کے متعلق ہم تفصیل سے تاریخ بہرام میں لکھ چکے ہیں) کا انتقال ہوتا ہے۔ شاعر لکھتا ہے:

آراستند روضۂ آرام گاہِ جان
یک سرکشادہ شد ہمہ درہای آسمان
صبحِ عدم کشید سر از ظلمتِ وجود
نورِ یقین نمود رخ از پردۂ گمان
بکشاد بر تحیّت کرّوبیان دہن
بربست در کرامتِ روحانیان میان
رضوان رہِ بہشت نمودہ کہ مرحبا
مہمانِ نورسیدہ ' منم تازہ میزبان
پیش آمدہ بہ خدمتِ کدبانوانِ خلد
درپرسشِ درودہمہ گشتہ یک زبان
این را ز حوضِ کوثر دردست یک قدح
وان را ز شاخِ طوبیٰ صد دستہ بربنان
ہر لحظہ آن اشارت کردہ بہ سوے این
ہر ساعت این بشارت بردہ بہ سوے آن
کایزد نہاد مریم اسلام را محل
نزدیک شد ز سدرۂ ایام رامکان
سلطان ابو المظفر بہرام شاہ کی ساخت
عالی ہمائے ہمتش از سدرہ آشیان

منت خدائے راکہ مَلِک خلقی و ملک
مژدہ زمانہ راکہ جوان بختی و جوان
برخاطر مکرم غم بعد ازین منہ
وز نرگس مبارک نم بیش ازین مران
آن راکہ چون تو قرۃ عین ست یادگار
حقا کہ چون خضر بودش عمر جاودان
تا دوست برنیامدو دشمن فرو نہ شد
در دولت از لقاے تومی بود شادمان
چون ہر دورابہ کام دل خویشتن بدید
دادش بہ حق امانت و برخاست ازمیان
بیت دو بندہ گفت دعائیست بس بزرگ
گرہیچ شاہ صبر کند مستجاب دان
بادا طلوع مہر الٰہی کہ شد سپہر
بادا بقاے گوہرِ شاہی کہ رفت کان
تا صبح روز محشر خورشید ملک را
بیدار باد بخت کہ خوش خفت پاسبان (۳۶)

اس اقتباس کے خصوصاً آٹھویں، بارہویں، سولہویں اور سترہویں شعروں سے صاف ظاہر ہے کہ وہ بہرام شاہ کی والدہ کے متعلق ہیں جس کی وفات پر بادشاہ کو صدمہ ہے۔ تیرہویں اور چودہویں شعر سے واضح ہوتا ہے کہ جب بہرام شاہ کو پوری طرح بادشاہی کے متعلق طمانیت حاصل ہو چکی تھی اس وقت اس کی والدہ کا انتقال ہوا اور مزید تائید اس شروع عہد کی اس طرح سے بھی ہو سکتی ہے کہ دسویں شعر میں شاعر نے کہا ہے کہ ع مژدہ زمانہ راکہ جوان بختی و جوان۔

اس زمانے میں شاعر نے دوسرے قصیدے بھی لکھے ہوں گے، لیکن ان میں سے کوئی اشارہ وقت کے متعلق نہیں ہے۔ اس لئے تاریخ متعین نہیں ہو سکتی۔

خراسان کو روانگی

اس کے بعد ہمارا شاعر غزنین سے مرو کی طرف یعنی سنجر کے دربار میں (شاید طلبی پر) پہنچتا ہوا معلوم ہوتا ہے...... وہاں یہ قصیدہ پیش کیا ہوگا:

این منم یا رب کہ چرخم سعیِ اختر می کشد
چشمۂ روشن زچاہِ تیرہ ام بر می کشد
این منم یا رب کہ از خاکم سوی بالا چو آب
دور این گردندہ دولابِ مدوّر می کشد
این منم کاختر بصد خواری مرا بر در نہاد
بازم اکنون با ہزاران ناز در بر می کشد
در زمین ہر لحظہ چون قارون فروتر می شدم
چون مسیحؑ ہر دم اکنون چرخ برتر می کشد
این ہمایون حضرتِ سلطان و این چشم من است
کان مبارک خاک را چون توتیا در می کشد
یا ربم توفیق خدمت دہ کہ بختم بندہ وار
پیش سلطانِ سلاطین شاہ سنجر می کشد
دُرّ تاجش را فلک در عقدِ انجم می برد
بازِ چترش را فلک در زیرِ شہپر می کشد

خسروا بندہ حسن را دولتِ جاوید تو
سوی درگاہِ تو شاہِ بندہ پروری کشد
بلبلِ فضل ست لیک از بہرِ داغِ بندگیت
ہر زمانش دل سوی طوق کبوتری کشد
بہرِ تو کافی اگرچہ نیست خاطری کشند
پیش تو جانی اگرچہ نیست درخوری کشد (۳۷)

ان اشعار سے (اور خصوصاً آخر والے اشعار سے) ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر سنجر کے دربار (مرو) (۳۸) میں ابھی ابھی پہنچ رہا ہے گو کہ غزنین میں بہرام شاہ کی تخت نشینی پر سنجر سے ضرور متعارف ہو چکا تھا جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔

راحت الصدور (صفحہ ۲۱) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ بھی سنجر کی مدح میں ہے اور بہت ممکن ہے کہ اسی موقع پر کہا ہو:

جہان را شاہِ فرخ پی چنین باید چنین باید
کہ خلقِ عالم اندر سایۂ عدلش بیاساید
خجستہ رای او از ملک راہِ فتنہ بربندد
مبارک روی او از خلق کارِ بستہ بکشاید
خہے برنا جواں بختی کہ در صد قرن تازین پس
نظیرت در جہانِ کہل چرخِ پیر ننماید
سعادت چشم بکشادہ کہ تا رویت کجا بیند
زمانہ گوش بنہادہ کہ تا رایت چہ فرماید
شہنشاہا تو کوہِ حلمی وچون گویمت مدحے
چو کوہے در صدا گوئی زمن ہر دم سخن زاید
یکے آن آرزو درام کہ گرد انند مداحم
کہ تا خود مر ترا چون من کہ باشد تا کہ بستاید

زمدحت طبع من الحمدللہ صفوتی دارد
مباد آن روزکاو ار مدحت ہر کس بیالاید
ہزاران کس زانعامت بر آسود ومرفہ شد
مراشائستگی پیش است اگر من ہم شوم شاید

آخر کے اشعار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ابتدائی تعلق سے متعلق ہیں۔

ابوطاہر سعد بن علی قمی

اسی زمانہ میں سنجر کے وزیر ابوطاہر سعد بن علی بن عیسی القمی کی مدح بھی کی جو ۵۱۵ھ۔۱۱۲۱ء میں مقرر ہوا تھا۔ ایک ترجیع بند اس طرح شروع ہوتا ہے۔

در ہمہ عالم یکے محرم نہ ماند
اینست بے یاری مگر عالم نہ ماند

اس میں سات سات (۳۹) شعر کے تین بند ہیں اور تضمینی شعر یہ ہے:

آن کہ چون ماہ از کواکب ظاہر ست
کنیتش بو طاہر و او طاہر ست

لیکن اس کے مشہور لقب "شرف الدین" کے بجائے دو شعروں میں "رشید الدین" ملتا ہے۔

چون رشید الدین کہ برخوردار باد
یک وفادار از بنی آدم نہ ماند
دستگیر ما رشید الدین بس ست
گرچہ در پائی بلا افتادہ ایم

تاہم اس لقب سے شبہ پیدا نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ایک دوسرے ترجیع بند کے تضمینی شعر میں اس کے نام "سعد" کی رعایت سے "سعادت" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

دُرِ دریائے کرم بو طاہر

آن ز سیماش سعادت ظاہر

یہ ترجیع بند پانچ بند کا ہے اور ہر بند میں سات شعر ہیں۔ یہ عید کے موقع پر لکھا گیا تھا اور یقیناً وہ عید (دسمبر ۵۱۵ھ۔ ۱۱۲۱ء) کی ہوگی۔ کیونکہ وہ اسی سال وزیر مقرر ہوکر ۲۵ محرم ۵۱۶ھ (چہار شنبہ۔ ۵/اپریل ۱۱۲۲ء) میں وفات پا گیا تھا۔ عید کے متعلق آخری بند میں کہتا ہے:

عیدت اے صدر ہمایون بادا

روزگارت ہمہ میمون بادا

ہر سعادت کہ ازان نتوان گفت

بتو و روئے تو افزون بادا

اے چو گل چاک دلِ دشمنِ تو

ہم چو لالہ جگرش خون بادا

لیک از دائرہ بیرون مرغیست

کہ از اینِ دائرہ بیرون بادا

پدر و ہرسہ برادر بخشند

کہ رخِ ہر ہمہ گلگون بادا

ہر قلادہ کہ زند منت شان

زیورِ ابلق گردون بادا

روزِ اقبالِ شما ہر ساعت

ہم چو عمر فلک افزون بادا (۴۰)

اس کے پانچویں شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو طاہر سعد کے تین لڑکے بھی تھے، اسی ممدوح کی مدح میں ۲۳ شعروں کا ایک قصیدہ بھی ملتا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر نوازا گیا ہے اس کے کچھ اشعار یہ ہیں:

بر من زنعمت الحق خاصِ خدایگان
کرد آن چہ تا ابد نتوان کرد شکر آن
ہر لحظہ می کشدز حضیضم بہ سوے اوج
ہر روز می برد ززمینم بر آسمان
ہم شد بہ عونِ بخشش او رنج من سبک
ہم شد ز بارِ منتِ اوپشتِ من گران
عقلم بہ وقت طفلی ازو چون شگوفہ پر
بختم بہ گاہ پیری چون سرو از و جوان
فرخندہ پے سپہری کزیمن دورِ اوست
ہم پادشاہ فارغ و ہم خلق پاسبان
گشتہ ہلال دولت در پائی او رکاب
دادہ سپہر توسن در دست او عنان
خواجہ عمید اطہر ابو طاہر آن کزو
ہر لحظہ بشگفد گلِ دل از بہارِ جان (۴۱)

تغری طغان بیگ

اس ممدوح کے انتقال کے بعد ہی (جس کی تاریخ ہم اوپر دے چکے ہیں) سنجر کا وزیر تغری طغان بیگ (۴۲) (محمد بن سلیمان کاشغری) مقرر ہوا اور آثار الوزرا (ق ۱۷۲ الف تا ۱۷۳ ب۔ بانکی پور) اور دستور الوزرا (ص ۱۹۱۔ ۱۹۴ تہران ۱۳۱۷) وغیرہ سے اس کے حالات کی تفصیل میں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مدت وزارت او دو سال وکسری امتداد یافتہ "یعنی وہ ۵۱۶ھ۔ ۱۱۲۲ء سے ۵۱۸ھ۔ ۱۱۲۴ء تک اس عہدہ پر ممتاز رہا ہوگا۔ ہمارے شاعر نے اس کے عہدۂ وزارت حاصل کرنے پر تہنیت میں ایک قصیدہ لکھا تھا۔ جس کے کچھ اشعار یہ ہیں۔

زہے ز روی زمین برگزیدہ شاہ ترا
بر آسمانِ شرف دادہ پایگاہ ترا

امیر عادل تغری طغان دریا دل
کہ جان سپارد از دل ہمہ سپاہ ترا
خدائی داند پس تا چگونہ می زبید
جلال و دولت و اقبال و عزو جاہ ترا
بسا مصاف کہ راہِ ظفر در و گم بود
ستارہ وار خدنگت نمودہ راہ ترا
سزد کہ تیغِ تو آب و گیاہ راماند
کزو ہمیشہ ہم آب ست و ہم گیاہ ترا
در آن زمان کہ قبائی سیاہ پوشیدی
یکے بگوئی چہ ماند دو ہفتہ ماہ ترا
بسانِ مردمِ چشمے عزیز در دولت
از آن بہ آید مرجامۂ سیاہ ترا
عدو ز آئینۂ دل کہ سخت پر زنگ ست
کنون نمایدٔ ہر دم ہزار آہ ترا
کلاہِ دولت بادا ہمیشہ برسر تو
کہ تاجِ شاہِ جہان راسزد کلاہ ترا (۴۳)

چھٹے اور ساتویں شعر سے "سیاہ خلعت" ملنے کا حال بھی ظاہر ہوتا ہے جو عباسی خلفا
کے اتباع میں "سیاہ" ہوگا (۴۴)

ناصر حسین

اس کے بعد سید حسن نے یہ قصیدہ لکھا ہوگا:

چو عزم کردم سوی سفر برای صواب
بریدہ گشت امیدم ز دیدنِ احباب

بر آن امید کہ بہتر شود مگر کارم
ہمی رسید ہزاران ہزار رنج و عذاب
گہے چو موربکوشیدم از پی اخوان
گہے چو مار بہ پیچیدم از غمِ اصحاب
دریں تفکر بودم کہ آن بت سرکش
برِمن آمد بی التماسِ من بشتاب
ہمی فروخت رخش چوں بر آسمان مریخ
ہمی طپید دلش چون بر آینہ سیماب
بشدز شرم ہمی گفت کآخرای بد عہد
مکن چنین و دلم را بہ وصل اندر یاب
مگر بہ خواب دری زان ہمی نمی دانی
کہ بیش اگرچہ بکوشی نہ بینیم در خواب
اگرچہ ہست خطا رفتن من از پیشت
شدن بہ پیش خداوند خویش ہست صواب
جہانِ جود و کرم، نجم دین و کافی ملک
کہ دین و ملک از و ثابت ست در ہر باب
نصیر ملتِ حق، ناصر حسین کزو
ہمی بزرگ شود نام و کینت و القاب (۴۵)

یہ قصیدہ میرے خیال میں وزیر ابوالقاسم الدرکزینی (الانساباذی) کی مدح میں ہوگا۔ کیونکہ اس کا یہ نام (ناصرابن حسین' آثارالوزرا (ق ۱۳۸اب) میں صاف طور پر موجود ہے۔ صبح صادق (ج ۳۔ق ۱۶۷الف ب) میں ناصر ابن حسن ہے جو ابن حسین ہی ہوگا۔ حبیب السیر (۳:۴:۱۰۲) اور دستور الوزرا (ص ۲۰۴) دونوں ایک ہی مصنف کی کتابیں ہیں۔ اس

لیے ان دونوں ہی میں ناصر نہیں ہے۔ بلکہ صرف "ابن حسن" ہے جس نے کسی متقدم کی غلط کتابت سے ماخوذ ہو کر "ابن حسین" کی جگہ لے لی ہے لیکن یاقوت کی معجم البلدان (۲: ۵۶۹) میں اور تاریخ ابن خلدون (ترجمہ ج ۹۔ ص ۱۰۷ بعد) وغیرہ میں ناصر ابن علی ہے جو ہرگز صحیح نہ ہو گا کیونکہ اکثر ماخذوں میں (ابن حسن یعنی) ابن حسین (اصح) ہے اور مذکورہ بالا قصیدے میں بھی یہی ہے۔

ابن خلدون (ج ۹۔ ص ۱۰۷) میں ہے کہ سلطان محمود بن محمد بن ملک شاہ نے خلیفہ المسترشد باللہ (م ۵۲۹ھ - ۱۱۳۵ء) کے ساتھ اسی قوم الدین ابوالقاسم ناصر (ابن حسین) کو بازپرس کرتے ہوئے پایا۔ ماخوذ: کیا یعنی جیسا کہ مجمل فصیحی (ق ۱۶۲ الف) میں ہے۔ وہ ۵۲۰ھ - ۱۱۲۶ء) میں وزیر مقرر ہو کر دس ماہ بعد قید ہوا، اور شعبان ۵۲۱ھ / دسمبر ۱۱۲۷ء میں اس کی جگہ انوشروان بن خالد (م ۵۳۲ھ - ۱۱۳۷ء) وزیر ہوا۔ لیکن سنجر نے (ابن خلدون ج ۱۴۔ ص ۱۵۵-۱۶۱) کے آخر میں پھر ابوالقاسم ناصر (۴۶) کو محمود بن محمد کا وزیر مقرر کر دیا۔ جو اس سلطان کی وفات ۱۱/ شوال ۵۲۵ھ (۶ ستمبر ۱۱۳۱ء تک اس عہدے پر فائز رہا۔ اس کے بعد جب ۵۲۶ھ میں سنجر نے نصیر الدین ابوالقاسم محمود بن المظفر بن عبدالملک (یا عبدالعزیز) بن ابی توبہ کو معزول کیا (لباب۔ ج ۱۔ ص ۳۰۹) تو ابوالقاسم کو اپنا وزیر (آثار الوزرا ق ۱۸۲ ب) مقرر کیا اس لیے بہت ممکن ہے کہ اسی زمانے میں سید حسن نے وہ اشعار اس کی مدح میں لکھے ہوں کیونکہ اس کے بعد ہی وہ طغرل بن محمد بن ملک شاہ (م ۵۲۹ھ - ۱۱۳۴ء) کا وزیر بنا دیا گیا تھا اور اسی کے ہاتھوں وہ شوال ۵۲۷ھ (ستمبر ۱۱۳۳ء) میں مارا گیا تھا۔

ایک وقفہ

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ ہمارے شاعر نے ۵۱۶ھ - ۱۱۲۲ء میں تغری طغان بیگ (محمد بن سلیمان کاشغری) کی مدح میں قصیدہ لکھا تھا۔ اس کے بعد قوام الدین ابوالقاسم ناصر

کی مدح میں ۵۲۶ھ۔ ۱۱۳۲ء میں وہ قصیدہ لکھتا ہوا پایا جاتا ہے یعنی ان دونوں تاریخوں کے درمیان ایسا زمانہ گزرا ہے جس کے متعلق شاعر کے کلام میں کوئی تفصیل نہیں ملتی لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ اس زمانہ میں کم از کم غزنین میں تو نہیں تھا کیونکہ وہاں کے اس عہد کے بعض واقعات اس کے یہاں یا تو متعلق بہ ماضی معلوم ہوتے ہیں یا سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔ مثلاً سنائی کا حدیقہ جو ۵۲۴ھ۔ ۱۱۳۰ء سے شروع ہو کر ۵۲۵ھ۔ ۱۱۳۱ء (یا ۵۳۵ھ۔ ۱۱۴۰ء) میں پورا ہوا۔ اس میں (ص ۴۰۲۔ طبع بمبئی) جمال الدین احمد کی مدح ہے لیکن سید حسن نے اس کا مرثیہ بھی لکھا ہے۔ اسی طرح حدیقہ (ص ۴۷۸) میں ابو نصر محمد بن محمد بن عبدالحمید کو "ع خواجہ بو نصر نائبِ دستور" کہا گیا ہے۔ لیکن سید حسن نے اسے ایک ترکیب بند میں "صدر" کہا ہے اور ۵۲۹ھ کے آخر میں جب بہرام شاہ نے سنجر کو خراج دینا بند کر دیا تھا (۴۷) اور سنجر اس پر حملہ آور ہو کر اس کے لڑکے خسرو شاہ کو بطور ضمانت کے لے گیا تھا (جس کی تفصیل ہم تاریخ بہرام شاہی میں دے چکے ہیں) تو ان واقعات کے متعلق کوئی اشارہ بھی شاعر کے کلام میں نہیں ملتا البتہ خسرو کی واپسی پر تہنیت نامہ ضرور ملتا ہے۔ ان تمام باتوں کی تفصیل آگے آئے گی لیکن یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ شاعر ۵۳۵ھ۔ ۱۱۴۰ء کے قریب بلکہ جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ چند سال اور بعد تک بھی غزنین میں پایا نہیں جاتا۔

اسی دوران میں شاعر نے ایک قصیدہ سنجر کی کسی فتح پر لکھا تھا جو راحت الصدور (ص ۱۸۷۔۱۸۹) میں بھی منقول ہے:

توقیعِ خداوندِ جہان نقشِ ظفر باد

ہر دم کہ زند مایۂ صد عمرِ دگر باد

چون بخشش او آیتِ احسانِ علیؓ گشت

بخشایش او غایتِ انصافِ عمرؓ باد

طغرای ہلالیش دریغ ست بہ کاغذ

آن ابروی پیروزی برروی قمر باد
آن رایتِ عالیش کہ زلفینِ فتوح ست
نقشِ گلِ رخسارِ عروسانِ ظفر باد
سلطانِ سلاطینِ ہمہ مشرق و مغرب
کز ہمت او فرقِ زحل پای سپر باد
بخشندۂ تاجِ ملکان سنجر عادل
کان تخت بدو ہر نفس آراستہ تر باد
شاہا ز نسیمِ گلِ فتحِ تو کہ بشگفت
جانہای سلاطین را در خلد خبر باد
ہر تاج کہ دارند جہان گرچہ تو دادی
درخدمتِ درگاہِ، تو آن تاج کمر باد
تا دامنِ ابر، عرقِ چشمۂ خورشید
از خجلتِ بحرِ کفِ دربارِ تو تر باد
این لشکر پیروز ترا حاطہم اللہ
برشہ رہِ پیروزیِ پیوستہ گذر باد
ای از نظرت رنجِ غریبان شدہ راحت
در حقِ غریبے چو منت نیز نظر باد

اس قصیدے سے یہ باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ آخری شعر سے معلوم ہوتا ہے' کہ اس وقت شاعر غریب الوطن ہے۔ یعنی خراسان میں سنجر کے دربار میں وہ قصیدہ پیش کر رہا ہے۔

۲۔ پہلے شعر میں سنجر کی توقیع کا ذکر ہے۔ جو بقول صاحب راحت الصدور (ق ۷۰ الف) توکلت علی اللہ تھی۔

۳۔ تیسرے شعر میں سنجر کے "طغرای ہلالی" کا ذکر ہے۔ غالباً یہ اطلاع کسی اور ماخذ سے نہیں ملتی۔

۴۔ چوتھے شعر میں سنجر کے رایت کو "زلفینِ فتوح" کہا گیا ہے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ عباسی خلفا کی تقلید میں سنجر کا رایت بھی سیاہ ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس فتح کے موقع پر خلیفہ نے رواج کے مطابق (۴۸) یعنی اظہار پسندیدگی کی غرض سے اس طرح کا رایت بھیجا ہو۔

۵۔ ساتویں اور دسویں شعر سے صاف ظاہر ہے کہ اس وقت سنجر نے کوئی فتح حاصل نہیں کی تھی، اور بہت ممکن ہے کہ وہ ۵۲۹ھ۔ ۱۱۳۵ء والی فتح ہو جبکہ اس نے بہرام شاہ کو دوبارہ تخت و تاج بخشا تھا کیونکہ چھٹے اور آٹھویں شعر میں تاج بخشی کی صفت یاد کی گئی ہے اور پھر شروع کے اشعار میں "توقیع" اور "طغرا" بھی مذکور ہیں جن کی ایسے موقع پر ضرورت ہوئی ہو گی۔

زید بن حسن اور شاہ بن حسن

اسی زمانے میں شاعر کا ایک ممدوح زید بن حسن ہوا ہے۔ جس کو تاریخ بیہق (ص۲۲۶) میں "سید اجل ذخرالدین نقیب النقباء خراسان ابوالقاسم زید بن الحسن کہا گیا ہے جس کی شادی شرف الدین ظہیر الملک (۴۹) ابوالحسن البیہقی کی لڑکی یعنی مجیر الدین محمد کی ایک بہن سے ہوئی تھی، اور یہ باپ بیٹے ہر دو در مصافِ الخان صینی کہ باسلطان سنجر رحم اللہ بود شہادت یافتند در صفر سنہ ست و ثلاثین و خمس مائۃ "یعنی ذخرالدین زید بن حسن کا زمانہ ۵۳۶ھ۔ ۱۱۴۱ء کے قریب تھا جب کہ اس کے خسر اور سالے کی شہادت ہوئی تھی۔

اس ذخرالدین بن حسن کی مدح میں ایک قصیدہ تو یہ ہے۔

جانا حدیثِ عشق چہ گوئی کجار رسد
ہر گز بود کہ نوبتِ وصلت بما رسد

تا من کیم که صافیِ و صلت طمع کنم
اینم نه بسکه دردیِ دردت بما رسد

خاکِ درت بدیده رسد نه گزاف هست
هرگز چنان سزا بچنین ناسزا رسد

پشتم دوتا شد از غم و هم نیست روی آنک
دستم یکے بدان سرِ زلفِ دو تا رسد

رویم چو کهربا شد و هر ساعتم زجزع
دو شاخ بستہ ست که بر کهربا رسد

بشنو حدیثِ من که بسے قصه های راز
از عاجزان به بارگهِ بادشاه رسد

یا جهد کن که جان زتن بنده بگسلد
یا سعی کن که دل بمنِ خسته وا رسد

ترسم خجل شوی چو صدای جفای تو
از ما به سیدِ اجلِ مجتبا رسد

فرخنده ذُخر دولت و دین زید بن حسن
کز لفظ او به گوشِ اجل مرحبا رسد

توبس بلند قدری و من بس بلند شعر
درچوں توئی هر آینه چون نین ثنا رسد

نی نی بدان محل که تو صاحب رسیدهٔ
گرفی المثل دو اسبه کند بس دعا رسد

بر نو عروسِ مدح تو بستم عزیز وار
پیرایهٔ که از صدف مرتضا رسد

در دستِ نام نیک تو دادم بزرگوار
نو بادۂ کہ از چمن مصطفا رسد
جان و دلی کشیدم در عقدِ گوہری
کازرد جان و دل چو بوقت بہا رسد
معذور دار و عیب مگیر و قبول کن
این خردہ چون بصدرِ بزرگت فرا رسد
فرزندِ نیک بخت عزیزِ تو تاج دین
در عہد تو بدولتِ بے منتہا رسد(۵۰)

اس انتخاب کے بارہویں اور تیرہویں شعر میں شاعر نے اپنی بھی "سیادت" کی طرف اشارہ کیا ہے پندرہویں شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر نے یہ قصیدہ خود پیش نہیں کیا بلکہ ارسال کیا ہے۔ آخری شعر میں ممدوح کے بیٹے تاج الدین کا نام ملتا ہے۔

اور دوسرا قصیدہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

ای ذخرِ دین و دولتِ سلطانِ اہلِ بیتؓ
در حلقۂ سپہر محلت نگینہ باد
ای گشتہ سعدِ اکبر با ذات توقرین
باطالعت سعادتِ کبری قرینہ باد (۵۱)

ایک قصیدہ شاہ بن حسن کی مدح میں ملتا ہے۔ جو شاید اسی زید بن حسن کا بھائی ہو گا۔

چون شمع روزِ روشن از ایوانِ آسمان
ناگہ در اوفتاد بہ دریائی قیروان
دوشِ زمین و فرقِ ہوا را ز قیر و مشک
بیم سپہر کور ردا کرد و طیلسان

آورد پای مهر چو در دامن زمین
بگرفتِ دستِ ماه گریبانِ آسمان
اندر شمی چنین که غضنفر شدی ذلیل
واندر شمی چنین کے دلاور شدی جهان
من روی سوی راه نهاده بفال نیک
امیدِ خود بریده زپیوند خان مان
راهی چنین که آید ازو جسم راخلل
راهی چنان که آید ازو روح را زیان
زو در دلم نه بود خطر زان که همچو خور
راندم همی ثنای خداوند بر زبان
حسنِ بهار دولت و دین شاه بن حسن
کاقبال هست بسته بفرمانِ او میان
قطبِ جلال شاه معظم که روزگار
برحسبِ قدر و همتِ او باد پاسبان
من بنده تا ز خدمتِ مدحت بمانده ام
گوئی زمن۔ نه ماند بجز مدحِ تو نشان
ممکن بود زپس که برم نام مدحتت
کاندر نمازم آید نام تو بر زبان
دردا که تا گرانیِ بردم ز درگهت
برمن بدین سبب دلِ اقبال شدگران
از حرص زادو بود بترزاده ام چنین
ای کاش کین نه زادی و هرگز نه بودی آن

در جملہ ممکن ست چہ ممکن چہ حاجت ست
کز غصہ پیر گردم نابودہ من جوان
ازبس کہ بندہ روز درین آرزو بود
تا سازدش بہ درگہ عالی فلک مکان
خود رابہ خواب بیند پیش تو ہر شبے
بکشادہ لب بہ مدح و کمر بستہ برمیان
دین بندۂ کہ ہست بہ مدحِ تو مفتخر
وین چاکری کہ ہست بہ مدحِ تو شادمان
عمری ست تا ز مدحتِ توہست درکنار
قرنی ست تا ز خدمتِ توہست برکران
نہ کس بگویدش کی کجا رفت این غریب
نہ کس بگویدش کہ کجا شد خود این جوان (۵۲)

آخر کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا تعلق بہت عرصہ سے ہے۔ اور وہ غائبانہ مدح کر رہا ہے۔ دولت شاہ (ص ۱۵۶۔ براؤن) نے اس کو رے کا رئیس کہا ہے اور یہ صحیح ہوگا۔ کیونکہ تاریخ بیہق (ص ۲۲۶) کے اس نقیب النقباء خراسان کو تتمہ صوان الحکمہ (عربی۔ ص ۱۷۔ س ۷۔ ۱۹۳۵ء) میں رے کا مقیم کہا ہے۔

مجدالدین ابوالحسن عمرانی

یہیں رے میں ایک رئیس مجدالدین ابوالحسن عمرانی بھی تھے۔ سید حسن کے یہاں دو قصیدے جن میں سے ایک غزل کی صورت میں ہے اس ممدوح کے متعلق ملتے ہیں۔ اس کے متعلق ہم کچھ تفصیل کے ساتھ انوری کے سلسلہ میں معارف (اکتوبر ۱۹۴۲ء۔ ص ۲۸۴۔۲۸۹) میں لکھ چکے ہیں۔

اس کا اختصار یہاں پیش کیا جاتا ہے:

انوری (کلیات۔ ص ۲۲۹۔ لکھنو ۱۸۸۰ء) لکھتا ہے:

چون مراد خویش را با ملک رے کردم قیاس
در خراسان تازہ بنہادم اقامت را اساس
تا خداوندی چو مجدِ دین و دولت بو الحسن
حق شناسِ بندگان باشد چہ غم او را اشناس

رے کے متعلق پھر (ص ۳۸۹) اشارہ کرتا ہے:

ای بہ درگاہِ تو برقصہ رسان صاحب رے
رہ نشینِ سر کوی کرمت حاتمِ طے
صاحب و صدرِ جہانی و جہان زندہ بہ تست
عقل داند کہ بجان زندہ بود قالب حے

اسی قصیدے میں ایک نئی بات ملتی ہے:

بخلاف پدرت سر چو نیاورد فرود
بہ وزارت کہ کند رای ترا قانع کے

اس کا پورا نام ابو الحسن علی ابن عمر (ابن عمران) تھا جیسا کہ کلیات انوری (ص ۱۲۱) اور کلیات سنائی (ص ۴۳۔ بمبئی) سے معلوم ہوتا ہے۔ اور چونکہ وہ زمانہ گورخاں قراختائی وغیرہ کے حملوں کی وجہ سے رے کے لئے مخدوش تھا اسی لئے غالباً سنائی (ص ۷۳) نے کہا تھا:

ہیچ کس را در جہان این مایۂ مردی نہ بود
کو بہ میدانِ خطر سازد برای دیں وطن

بہر حال یہ ممدوح کم از کم ۵۴۰ھ۔۱۱۴۵ء تک ضرور زندہ تھا۔ جیسا کہ انوری (ص ۶۵۱) کہتا ہے:

مجدِ دین بو الحسن کہ ہست عقیم
مادرِ عالم از چو او فرزند

عدد سالہای عمرش باد
ہمچو تاریخ پانصد و چہل اند

پھر وہ کسی وقت محبوس ہوا جیسا کہ انوری (ص ۶۴۰) کہتا ہے:

خلق را بے وجہ روزی عمر خواہد بودنی
وجہ روزی از کجا چون بو الحسن محبوس شد

اور بعد میں وہ قتل کر دیا گیا (ص ۴۱۴)

پانزدہ سال فرزون باشد تاکشتہ شدہ است
بو الحسن آن کہ ز احسانش سخن می رانی

ان اشعار میں جلال الوزرا کا بھی ذکر ہے جو سنجر (م ۵۵۲ھ) کے آٹھ نو سال بعد (تنقید شعر العجم ص ۲۰۰) والے سلطان احمد پیروز شاہ کا وزیر تھا۔ یعنی وہ وزیر ۵۶۰ھ سے پہلے نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے اگر اسی سے "پانزدہ سال" پہلے ابو الحسن قتل ہوا ہو گا تو ظاہر ہیکہ وہ زمانہ ۵۴۵ھ کے قریب قریب ہو گا۔

اس کے قتل سے انوری کو بہت صدمہ ہوا تھا۔ وہ (ص ۲۴۷) کہتا ہے:

ہیچ می دانی کہ درگیتی ز مرگِ بو الحسن
چرخ جز قہر و ستم دیگر چہ دارد فائدہ

اس کے ہم لقب اور ہم عصر سید مجد الدین (ابو طالب بن نعمہ بلخی) اور ضیاء الدین مودود احمد عصمی وغیرہ کے متعلق بھی ہم معارف (اکتوبر ۱۹۴۲ء ص ۲۸۴، ۲۸۹) میں لکھ چکے ہیں۔ لیکن ہم یہاں انوری کے اس قصیدے (ص ۳۹۴) کے کچھ اشعار نقل کرنا چاہتے ہیں۔ جو ابو الحسن عمرانی کی مدح میں سید حسن کی زمین میں ہیں۔

دلم ای دوست تو داری دانی
جان ببر نیز اگر بتوانی
بہ دلے صحبتِ تو نیست گران
چہ حدیث ست بجان ارزانی

تاچو از حد ببری فاش کنم
قصهٔ درد ز بے درمانی
تا ترا از سر من باز کنند
مجدِ دین بو الحسنِ عمرانی

اب سید حسن کے کچھ اشعار (مخطوطہ برٹش میوزیم۔ق ۲۷ا‘ الف) سنیے اور لطف اٹھائیے۔

ایکہ تن را دل و دل را جانی
از دل و جان چہ نکو تر آنی
گاہ در دل چو جہان پیدائی
گاہ در سینہ چو جان پنہانی
عاشقِ زارِ تو ام می بینی
بندۂ خاصِ تو، ام می دانی
عذرِ من از تو نہ خواہد روزی
مجدِ دین بوالحسنِ عمرانی

ایک قصیدہ (انڈیا آفس نمبر ۹۳۱۔ق ۶۱‘ الف) اور اس کی مدح میں ملتا ہے:

چشمۂ نوشِ ست آن دہان کہ تو داری
آب حیات ست آں لبان کہ تو داری
در عجبم کان حد۔شہای بزرگت
چون بدر آید از آن دہان کہ تو داری
از کلہ بس مشک برسمن کہ تو یابی
وز مژہ بس تیر برکمان کہ تو داری
جان بجلابی ببربہ بندہ حسن دہ
آن دل گم گشتہ درغمان کہ تو داری

صدر جہان مجدِ دین کہ عالم پیرش
گفت زہے دولتِ جوان کہ تو داری
قحط نہ باشد در آن زمان کہ تو باشی
فتنہ نہ خیزد در آن جہان کہ تو داری

اس ممدوح کی مدح میں صرف یہی دو قصیدے ہیں' اور خیال ہوتا ہے کہ ۵۳۹ھ کے پہلے لکھے گئے ہوں گے۔ کیونکہ اس سال ہمارے شاعر نے جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے غالباً اصفہان کے "صدر" ابن عثمان کی مدح میں قصیدہ لکھا تھا۔

عبدالصمد عباسی

غالباً اسی زمانے میں ہمارے شاعر نے ایک ممدوح عبدالصمد عباسی کی مدح کی ہوگی۔ اس کی مدح میں صرف ایک ہی قصیدہ ملتا ہے۔

گہر نتیجۂ بحر ست بر خلافِ قیاس
نتیجہ آمدہ بحرے ز گوہرِ عباسؓ
ابو المحاسن عبدالصمد کہ بختِ ابد
بنائے دولتِ اورابہ دی نہاد اساس
کشیدہ تیغ چو مہرست عزمِ او در حرب
کشادہ چشم چو چرخ ست حزمِ او در باس
ازان کہ صاحبِ سری روا بود کہ ترا
زسر دلہا یک یک خبر دہد انفاس
بکن زفضل بزرگی' نہ ابن عمِ توام ؟
زمقتضائے کرم حقِ ابنِ عم بشناس (۵۳)

پہلے اور آخری شعر میں صاف طور پر شاعر نے ممدوح کو "عباسی" کہا ہے۔اور خود کو بھی اس رشتہ سے متعلق بتایا ہے۔ کیونکہ وہ بھی وممدوح کے چچاابوطالب کی نسل سے تھا۔ جیسا کہ ہم شروع میں لکھ چکے ہیں۔ غالباً اس ممدوح کے متعلق عبدالواسع جبلی (م۵۵۵ھ۔۱۱۶۰ء) کے متعدد قصیدے ہیں...... لباب الالباب (ج۲۔ ص۱۰۷) میں ایک قصیدہ ایسا ہے کہ اس میں شروغ کے اشعار تو ہیں۔ لیکن ممدوح کے متعلق اہم نہیں ہیں۔ اس لئے ہم جامع مسجد بمبئی کے کتاب خانے کے نسخے سے اس کے ضروری اشعار نقل کرتے ہیں۔

اے خوابِ من ربودہ بہ یاقوت پُرشکر
دی تابِ من فزودہ بہ ہاروتِ دل شکر
گہ بررخِ تو از کفِ موسیٰ بود نشان
گہ درلبِ تو از دمِ عیسیٰ بود اثر
این عینِ زندگانی و آن اصلِ روشنی
چون رای خوب و لفظِ خوشِ صدرِ نام ور
عبدالصمد عزیزِ ملوک و نصیر دین
کز عقل ہست عاقلۂ نسلِ بو البشرؑ
نور و سرورِ چشم و دلِ حمزہ و علیؓ
آن مایۂ بزرگی و پیرایۂ ہنر

آخری شعر میں ممدوح کو حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی آنکھ کا نور اور دل کا سرور کہا ہے۔ جس سے معاً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ ممدوح ان دونوں بزرگوں کے خاندان سے تھا۔ یعنی سید یا علوی ہونے کا اشارہ پایا جاتا ہے۔ لیکن قاضی محمد سلیمان صاحب مرحوم کی کتاب "رحمتہ للعالمینؐ" (ج۲۔ ص۹۳۔ لاہور ۱۹۲۱ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے دو صاحبزادوں یعنی عمارہ اور یعلی کی نسل

ایک پشت کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔اور صاجزادیوں میں سے ام الفضل (جو ایک حدیث کے راوی بھی ہیں) امامہ کی نسل کا اور کوئی پتہ نہیں چلتا لیکن ممکن ہے آگے چل کر ان بزرگوں کی اولاد میں کوئی ایسا رشتہ ملتا ہو...... بہر حال

نور و سرور چشم و دل حمزہؓ و علیؓ

سے بجائے عباسی کے علوی یا سید ہونے کا اشارہ ضرور پایا جاتا ہے۔اور اگر سید حسن کا عباسی ممدوح وہ ہے جو عبدالواسع جبلی کا ہے تو موخر الذکر کے ہاں اس کے متعلق کچھ اور تفصیل مل سکتی ہے۔ جبلی کے ذیل کے اشعار (جن میں سے کچھ غیر اہم اشعار لباب جلد ۲۔ص ۱۰۴ میں بھی ہیں) ہم حبیب گنج کے نسخے سے نقل کرتے ہیں:

نصیر دین و عزیز ملوک کو راہست
فلک مطیع وجہان بندہ و زمانہ عیال
ابو المعالی عبدالصمد کہ ننماید
چہار چیزش ہرگز ز چار چیز ملال
نہ نفس او ز تواضع ' نہ دست او ز سخا
نہ طبع او ز مروت' نہ سمع او ز سوال
مویدے کہ سخن رابیانِ اوست مآب
مظفرے کہ سخن رابیانِ اوست مآل
گرفت صدرِ سیاست بہ کونِ او رونق
رسید قدرِ سیادت زجاہِ او بہ کمال
شنیدہ بودم زین پیشتر کہ راہ سرخس
بود نشیمن آفات و مرکز اہوال
طریقہاش بہ باریکیِ پلِ محشر
مضیقہاش بہ تاریکیِ دلِ دجال

چو در مصاحبتِ تو بدیدم آں رہ را
مرا معاینہ شد کان حدیث بود محال
از آن قبل کہ در آن رہ بفر تو گفتی
کہ روضہای جنان اند تودہای رمال
ہمی زخار بفر تو دستِ برگِ سمن
ہمی زخارہ بہ یمنِ تو راہ آب زلال

چھٹے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ ممدوح کا تعلق سرخس سے بھی رہا ہے۔ جہاں شاعر اس کے ساتھ (شعر ۸) رہ چکا ہے۔

پہلے شعر میں (جیسا کہ اس سے پہلے قصیدے میں بھی ہے) ممدوح کے القاب نصیر دین و عزیز ملوک ہیں خصوصاً دوسرا لقب ایسا ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید اس کا تعلق ایک سے زیادہ بادشاہوں سے رہا ہو گا اور اس خیال کی مزید تائید اس طرح ہوتی ہے کہ جبلی نے ایک قصیدے میں اسے خراساں کے سلطان (یعنی سنجر؟) سے متعلق کہا ہے:

معین دین و عزیزِ ملوک کو؟ جز تو
سزای این دو لقب خواجہ در خراسان نیست
زخواجگان بہ کفایت عدیل نیست ترا
بدان صفت کہ ز شاہان نظیرِ سلطان نیست
توئی کہ در عرب و در عجم چو تو یک تن
ہنر پرست و سخاکشتہ و سخن دان نیست

اور حبیب گنج کے اسی نسخے میں ایک جگہ اس کا تعلق خاقان سے بتایا ہے:

آن دین یزدان را نصیر آن ملکِ خاقان را بصیر
آن کافیِ صافی ضمیر آن والیِ عالی ہمم
صدرِ اجل عبد الصمد کز دولت ست او را مدد
اخلاقِ او پاک از حسد افعالِ او دور از ستم

اس لئے ممکن ہے کہ یہ "عزیزِ ملوک" عزیز الدین طغرائی ہو جس کی مدح انوری نے (ص ۳۷۸) کی ہے اور ایک جگہ (ص ۲۴۴) اس طرح اس کو دعا بھی دی ہے۔

عددِ سالہای عمرش باد
ہمچو تاریخ پانصد و چل ویک

یعنی ۵۴۱ھ میں وہ شخص خراسان میں سنجر سے تعلق رکھتا ہوگا اور بعد میں اس کے جانشین خاقان محمود خاقان کا امیر ہوا ہوگا جیسا کہ ابن اسفندیار کی تاریخ طبرستان (ص ۶۲۔ مترجمہ براؤن) سے معلوم ہوتا ہے۔ اسی عزیز الدین طغرائی کے نام وطواط کا ایک خط ہے جیسا کہ بیہقی کے تتمہ (عربی ص ۱۵۷۔ ۲۱۲) سے معلوم ہوتا ہے۔ اور اسی کا نام بارٹولڈ نے ترکستان (ص ۳۳۰۔ طبع دوم) میں غلطی سے عزالدین طغرائی (ایلچی محمود خاں) لکھا ہے۔ بہر حال اگر سید حسن کا ممدوح بھی یہی شخص تھا۔ تب بھی یقینی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے کس وقت اس کی مدح سرائی کی ہوگی۔ (۵۴)

اس کے بعد ہمارا شاعر غالباً اصفہان ہی کے ایک ممدوح کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور یہ قصیدہ لکھتا ہے:

چشمم زغمت عقیق بار ست (۵۵)
رازم ز پیِ تو آشکار ست
از عشقِ تو بے قرار گشتم
عشقِ تو ہنوز برقرار ست
بیچارہ دلِ من اے نگارین
بی از تو مپرس تاچہ زار ست
دریاب دلِ کسے کہ آن کس
مداحِ امین شہر یار ست
مخدومِ جہان علیِ عثمان
صدرے کہ سخی و بردبار ست

این بنده که از همه جهانش
از تربیتِ تو افتخار ست
گاهش کرم تو پایمرد ست
گاهش لطفِ تو دستیار ست
سر گشتهٔ چرخِ گرد گردست
دل خستهٔ زخم روزگار ست
بی برگ چو شاخ در خزاں ست
بی بار چو باغ در بهار ست
بے ہیچ ستم، یتیم پرور
بے ہیچ گنہ عیال دار ست
گر تربیتش کنی تو بخ بخ
ورنہ دردا کہ کار زار ست
ای صدرِ اجل، سپہر گوئی
در بندگیِ تو جان سپار ست
در گردن وگوشش از مہ نو
از مہر تو طوق و گوشوار ست
دستارم کہنہ شد دو سال ست
واکنون ہم عید و ہم بہار ست
پارینہ گذاشتم و لیکن
امسال نہ بر مزاجِ یار ست
اطلاق کن از درِ کریمی
کامروز نہ روزِ انتظار ست

تا پیشِ خدا و خلق گویم
کین خلعتِ خاصِ شہر یار ست
فردا بادات بہ ز امروز
کا مسال بسیت بہ ز پار ست

یہ اشعار مخطوطۂ انڈیا آفس (ق ۵۵ب تا ۵۷ 'الف) اور رام پور کے نسخے میں ہیں۔ لیکن پانچویں شعر کا پہلا مصرعہ برٹش میوزیم کے مخطوطہ میں ع مخدوم جہاں علی احمد ہے۔ جو سلطان محمود سلجوقی کا وزیر کمال الدین ابو الحسن بن احمد السمیری ہو سکتا تھا۔ لیکن آخر کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے یہ قصیدہ اس زمانے میں کہا ہے جبکہ......

ا۔ عید بھی ہے اور (۲) بہار بھی ہے۔ چنانچہ تاریخ کی مطابقت کرنے سے معلوم ہے کہ ایسا زمانہ سلطان محمود سلجوقی کے عہد کا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہ زمانہ (یعنی عید بھی ہو اور موسم بہار بھی ہو) ۵۳۱ھ۔ ۱۱۳۷ء اور ۵۳۹ھ۔ ۱۱۴۵ء کے درمیان ہوگا۔ اگر نوروز (۲۱ مارچ کے قریب) کا زمانہ تھا تو وہ ۵۳۹ھ۔ ۱۱۴۵ء ہوتا۔ جب کہ عید کے دن ۲۷ مارچ یعنی بہار کی ابتدا تھی۔ چنانچہ یہ قصیدہ علی بن عثمان کی مدح میں ہوگا۔ جو بقول تاریخ بیہق اصفہان میں تھا۔ عبارت اس میں (ص ۷۷) پر یہ ہے:

"و در عہد ما از اعقابِ نظام الملک بود.......... بہ اصفہان ظہیر الدین ابو الحسن علی بن عثمان بن نظام الملک.........." چونکہ یہ تاریخ بیہق ۵۶۳ھ میں پوری ہوئی تھی۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس سال سے بہت پہلے علی بن عثمان 'اصفہان میں رہا ہوگا۔ یعنی ۵۳۹ھ میں تو وہ ضرور وہاں رہا ہوگا جبکہ مذکورہ بالا قصیدہ لکھا گیا ہوگا۔

بغداد میں آمد

معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا شاعر یہیں سے عازمِ بغداد ہو جاتا ہے 'اور مسعود بن محمد بن

ملک شاہ کے وزیر تاج الدین ابو طالب بن دارست شیرازی (جو ابھی ۵۴۰ھ میں بوزابہ کی وجہ سے وزیر مقرر ہوا تھا) کے توسط سے مسعود تک پہنچنا چاہتا ہے۔ جیسا کہ اس قطعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

اجلّ تاج دین قطعہ و رقعۂ من
فرو خوان و بیدِ مرا عود گردان
تفضّل کن و روز منحوسِ مارا
بدیدارِ مسعود مسعود گردان (۵۶)

لیکن کلیات میں کوئی قصیدہ تاج الدین یا مسعود کی مدح میں نہیں ملتا' گو کہ موخر الذکر کی وفات پر (جو ۵۴۷ھ میں واقع ہوئی) ضرور ایک مرثیہ ملتا ہے۔ اس مرثیہ کا ذکر آگے آئے گا۔ (۵۷)

بغداد میں پہنچ کر ہمارے شاعر نے امام برہان الدین ابو الحسن علی بن ناصر الملقب "بریان گر" الغزنوی سے تعلق قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ وہی بزرگ ہیں جن کی خدمت میں ایک منظوم خط سنائی نے اپنے حدیقہ کے ساتھ (جیسا کہ اس کے آخر میں ہے) بغداد بھیجا تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ ہنوز زندہ تھے اور سید حسن نے انہی کی مدح میں یہ دو قطعے لکھے ہوں گے۔

امامِ عالم' برہان دین' لسان الحق
توئی کہ خامہ ز دست تو می گسار شود
گمان مبر کہ ز صدرِ تو خادمِ داعی
ہمی بہ جائے دگر جز بہ اضطرار شود
بدان خدائے کہ درکارگاہِ قدرت او
خزانِ کہنہ بہ تدریج نو بہار شود
فتادہ خون بہ رحم یارِ دلستان گردد
چکیدہ آبِ صدف' دُرِ شہریار شود

که روزگار به اعزازم از تو دور انداخت
وگر بگویم ترسم که روزگار شود
عزیزِ دولت و دین گشت تا مگر دانی
که هرچه هست چو بسیار گشت خوار شود
زبس اقامت خورشید زرد روی رود
قباش چون سفری کرد لعل کار شود
سپید پوست شود ماه وقتِ استقبال
در اجتماع ز زحمت سیاه مار شود
چرا عزیز و گرامی بود به اول ماه
ازان که آخر مه یک دو شب شکار شود
تو بحر علمی و غوّاص چون شود به تو بحر
برای چونین درهای آبدار شود
چو دُر نه یافت اگر بیشتر مقام کند
چو اهل دریا باشد که زرد و زار شود
تو آفتابی و سیاره محترق گردد
چو پیش خدمت آن شاهِ تاج دار شود
دل از جدائی بر حال وصل می ترسد
به وصل گاه جدائی امیدوار شود
اگر خدای بخواهد عروسِ دولتِ تو
زطبع جلوه گرم خوب چون نگار شود
منم که بازِ همایونِ آشیانِ توام
وفای باز نه پرواز را شکار شود

ہمیشہ تا کہ بہ بستان درخت شاخ زند
چو شاخہاش گران گشت برد باد شود
درخت عمر تو سرسبز باد چندانی
کہ چار شاخش درِ عافیت ہزار شود
پناہ خلق بہ خلق فراخ دست تو باد
کہ ہمچو خلق ہمہ خلق نیک یا رشود (۵۸)

اس انتخاب کے پانچویں شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنے ممدوح سے دور رہا ہے یعنی خود ممدوح ہی غزنین سے بغداد کو آگیا تھا۔ اور ممکن ہے کہ اس ممدوح کا شمار راحت الصدور (ص ۱۸، ۲۹، ۳۰) ان حنفی علما میں ہو جن سے حکومت کو اقتدار حاصل تھا۔ شاعر نے پندرھویں شعر میں خود کو غزنوی ہونا ظاہر کیا ہے اور سترہویں شعر میں "چار شاخش" سے مراد ممدوح کے چار بیٹے معلوم ہوتے ہیں۔

اس مدح کے متعلق دوسرا قطعہ یہ ہے

ای کہ یزدان پادشاہت کرد بر ملکِ علوم
وین گواہی پیش یزدان، روزِ محشر می دہم
خاکِ پایت گر بہ دست آید سزای توتیا
نیمہ ٔ بی مایگی ہم سنگِ آن زر می دہم
حاش للہ من نیم آن مردِ ہرجائی زحرص
قصہ ٔ حاجت بہ تاویل تناور می دہم
من درین غربت کہ اوراعذر جز تحصیل نیست
گفتہ ام شعری دو لیکن یک بہ یک بر می دہم
پارسی و تازی وسلطان برہان را و پیش
این شوم انصاف فرمان بوسہ ٔ در می دہم

بنگرو برخوان وچون اصلاح کردی عرضه کن
زان کہ از شاخِ درختِ فضل او بر می دہم
صدرِ دین گر نہ طمع دارد غرامت میکشم
وربدو قانع شود شکرانہ برسر می دہم (۵۹)

یہ اشعار بھی "غربت" (شعر ۴) میں لکھے گئے ہوں گے اور معلوم ہوتا ہے کہ (شعر ۲) شاعر اپنے کلام کو بعد اصلاح کے کسی توسط سے پیش کرنا چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ بغداد کے قیام کے متعلق کوئی اور کلام معلوم نہیں ہوتا۔ ممدوح کے متعلق ایک تلمیح ملک شاہ بن محمود کی تہنیت کے ترجیع بند (راحت الصدور۔ ص ۲۵۱ بعد) میں ملتی ہے۔ اور اس کا بیان آگے آئے گا۔

غزنین کو واپسی

آگے چل کر معلوم ہوگا کہ اس کے بعد سلطان بہرام شاہ غزنوی نے شاعر کو غزنین بلوا کر نوازا ہے۔ اس قصیدے میں ہے:

یا رب منم کہ بخت مرا باز برکشید
وز قعرِ چاہِ تیرہ بہ اوج قمر کشید
بختم گرفت دربرازان پس کہ رخ نمود
چرخم نہاد گردن ازان پس کہ سرکشید
منت خدای را کہ شبِ تیرہ رنگِ من
این خاکِ بارگاہ را چون سرمہ درکشید
بہرام شاہ عادلِ اعظم کہ بہراو
بہرام برسپہر حسامِ ظفر کشید
درخدمتش دو پیکر یک رویہ شد چنانک
جان بست برمیان وپس آن گہ کمر کشید

چون او نمود بحر گہربار از آستین
دامن زشرم بخشش او ابر در کشید

بہرام کوہ کوہ ببخشید گنج زر
خورشید ذرہ ذرہ سوی کوہ زرکشید

اندر پناہ تختۂ فرمانِ مطلقش
این بندہ رختِ خود زسفر در حضر کشید

اینک بہ یک نظر کہ بکرد آفتابِ ملک
آن آب را بدزدہ بر آن چرخ برکشید

ای آن کہ آمد اختر مسعود تو بزیر
چرخ ارچہ اختران را سر بر زبر کشید

چون شمع تا بروز چو خورشید تابشب
خصم از کشادِ تیر تو حقا اثر کشید

بہر جمالِ تاجِ نو این چتر لاجورد
برکان بہ نوک دیدۂ زرّیں گہر کشید

فرخندہ بازچتر تو سیمرغِ مشرق ست
چون بال و پر کشاد جہان زیر پر کشید

شاہا امید من بخدا و بہ لطفِ تست
دریاب بندہ راکہ فراوان خطر کشید (۶۰)

دسویں اور گیارہویں شعر میں غالباً سنجر کی ۵۳۰ھ۔۱۱۳۶ء والی فتح اور بہرام شاہ کی شکست کے متعلق اشارہ ہے۔ چونکہ بہرام شاہ نے خراج دینا بند کر دیا تھا اس لئے اس سن میں سنجر غزنین پر حملہ آور ہوا تھا اور بہت ممکن ہے کہ بہرام شاہ کے لڑکے خسرو شاہ کو باج گزاری کی ضمانت کے لئے وہ اپنے ساتھ لے گیا ہو۔ کیونکہ ذیل کے قصیدہ میں جو خسرو شاہ کی واپسی پر لکھا گیا تھا۔ کچھ اسی طرح کا مضمون ہے:

خدای عزوجل باخدایگان آن کرد
که هرگز آن را والله شکر نتوان کرد
بہ یمن دولت او شرع پشت باز نہاد
زبیم صولتِ اوکفر روی پنہاں کرد
مقر دولتِ باقیش قطبِ گردون ساخت
حضیضِ ہمت عالیش اوجِ کیوان کرد
گداز دیدۂ اورا بصیرتِ دل داد
لطیف صورتِ او را نمونۂ جاں کرد
بہ دورِ دولتِ بہرام شہ کہ ہمتِ او
زگوی خاک و خمِ چرخ گوی و چوگان کرد
خدایگانا' منت خدای راکہ بہ لطف
ہلال قدر ترا ہمچو بدر تابان کرد
درِ جلالت رونق ز آب دریا یافت
گلِ سعادت منزل بہ صحنِ بستان کرد
معز دولت خسروشہ آن کزین ہجرت
فسانۂ کہ زکیخسروست برہان کرد
بلند قدر خداوند زادہ آن شاہی
کہ گرد گوی زمین چون سپہر جولان کرد
بگشت ہمچو سکندر ولی بہ کام رسید
کہ خاکِ پای ترا نام آبِ حیوان کرد
خلیل وار جو فرزندِ خویش راخسرو
بحق سپرد و حوالت بفضلِ یزدان کرد

بدوش باز رسانید دوستکام چنان
کہ دشمنان را بہر فداش قربان کرد
کنون بگیرد عالم کہ قرۃ العنیش
خلیل وار شد و نصرتِ خراسان کرد
خدا یگانْ بود ار شاہزادہ برخوردار
کہ گرچہ کرد سفر ہم بحکم یزداں کرد (۶۱)

ان اشعار اور خصوصاً اس مصرع سے کہ ع خلیل وار شد و نصرتِ خراسان کرد۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ خسرو شاہ ضرور سنجر کے یہاں رہا ہوگا اور "نصرتِ خراسان" کے یہ معنی نہ ہوں گے کہ ان نے خراسان کو فتح کیا تھا۔ بلکہ وہاں رہ کر "حوالت بفضلِ یزدان" اپنا اسیری (۶۲) کا زمانہ گزارا ہوگا اور بہت ممکن ہے کہ اسی سلسلہ میں آداب الحرب بھی سیکھے ہوں۔ شاعر کی اس مراجعت کے اوائل ہی کا یہ قصیدہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ جبکہ "نوبہار" کا زمانہ ہے اور وہ "نوبہار" ۵۴۱ھ۔ ۱۱۴۷ء کے پہلے کی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ۵۳۹ھ۔ ۱۱۴۵ء کی بہار کے وقت وہ علی عثمان کی مدح کر رہا تھا اور ۵۴۰ھ۔ ۱۱۴۶ء میں تاج الدین ابو طالب سے وابستہ تھا:

اکنون کہ تر و تازہ بخندید نوبہار
بادِ سماع و بادۂ رنگین و زلف آر
بی زلفِ یار و بادۂ رنگین و بی سماع
خود آدمی چگونہ زید وقتِ نو بہار
ای نو بہار خاستہ، پا از چمن مکش
وی زلفِ یار یافتہ، دست از قدح مدار
چون گل رود بہ تختِ سبک بہرِ تہنیت
بلبل بہ یک زبانش ثنا گسترد ہزار

وان گاه بر کشید دم و گل چو شد پدید
بلبل ثنای بنده و گل تختِ شہر یار
سلطان یمینِ دولت بہرام شہ کہ ہست
تختِ بلند پایۂ او تاجِ روزگار
آن خسروی کہ از فزعِ بندگان او
خیلِ ستارہ روز نیارد شد آشکار
گر من عواطفِ تو فراموش کردہ ام
بادا ضمانِ من و لیادیت بے شمار
واللہ کہ از ہوای تو مستی نیایدم
گر صد ہزار دل بودم ہچو کو کنا ر
ور آن چہ برزبانِ حسن رفت راست نیست
بادا دلش پرُ از خون ہچون دلِ انار
دعوی ہمی کنم من و معنیش ظاہر ست
کاندر سخن نظیر نہ دارم درین دیار (۶۳)

اس انتخاب کے آٹھویں اور گیارہویں شعر سے واضح ہوتا ہے کہ شاعر چونکہ ایک عرصے بعد غزنین واپس آیا ہے۔ اس لئے اس کی پچھلی عنایتوں کا ذکر کرتا ہے اور پھر اپنی شاعری کی تعریف بھی کرتا ہے۔ گویا اپنے تعارف کی تجدید چاہتا ہے اسی زمانے میں ابونصر محمد اور پھر ابو علی حسن کی وزارت کے موقع پر شاعر نے قصیدے لکھے ہیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔ اور اسی زمانے میں شاعر نے متعدد قصیدے بہرام شاہ اور اس کے بیٹوں کے متعلق بھی لکھے ہیں۔ اس کا ایک بیٹا دولت شاہ (المتوفی ۵۴۵ھ۔ ۱۱۵۰ء) جس کے متعلق تفصیل ہم تاریخ بہرام میں دے چکے ہیں۔ ہندوستان کی ایالت پر فائز تھا جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

تا بر سرِ ولایت خود آمدہ ست شاہ
گوئی بہ اوج در شرف ست آفتاب و ماہ

آن کامگارِ مشرق و آن شہریارِ ہند
آن اختیارِ دولت و آن افتخارِ جاہ
والا جلال ملت (و) دولت شہِ شجاع
آن آفتاب بارگہ و سایۂ الہ
شاہا، چو ملک یافت ترا بہتر از ہمہ
چون مہر سرخ روی ترا کرد باد شاہ
بردم گمان کہ ہمچو ثریا سپاہ را
خورشید حملہ کرد و فرستاد پیشِ شاہ
شاہا، خدایگانا، دانی کہ قبل ازیں
از بندہ یاد کردی رای تو گاہ گاہ
دادی ز استماعِ ثنای منت نشاط
بودی بہ اصطناعِ سخای تو ام پناہ
اکنون ہمی نہ پرسی از بندہ سال سال
زان پس کہ می رساند مدح تو ماہ ماہ
در سلکِ بندگانِ دگر گرچہ نیستم
در خاکِ بارگاہِ توام ہست آب و جاہ
واللہ کہ ہر زمان چو سوی کعبہ ہم ز دور
بوسم زمینِ تربیتِ خاکِ بارگاہ
گر بینمی ہر آینہ یک یک بہ بوسمی
ہر روز نعلِ سمّ سمندت میانِ راہ (۶۴)

آخر کے اشعار سے مترشح ہوتا ہے کہ شاعر دور سے (غزنین سے؟) یہ قصیدہ دولت شاہ کو (ہندوستان کو) بھیج رہا ہے ایک ترجیع بند میں بھی دولت شاہ کو ہندوستان کا بادشاہ کہتا ہے:

پیکری کو فتح و نصرت را بحق جان آمده ست
رشکِ رخشِ رستم و تختِ سلیمان آمده ست
مفخر دیہیم و گاہ و زینتِ تخت و کلاہ
صورتِ اقبال دولت شاہ بن بہرام شاہ

آگے چل کر پھر اسی دوری کا اشارہ کرتا ہے:

شہریارا، ہر کجا ہستم بہ فرمانِ توام
خاک بوسِ درگہت چون نقش ایوانِ توام
عمر باقی یافتی زین مدح جان افزای من
ای خضر دولت بہ رحمت آبِ حیوانِ توام
بر من آن روزیکہ براحسانِ حسانؓ جد منؒ
لاجرم گرچہ حسن نام ست حسانِ توام
مفخر دیہیم و گاہ و زینتِ تخت و کلاہ
صورتِ اقبال دولت شاہ بن بہرام شاہ (۶۵)

حدیقۂ سنائی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت یعنی تالیف کے وقت ۵۲۴ھ۔۱۱۳۰ء) بہرام شاہ کا خواجہ بو نصر، نائب دستور (ص ۷۴۳۔ لکھنو) تھا یعنی ابو نصر محمد بن عبدالحمید بن احمد بن عبدالصمد المستوفی اور اُس وقت ابو محمد حسن بن ابو نصر منصور قاینی (ص ۷۳۸ لکھنو) وزیر تھا۔ لیکن سید حسن کے ذیل کے قصیدے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب موخر الذکر لاہور کا والی (گورنر ہے) ہے۔

عمرِ مرا ہوای لہاوور بودہ بود
ہمت بر آن سعادتِ مقصور بودہ بود
نزدیک تر نمودی از جان بنزد من
زان پس کہ خود ز من چودلم دور بودہ بود

نزدیکِ نور نیک و بدیع ست و بس عجب
گوئی کہ آفتاب مگر دور بودہ بود
نی نی چنین بہ دفعِ لہاوور کی بود
این نکتہ بر ضمیرم مستور بودہ بود
دیدم کنون کہ خاصیتِ نورِ آفتاب
در ہمت محمدِ منصور بودہ بود
صدری کہ ہر یک از پدر وجدو اوچنون
در مملکت بہ رادیِ مشہور بودہ بود
بودم ضعیف داد مرا قوتِ سپاس
چون معنی کہ جانِ اوشد وانگور بودہ بود
ای آن کہ نظم کردم درسلک مدح تو
دُرہا کہ تا بہ عہد تو منثور بودہ بود
یک ہفتہ دور ماند ز دیدارِ تو حسن
از لطف درگذار کہ معذور بودہ بود(٦٦)

آخری شعر میں شاعر نے وہی غزنین سے (خراسان و عراق کی طرف) چلے جانے کا اشارہ کیا ہے۔ اور مقدم الذکر یعنی ابو نصر محمد بن عبدالحمید بن احمد بن عبدالصمد المستوفی اب وزیر ہے جس کی مدح میں سید حسن کا صرف ایک ترکیب بند ملتا ہے۔ یہاں اس کے صرف ضروری اشعار نقل کئے جاتے ہیں:

امروز یکی خوش سخنی نزدِ من آمد
کز آمدنش جانِ دگر در بدن آمد
ای دہر تودانی کہ چنو صدر نہ دارم
وی چرخ تودانی کہ چنو بدر نہ دارم

باری رخ زرینم اشکستہ چو سیم است
باری دلِ پر خونم خندہ چو انارست
می خواست کہ باطل کندم ہجر بہ بیداد
از عدلِ قوام الدین حقا کہ نیارست
قطبِ فلکِ دولت ابونصر محمد
آن بخت بدو بود موافق چہ دو فرقد(۶۷)

معلوم ہوتا ہے کہ یہ وزیر بہت کم وقت کے لئے ہمارے شاعر کا ممدوح رہا اور اس وزیر کے بعد (اغلب ہے کہ) ۵۴۱ھ۔۱۱۴۷ء ہی میں ابو علی حسن ابن احمد ابن حسین وزیر مقرر ہوتا ہے:

طلوعِ خسروِ سیارگان ز برجِ حمل
خجستہ باد ابر خواجۂ عمید اجل
یگانہ منتخبِ ملکِ شاہ و تاج خواص
کہ برگزید زخلقش خدای عزو جل
جمیلِ نام و نشان و سدیدِ قول و قلم
رفیع قدر و محلّ و عزیزِ علم و عمل
ابو علی حسنِ احمد آن کہ در شانش
شدہ ست آیتِ مردی و مردمی منزل
عجب مدار کہ یک سالہ جاہِ دشمن تو
بود بہ نسبت یک روزہ قدرِ تو مختل
اگر غروری باقیست خصم راگوباش
یکی دو کی شود از بہرِ دیدۂ احول
ازان بہ مدح تو کردم معاجلت کہ مگس
بہ سوی شہد کشاید زباں بہ شکر اول

به راستی زکچان گر کم آدم چه عجب
کالف یکی بود (و) یا ده از حروفِ جمل
نهالِ روضۂ جاہِ توام شگفته به شکر
به وقت میوہ چرامی گذاریم مہمل (٦٨)

پہلے' دوسرے اور خصوصاً ساتویں اور آٹھویں شعر سے واضح ہوتا ہے کہ ابو علی حسن بن احمد ابھی وزیر منتخب ہوا ہے اور شاعر اس کی مدح میں "معاجلت" (شعر ۷) کر رہا ہے۔ یہ وزیر جس کا خطاب منتخب الملک ہوا (جیسا کہ دوسرے شعر اور اگلے قصیدوں سے بھی معلوم ہوگا) اپنے دشمن (شاید ابو نصر محمد۔ شعر ۵۔٦) کے معزول ہونے پر اس عہدہ کے لئے منتخب ہوا تھا۔ اور اس انتخاب کا زمانہ بھی شاعر دے رہا ہے۔ یعنی پہلے شعر میں کہہ رہا ہے کہ وہ زمانہ سورج کے برج حمل میں طلوع ہونے کا تھا۔ یعنی مارچ۔ اپریل کا زمانہ ہوگا اور وہ سال ۵۴۱ھ (شوال۔ ذی قعدہ مطابق مارچ۔ اپریل ۱۱۴۷ء) ہی ہوگا کیونکہ ایک دوسرے قصیدے میں شاعر کہتا ہے:

کاری به گزاف می گذارم
عمری به امید می سپارم
نی زہرۂ آن که دل بجویم
نی طاقتِ آنکه دم برآرم
اندیشه بسوخت عقل و روحم
امید ببرد روزگارم
گر رنج تو نیست ہیچ راحت
جز بر درِ خاصِ شہر یارم
صاحب حسن آن که شاہِ دولت
جز بر درِ او نه داده بارم

نبود اگر از زبانِ حالت
گوید که جهانِ افتخارم
زر پاش چو شاخ در خزانم
دُر بار چو ابر نو بهارم
آں صدر منم که از عزیزی
پرورد اقبال در کنارم
شکر ایزد را که مملکت را
من از دو وزیر یادگارم
بر دشمن و دوست هرچه کردم
پاداش دهاد کردگارم
گفته قلمش که می نیاید
از شادیِ دستِ او قرارم
انگشت نهم درست بر حرف
تا منتخب ست دستیارم
از عونِ سخات بامرادم
وز جود یمینت با یسارم
گشته ست به دولت تو حاصل
آنها که نه بود در شمارم
گر از تو نه دانم از که دانم
ور ازتو نه دارم از که دارم
هرمکرمتی که می رسانی
شکرت به سزا همی گذارم

ہر قطرہ کہ بخشیم صدف وار

دُرّی بہ تو بازمی سپارم

بشگفت ہمہ جہان ز فضلم

بشگفتہ یکی گل از ہزارم

زنہار بحق معوتم کن

کز حق بر تو بزینہارم

خلعت دادیم پار الحق

امسال در آرزدی پارم

تا باز چو باغ خوش بخندم

تا باز چو ابر در ببارم (۶۹)

اس قصیدے کے آخر میں شاعر اپنے تعلق اور "خلعت" حاصل کرنے کا زمانہ پچھلے سال کا بتاتا ہے۔ اور خود اس قصیدے کی تصیف کا زمانہ ۵۴۲ھ۔۴۸۔۱۱۴۷ء سے بعد کا نہیں ہو گا کیونکہ ۵۴۳ھ / ۱۱۴۸ء کی ابتدا ہی سے غزنین کی پریشان حالی کا زمانہ شروع ہو تا ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ جمادی الاول ۵۴۳ھ (ستمبر ۱۱۴۸ء) میں جب سیف الدین سوری نے پہلی بار غزنین پر قبضہ کیا ہو گا تو اس سال کے شروع ہی میں بہرام شاہ بھاگ چکا ہو گا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس سال یہ قصیدہ نہ لکھا گیا ہو گا۔ بلکہ ۵۴۲ھ۔۱۱۴۷ء میں لکھا گیا ہو گا۔ جبھی تو شاعر کہہ سکتا تھا کہ "پار" سال اس صدر نے "خلعت" بخشا تھا یعنی "خلعت" بخشنے کا اور شاعر کے شروع تعلق کا زمانہ ۵۴۱ھ۔۱۱۴۷ء کے بعد کا نہیں ہو سکتا۔

مذکورہ بالا قصیدے میں ع من از دو وزیر یادگارم۔ سے ظاہر ہے کہ اس حسن کا باپ احمد (جیسا کہ ہم تاریخ بہرام میں لکھ چکے ہیں) بہرام شاہ کا وزیر رہ چکا ہے اور خود احمد کا باپ حسین بھی شاید وزیر کبھی رہ چکا ہو۔ حسین کا نام ایک قصیدے میں اس طرح آیا ہے:

یارب چہ سوز بود کہ اندر جہان فتاد

سودِ حسود صدرِ جہان را زیان فتاد

صدرِ جہانیاں حسن احمد حسین
کش دست و دل بجود سوی بحر وکاں فتاد
مہ نورمی فشاند و سگ بانگ می زند
مہ راچہ جرم خاصیتِ سگ چنان فتاد (۷۰)

اس قصیدے سے ظاہر ہوتا ہے کہ حسن کے منتخب ہونے پر دوسرے لوگ بہت حسد کرتے تھے کیونکہ شروع سے آخر تک اس قصیدے میں اسی قسم کے اشعار ہیں اس خیال کی مزید تائید کچھ ان اشعار سے بھی ہوتی ہے۔ جو ہم نے اس ممدوح کی مدح کے پہلے قصیدے میں اور نقل کئے ہیں۔ اس وزیر کی مدح کا ایک اور قصیدہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ تاکہ پوری طرح محقق ہو جائے کہ وہ بہرام شاہ ہی کے یہاں تھا:

رخش برمہ گلستان می نماید
بر آتش آبِ حیوان می نماید
چو گردون دل بسی دارد ولیکن
چو گردون جملہ گردان می نماید
بیاتاشکرِ آن گویم کہ صاحب
بہ جانِ من چہ احساں می نماید
قوامِ دولت وملت حسنِ آن
کہ صدر و بدرِ اعیان می نماید
خداوندی کہ این گردونِ سرکش
مثالش را بہ فرمان می نماید
خدایا این چہ اخلاص و سداد ست
کہ او در ملکِ سلطان می نماید
خداوندِ جہان بہرام شاہ آن
کہ با فرِّ سلیمان می نماید (۷۱)

ایک ترجیع بند میں سید حسن نے اس کو "شمس المعالی بھی کہا ہے:

عشقِ مارا تا ابد باقی مگر
سایۂ شمس المعالی می کند

صاحبِ صاحب نسب مخدومِ من
عمدۂ دولت قوام الدین حسن (۷۲)

اسی "قوام الدین حسن" کے زمانے میں جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ ہمارے شاعر نے "صاعد" ابو بکر بن حیدر کرمانی کو یہ قطعہ بھیجا تھا جو اس کے کلام کی رسید میں تھا:

به من بو بکر حیدر تازہ تازہ
ہمی دُرّ و گلِ خندان فرستد
گہی زہرِ مرا تریاک سازد
گہی دردِ مرا درمان فرستد
گہ از شاخِ وفا نوبادہ بخشد
گہ از باغِ ہنر ریحان فرستد
نسیمِ پُر تحیت کان خداوند
ز طبعِ خویش ازبستان فرستد
بہ ہدیہ چشم نزدِ دل رساند
بہ تحفہ دل بہ سوی جان فرستد
نہ دانستم من این یارب کہ دانست
کہ ایزد بہرِ عیسیٰ خوان فرستد
تحیت تا بود نورٌ علی نور
بہ دستِ سید اقران فرستد

عدیم المثل صاعد آن کہ کلکش
بہ تیرِ آسمان فرمان فرستد
بلی خورشید چون گل را دہد نور
صبا بوی مہِ تابان فرستد
نم چشمِ قلم راشرم دارد
کہ سوی چشمۂ حیوان فرستد (۷۳)

ابو بکر ابن حیدر کرمانی نے پھر اسی قطعہ پر ایک قطعہ لکھا جو ہمیں دیوانِ سید حسن کے نسخوں میں مل جاتا ہے۔ وہ اس طرح ہے:

بہ من سید حسن زین زمانہ
ز دل تحفہ غذای جان فرستد
بدان نظمِ بدیع و نثر رایق
تو گوئی معجزِ فرقان فرستد
ولیکن مدتِ بسیار دارم
کہ می دردِ مرا درمان فرستد
مر ایں مشتاق و مہجور حزیں را
شفا زان لفظِ دُر افشان فرستد
شراب از مایۂ کوثر رساند
نسیم از روضۂ رضوان فرستد
جوابِ آں فرستادن کہ داند ؟
مگر زندہ شود حسانؓ فرستد
خرد نپسندد از طبعِ من ار ہیچ
بضاعت زیرہ از کرمان فرستد

ازین بی مایہ بس باشد کہ شکرش
بہ صدرِ خاصۂ سلطان فرستد
قوام الدین حسین صدری کہ دولت
مرادِ دل بدو آسان فرستد
بہ ہر دعویٰ کہ دارد از کفایت
فلک ہر لحظہ صد برہان فرستد
گذشتہ روز گیتی چند باشد
خدایش عمر صد چندان فرستد
عزیزی بس بران سید رساند
سلامی کین دل حیران فرستد
چو بر خواند بشوید تا نہ گوید
چنان شعری چنین نادان فرستد (۷۴)

ان دونوں قطعوں میں ایک دوسرے کے باہمی خلوص کا اظہار پایا جاتا ہے اور اس قطعہ کے آٹھویں اور نویں شعر سے پایا جاتا ہے کہ قوام الدین حسن کے یہاں واقعی سید حسن کی قدر دانی ہو گی۔ ساتویں شعر میں ابو بکر ابن حیدر نے اپنے مستقر کرمان کا نام بھی دے دیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ کرمان، غزنین اور ہندوستان کے درمیان والا مقام ہو۔ معجم البلدان (جلد چہارم۔ ص ۲۶۶) میں بھی اس کا ذکر ہے کہ:

" کرمان ایضا مدینة بین غزنه وبلاد الهند من اعمال غزنه بينهما اربعة ايام او نحوها۔ (۷۵)

اسی "صاعد" ابو بکر ابن حیدر کے انتقال پر سید حسن کو سخت صدمہ ہوتا ہے۔
اور وہ مرثیہ بڑے درد سے لکھتا ہے:

ای چون مسیح گوہرِ تو جملہ جان شدہ
سجدہ کنان بہ صومعۂ آسمان شدہ

از علتِ کمال کہ بر تو ز چشم بد
ترسیده و ہم ناقص و آخر ہمان شده
ای بی نظیر صاعد بو بکر پرُ ہنر
الحق درود خوانِ تو دارِ جہان شده
بر دوستان و یاران چون ماه برنجوم
تاریک کرده عالم و خود از میان شده
تازه گلِ امید تو پژمرده ناگہان
ہم در حجاب غنچۂ از بوستان شده
خورشید دولتِ تو چو ماه مقنعی
پیدا ہنوز نا شده در چہ نہان شده
از مرگِ تو کہ مردِ بزرگی بزرگ باد
در بختِ نیکِ خود ہمہ کس بدگمان شده
ای کلک سر فگنده و دُرج سیاه روی
وی نظم دل شکستہ و دفتر زیان شده
دردا کہ شد پدر ز وفاتِ پسر یتیم
احسنت اینست حاصلِ عمرم زیاں شده
جز مردمی مخوانش حسن زان کہ حالِ او
چون مردمی ست نام بمانده نشان شده (۷٦)

غالبًا اسی زمانے میں بہرام شاہ ہی کا خازن احمد ابن عمر تھا۔ ایک قصیدے میں ہے:

دلی کہ بال و پر از عشقِ آن پسر یابد
چو جان نشیمنِ خود عالمی دگر یابد
امید کرد مرا لعلِ او کہ زنده کند
نعوذ باللہ اگر چشم او خبر یابد

دلم زغمزهٔ او گرچه یافت ناوک سحر
مباد گو ز دلم ناوکِ سحر یابد
به سر زمین راچون آب اگرچه بپاید
بخاکِ پای خداوندِ من اثر یابد
نه او، نه من، نه فلک تا هزار سال اگر
چو صدرِ دولت و دین احمد عمر یابد
بدان عزیز بود سیم و زر کزان هردم
چنان که خواهد بر کامها ظفر یابد
ازان سبب که یکی هندوی به من بخشد
هزار ترکِ سیه زلفِ سیمبر یابد
به بزم ازایشان چستیِ آهوان خواهد
به رزم ازایشان تندیِ شیر نر یابد
چو من مبادا که از عشقِ هندوی لاغر
زہآب آتش درچشمۂ جگر یابد (۷۷)

گو کہ ہمارے پاس کوئی پختہ ثبوت نہیں ہے کہ جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ یہ خازن غزنین ہی کا تھا۔ لیکن ساتویں اور نویں شعر میں "ہندو" غلام کا تذکرہ یہی خیال پیدا کرتا ہے کہ ممدوح غزنین کا تھا۔ ورنہ کسی اور مقام میں ایسا تذکرہ زیادہ موزوں نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک ترجیع بند میں اسے صاف طور پر "خازن" کہا ہے:

بیار بادہ کہ لبیک عشقِ یار زدیم
سرای پردهٔ دل سوی آن نگار زدیم
خدای داند اگر آسمان کہ گردیدہ ست
چو احمدِ عمر خاص خازنی دیدہ ست (۷۸)

اس زمانے تک جمال الدین صدر الاسلام ابو نصر احمد (بن محمد بن سلیمان، حدیقہ ص ۷۶۵ تا ۷۷۴ لکھنو) زندہ تھے۔ ان کی مدح میں ایک قصیدہ ملتا ہے:

آفتابِ رای صاحب بخت بر جوزا نہاد
اخترِ فیروزہ بخشش روی بر بالا نہاد
دُرّ دریای خداوندی ابو نصر احمد آنک
موکب بختِ ابد بر مرکب جوزا نہاد
حاسدان کردند قصدِ دولتِ باقیِ او
خلق چون باطل کند جای کہ حق آن را نہاد
مہترِ کہتر نواز و خسروِ گردون محل
کافیِ نیکو خصال و خواجۂ زیبا نہاد
حکمتی بود آن کہ چون در کار دنیا فرد گشت
دردِ دین را چون امانت در دلِ بینا نہاد
فیضِ حق ہر جا کہ مردی یافت بخت آن جا فگند
شاہِ دین ہر جا کہ تختی دید رخت آن جا نہاد
ابر نوروزی بر آمد از سر تر دامنی
در دہانِ نرگس تر لولوی لا لا نہاد
بندہ ہم دُرّی ولی از بحر طبع پاکِ خود
کرد منظوم و بہ خدمت پیش مولانا نہاد (۷۹)

پھر اسی مولانا جمال الدین ابو نصر احمد کا مرثیہ بھی ملتا ہے:

ای دلت بی خبر از مملکتِ عالم جان
چیست چندین ہوس از بہر سپنجی زندان
پای در گلِ شدہ چون سرو، چہ باشی آزاد
با دلِ سوختہ چون لالہ، چہ باشی خندان

زندہ از باد مشو بیہدہ چون شیر علم
تکیہ بر خاک مکن خیرہ چو نقشِ ایوان
راستِ رو یک رہ واز پوست برون آی چو تیر
چہ شوی کژ زپئی کسوتِ دیگر چو کمان
گرچہ ز اندازہ برون کج شنود بدبنی
چشم و گوشِ تو بس این چشم بدنا گاہان
کہ جمال الدین' خورشید قضا احمد کرد
در شبِ قدر نشاطی بہ جوارِ رحمٰن
زان کہ تابا احد افتد سروکارِ احمد
زحمتِ میم ہمی برد برون ہم زمیان
آہ و دردا کہ شد اخبارِ طریقت باطل
آہ و دردا کہ شد آثارِ حقیقت ویران
نیک زردست درین واقعہ روی حکمت
بس شکستہ ست درین حادثہ پشتِ ایمان
قلمِ حکمِ قضا برتو روان شد پس ازانک
قلمِ حکمِ قضائی تو بسے در دوران (۸۰)

اس انتخاب کے چھٹے اور دسویں شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جمال الدین احمد' قاضی القضاۃ ہوگئے تھے۔ اب ہم ان کے انتقال (جو شب قدر میں ہوا تھا) کی تاریخ اس طرح تلاش کرسکتے ہیں کہ ہمارا شاعر جیسا کہ ہم اوپر بیان کرچکے ہیں ۵۴۰ھ کی "نوبہار" یعنی شوال' مطابق ۱۱۴۶ء سے پہلے غزنین کو واپس نہ آیا ہوگا۔ یعنی اس سال کے رمضان میں ان کا انتقال نہیں ہوا ہوگا۔ اور ہم تاریخ بہرام شاہی میں لکھ چکے ہیں کہ جمادی الاول ۵۴۳ھ (ستمبر ۱۱۴۸ء) میں سیف الدین سوری' غزنین پر قابض ہوا تھا۔ اس لئے وہ زمانہ پریشان حالی کا

ہو گا۔ نیز اوپر کے تیسرے شعر میں غزنوی "شیر علم" (جس کی تفصیل میں معارف۔ مارچ تا اپریل ۴۴ء میں دے چکا ہوں) کی تشبیہ سے خیال ہوتا ہے کہ اس وقت غزنوی حکومت قائم تھی اس لئے وہ زمانہ ۵۴۳ھ۔ ۱۱۴۸ء کا بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد محرم ۵۴۴ھ (مئی ۱۱۴۹ء) میں پھر بہرام شاہ' غزنین کو واپس لے لیتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ اسی سال کے رمضان میں جمال الدین کا انتقال ہوا ہو یا پھر ۵۴۱ھ۔ ۱۱۴۷ء یا ۵۴۲ھ۔ ۱۱۴۸ء کا حادثہ ہو گا۔ اور وہ زمانہ ۵۴۴ھ۔ ۱۱۴۹ء کے بعد کا اس لئے نہیں ہو سکتا کہ شاعر ۵۴۵ھ۔ ۱۱۵۰ء میں ہمیشہ کے لئے غزنین کو خیر باد کہہ دیتا ہے اور اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

پھر بہرام شاہ اور اس کے تین بیٹے مسعود شاہ' خسرو اور شاہنشاہ جن کا حال آگے آئے گا اس شاعر کے ممدوح ہیں اور ظاہر ہے کہ اسی عہد میں اس نے ان کی مدح کی ہوگی کیونکہ اس کے قبل شاعر غزنین میں تھا بھی نہیں بہر حال ان کا تذکرہ بعد میں آئے گا اور ہم اب یہاں سے غزنین کے پر آشوب زمانے میں داخل ہوتے ہیں۔

غوری دربار سے تعلق

ہم تاریخ بہرام شاہی میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں کہ سیف الدین سوری کا بھائی قطب الدین محمد کس غرض سے فیروز کوہ سے غزنین کو آیا اور وہ کس لئے مسموم ہوا۔ نیز سوری اپنے بھائی بہاؤالدین سام اور علاؤالدین حسین کے ساتھ کب غزنین پر حملہ آور ہوا مختصر یہ کہ جمادی الاول ۵۴۳ھ (ستمبر ۱۱۴۸ء) میں جب سوری غزنین پر قابض ہوا تو اس کے مقابلے کی تاب نہ لا کر بہرام شاہ پہلے ہی سے ہندوستان کی طرف ایک مقام کرمان کو بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ سوری اپنے بھائیوں کے ساتھ غزنین میں مقیم ہو گیا اور حکومت کرنے لگا۔ اس وقت ہمارا شاعر وہیں تھا۔ اور اس نے سوری کو تو نہیں بلکہ اس کے سب سے زیادہ طاقتور اور بہادر بھائی علاؤالدین حسین (جو بعد میں جہان سوز کے نام سے مشہور ہوا) مدح میں ایک قصیدہ لکھا جس کے کچھ اشعار یہ ہیں۔

باز براوجِ سخن نازم و موجی بزنم
زان که چون ابرِ گهر بار دفین عدنم
همچو خورشید به شاهی زکله تاج کم
نه عروسم که به شب طره بهم برشکنم
زلۀ خود بنهم پیش و دهم نوش به خلق
نحل این طارم شش گونه به تحقیق منم
ای دریغا که چو گل عمر سبک خیر برفت
که بخندید ز اقبال گلی بر چمنم
درپیِ من چه فتاده ست فلک هیچ مگر
من نه برداشتۀ خسرو لشکر شکنم
فخر دین شاه عدو بند علاؤ الدوله
آن که مست اند از جام کرمش جان و تنم
آن حسن اصل که در مدحش از چهرهٔ نطق
عقل بی همرهٔ تفصیل نه خواهد حسنم
وان عجم شاه عرب شاه که داد اختر سعد
بردار او چو سعادت به غلامی وطنم
دامن خدمت اوچست گرفته ست نخست
دست وحشت که ستون بود به زیر دهنم
خسروا ست سخن می کندم سختی عیش
چه عجب رخنه شو و تیغ که برسنگ زنم
پیر گشتم به جوانی گو و هم نیست جز آنک
گلشن مدح ترا خوش سخنی چون سمنم

نی مکن شاہا دریاب کہ گر کشتہ شوم
برنیاید ہمہ عالم بہ بہای کفنم (۸۱)

علاؤالدین حسین (شعر ۶) کو شاعر نے ساتویں شعر میں "حسن اصل" اس لئے کہا ہے کہ اس کا دادا (حسین بن حسین بن حسن) حسن تھا۔ پانچویں شعر میں شاعر صاف کہہ رہا ہے کہ ممدوح کے لشکر نے اسے ماخود کر کے یہاں پیش کیا ہے۔ اور اب وہ (۸۔ ۱۲) اس دربارا سے وابستہ ہو کر مدح سرائی کر رہا ہے۔ اور چونکہ ممدوح خود شاعر تھا۔ جیسا کہ ہم تاریخ بہرام شاہی کے سلسلے میں لکھ چکے ہیں اس لئے کوئی بعید نہیں ہے کہ اس نے شاعر حسن کی کافی قدر کی ہو۔

بہرام شاہی دربار کو مراجعت

اس زمانے میں سوری نے رعایا کے ساتھ اچھا سلوک کیا لیکن رعایا کو اپنا پرانا بادشاہ بہرام شاہ زیادہ پسند تھا۔ اس لئے ان لوگوں نے خفیہ طور پر اس کو حملہ کرنے کی ترغیب دی اس دوران میں سوری نے خود کو محفوظ سمجھ کر اپنے بھائیوں اور غور والے خاص مصاحبوں کو واپس بھیج دیا تھا۔ چنانچہ بہرام شاہ نے یہ موقع غنیمت جان کر اپنی ہندوستانی فوج سے بھی مدد لے کر ایسے وقت حملہ کیا کہ موسم سرما کی شدید برف باری کی وجہ سے غور سے غزنین کی طرف کا راستہ بھی بند ہو چکا تھا۔ غرض کہ سوری کو گرفتار کر لیا گیا اور اس کا سر کاٹ کر بہرام شاہ نے سنجر کو بمقام رے روانہ کیا۔ سوری کے وزیر سید مجد الدین کو بھی قتل کیا اور اس کے مصاحبوں اور ارکان دولت کو گرفتار کر لیا۔ اس کی صحیح تاریخ ہم آگے بیان کریں گے اور یہاں اسی سلسلے میں محمد عوفی کی روایت کو نقل کرتے ہیں "و گویند کہ دران وقت کہ سلطان بہرام لشکر سلطان سوری رابشکست و رایت فتح و ظفر معلاّ گردانید و سر سوری روان کرد بخدمت سلطان سنجر و جماعتی از ارکان آن دولت را اسیر کردند۔ سید حسن درمیان آن اسیران بود۔ سلطان بہرام شاہ فرمود تا اسیران را سیاست کنند۔

حسن گفت من کلمۂ دارم درخدمت پادشاہ۔ اگر مرا بہ نزدیک او برید عرضہ دارم' اورا

بخدمت بہرام شاہ بردند سر برزمین نہاد واین رباعی ادا کرد کہ

دانی کہ فلک بہ پیش تیغت ناید
بخشش بجز از کف چو میغت ناید
زخم تو کہ پیل کوہ پیکر نہ کشد
برپشہ ہمی زنی دریغت ناید

(یہ رباعی سن کر) سلطان در حالِ او عفو فرمود۔ تشریف منادمت ارزانی داشت"

(۸۲) لیجئے یہ اگر بدیہہ گوئی کا نتیجہ ہو سکتا ہے تو ساتھ ہی بہرام شاہ کی قدر شناسی اور عفو کرداری کی بھی بین دلیل ہے۔ پھر سید حسن نے یہ قصیدہ بھی لکھا جو تاریخی حیثیت سے بہت اہم ہے۔ اس کی تفصیل ہم تاریخ بہرام شاہی میں دے چکے ہیں۔ یہاں اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

سزد گر جبرئیل آید، برین فیروزہ گون منبر
کند آفاق را خُطبہ بنامِ شاہِ دین پرور
بنازد قالبِ چتر و ببالد قامتِ رایت
بتابد پایہٴ تخت و بجنبد گوہر افسر
خداوندِ جہان بہرام شاہ آن شہ کزین فتحش
دلِ خورشید شد روشن تنِ افلاک پُر زیور
روم از مدح شاہنشہ کہ باقی ماند دردولت
بہ ذکر سوری فتان کہ خاکش باد خاکستر
زغاری رفتہ چون تنین زخاکی زادہ چون افعی
زبادی جستہ چون نکباء زسنگی رستہ چون آذر
چو از خورشید جود شاہ روشن گشت کارِ او
زدونی غرّہ شد یعنی کہ خود ہستم مہ انور

به خلق و خلق زشت و بد به خورد و زیست دام و دو
به اصل و ذات دون و رد، به قول و فعل شور و شر
چو پیش شاه دیدندش برآمد نعره از عالم
که هی هی این چه تاریکیست پیش نور و جرمِ خور
شهنشه گفت نی نی چو این فتنه گذشت از حد
کنم این فتنه را ساکن دهم این بی خرد را خر
فرشته کرد پنداری هزاران دیو را فرمان
که باز آمد به تختِ ملک سلطانِ سلیمان فر
که شد عالی بفرش باز قصر ملک و برج دین
ز بهر دفع چشم بد فرو آویخت دو پیکر
دو پیکر گشته آویزان ز عالی کنگره میدان
بر آن جمله که از گردون نماید برج دو پیکر
دوم روز محرم سال بر، ثا، میم، و دال الحق
برآمد نامور فتحی کزان گویند تا محشر
تعالی الله چه ساعت بود کا مد شاه در کابل
خدایش حافظ و ناصر سپهرش مخلص و یاور
چو مرکز شاه در قلب و قوی بازوی اقبالش
به سه فرزند شایسته چو دو قطب و یکی محور
گلِ باغ جهان داری سماء الدوله مسعود آن
کش از آرائیش مخبر بشارت می دهد منظر
مه چرخ خداوندی معز الدوله خسرو شه
که لرزان ست از گرزش عمودِ صبح روشن گر

دُرِ بحرِ شہنشاہی معین الدولہ شاہنشہ
کہ بست ازگوہرپاکش عروس مملکت زیور
وزیر عالم و عادل سفیرِ کامل و مقبل
کہ بتوان یافت از ہر دو نشان و نام پیغمبر
بہ گردِ شاہ فوجا فوج لشکر ہای ہندستان
کہ گوئی ذرۂ خورشید برخوشید از خاور
سپہ سالار غازی شان علی بوسہل شیرا وژن
کہ دادش دولتِ سلطان تنِ رستم دلِ حیدرؓ
سپاہِ غور ہم کو رست خواہی باہمہ کری
چو آتش نیزہ زن بودند ہمچو آپ جوشن ور
روان گر دند سوی غور گوئی خصم ایشان شد
خدای و خلق و کوہ ودشت وسنگ وخارو بحر و بر (۸۳)

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ بہرام شاہ کابل ہوتا ہوا (۱۴) آیا اور اس کے ساتھ اس کے تین بیٹے یعنی سماء الدولہ 'مسعود شاہ' معزالدولہ 'خسروشاہ اور معین الدولہ شہنشاہ (۱۶-۱۸) تھے۔ اس وقت وزیر شاید لاہور والے محمد بن منصور (۱۹) ساتھ ہوں گے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ نیز ہندوستانی لشکر (۲۰) اس کی مدد کے لئے آیا تھا۔ جس کا سپہ سالار علی ابو سہل (۲۱) تھا اور یہ فتح (جمعہ) ۲ محرم ۵۴۴ھ (۱۲ مئی ۱۱۴۹ء) کو واقع ہوئی جس میں سوری کو گدھے (۹) پر بٹھا کر تشہیر کیا گیا اور پھر اس کے وزیر کے ساتھ اس کو دار پر چڑھایا گیا (۱۱-۱۲) ان تمام باتوں کی تفصیل ہم تاریخ بہرام شاہی میں دے چکے ہیں اس لئے یہاں صرف اتنا ہی لکھ کر آگے بڑھتے ہیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ شاعر غوری دربار سے وابستہ ہو گیا تھا اور اس نے مدح سرائی بھی کی تھی اس لئے اسی قصیدۂ مذکورہ بالا میں چند اشعار یہ بھی ہیں جن سے وہ اپنے معاملہ کی صفائی کر رہا ہے۔

ایا شاہی کہ گر ابلیس عفوت راشفیع آرد
بنزد حق بدو بخشد گناہِ جملۂ محشر
بہ لطفِ اوکہ گرخواہد چنین صنعی پدید آرد
کہ مردم ہر چہ می بیند زخود ہم نایدش باور
کہ ہفت اقلیم زندان ست بر من بی جمالِ تو
نہ خوشنودم زجان ودل نہ آگاہم زخواب وخور
معاذ اللہ کہ نگریزم زخدمت ہرکجا باشم
تو بس نیکو خداوندی منم بس بندہ و چاکر
مرا رنجت بہ ازراحت، مرا دردت بہ ازدرمان
مرا خارت بہ ازخرما، مرا دارت بہ از منبر
تونور عالم و ظلِ خدای و ز نور و ظل
بجز اندر عدم پنہاں شدن کاری بود منکر
اشارت کن سدیدی را کہ حال من کند روشن
چو شد جرمم یقین تو ذیلِ عفو خود بران گستر
بہ یک فرمان کہ نافذ باد ازیں شرمم خلاصی دہ
بہ یک رحمت کہ شامل باد ازین رنجم برون آور

یہ ''سدیدی'' جس کے توسط سے شاعر اپنی شفاعت چاہتا ہے غالباً وہی ابو علی حسن ابن احمد ابن حسین المخاطب بہ منتخب الملک یعنی بہرام شاہ کا وزیر ہوگا جس کے متعلق ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ ایک قصیدے میں شاعر کہتا ہے:

منّت خدای را کہ بہ اقبال بادشاہ
ایمن شد از کسوف و خسوف آفتاب و ماہ
منّت خدای را کہ شگفت و چمید باز
ہم گلبنِ سعادت و ہم سروِ بارگاہ

منّت خدای را که به ضعِ لطیف داشت
روی نکوی منتخب از چشم بد نگاه
منّت خدای را که زمانه گرفت خو
زان آفتابِ مملکت و سایهٔ اله
بس چشم شور و روی ترش بود منتظر
تا چشم شان سپید شدوروی شان سیاه
باری به اوج ماه نه بیند کسی سها
باری بجای سرو نه بیند کسی گیاه
تاجِ خواص برسر دولت رسید باز
تاهر فضول کثر نه نهد گوشهٔ کلاه
آئینه که عکسِ بزرگی نموده گشت
روشن چنان که تیره نه گردد به ہیچ آه
خورشید مملکتِ حسن احمد آن که ساخت
درسایهٔ سعادت او ملک و دین پناه
باز آمدی چو باز سپید از گریز جای
باز آمدی چو شیر سیه درشکار گاه
من بنده را که هست زهرعلم حاصلی
رهبر توئی رها مکن اندر میان راه
جز تربیت چه یابد گل درکنارِ خار
جز تصفیت چه بیندز زر درمیانِ گاه (۸۴)

ان اشعار میں وہی سوری (۵) اور اس کے وزیر (۵۔۷) کا تذکرہ ہے کہ جن کے بعد بہرام شاہ اور اس کا وزیر حسن ابن احمد دوبارہ غزنین میں متمکن ہوا ہے۔ آخری دو شعر شاعر کے

ابتدائی تعارف کے متعلق نہیں ہو سکتے کیونکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس سے پہلے بھی اس وزیر کی مدح کی ہے بلکہ وہ شعر (خصوصاع رہبر توئی رہا مکن اندر میان راہ) شاعر اپنی شفاعت کے لئے پیش کر رہا ہے۔ بہرام شاہ کی اس خوشی یعنی دوبارہ تخت غزنین حاصل ہونے کے متعلق شاعر کچھ عرصہ کے بعد پھر کہتا ہے:

اندرین عید مبارک پئی و فرخندہ اثر
باردادہ ست سلیمان مگر بارِ دگر
کہ ز پیلان و دلیران و شجاعان امروز
مردم و دیو و پری گشت فراہم یک سر
چشم بد دور ازین تعبیۂ ابرِ بہار
کہ ولی راہمہ آب است وعدورا آذر
تازہ بزمی ست عیان گشتہ از و صورتِ رزم
خوش بہشتی ست نہان گشتہ درو زیرِ سقر
شاہ درمرکزِ اقبال توقف کردہ
تعبیہ درکفِ رایت او فتح و ظفر
چتر عالیش چو چرخی کہ شود بی حرکت
تختِ میمونش چو کوہی کہ بود خان آور
رفتہ باکوکبہ در مشرقِ خورشید ملوک
سہ ملک زاد کشان بندہ سزد ہفت اختر
ہمہ درباغِ شہنشاہی خندان چون گل
ہمہ از چرخِ خداوندی تابان چو قمر
بندگان چست چو گلبن بہ قبا و بہ کلاہ
حاجبان راست چو خامہ بدو وشاخ وبہ کمر

ماہ رویان کہ براسپان وہیون می جستند
چون پری راست کہ با دیو شود بازیگر
پیل بازی کہ بران پیکر خاکی می جست
بود پنداری چون مردم آبی با پر
گر کبوتر بنود کہ کہ بنازد بر ابر
کرد بایستی امروز دران ترک نظر
وان معلق زدنش راست برایشان کہ بود
دل بد خواہ خداوندِ جہان زیر و زبر (۸۵)

شاعر ان اشعار میں بہار کی خوشی اور اس کے جشن کا اظہار کر رہا ہے اور بہرام شاہ کے اس وقت کو بھی یاد کر رہا ہے جبکہ وہ سہ ملک زادہ کے ساتھ ہندوستان کی طرف گیا تھا اور فاتح کی حیثیت سے واپس آیا تھا۔ اس مدح کا زمانہ ذی قعدہ ۵۴۴ھ (مارچ ۱۱۵۰) کا ہو گا۔ کیونکہ اس کے عہد ۵۴۵ھ۔ ۱۱۵۰ء میں شاعر حج کے لئے روانہ ہو جاتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی طرف سے بہرام شاہ کا دل بمشکل صاف ہوا تھا کیونکہ ایک "سوگند نامہ" بھی ملتا ہے جو اسی مضمون سے تعلق رکھتا ہے۔

کشاد صورت دولت بہ شکرِ شاہ دہان
چو بست زیور اقبال بر عروسِ جہان
خدایگانِ سلاطین مشرق و مغرب
علاء دینی و دین خسرو زمین و زمان
ابو المظفر بہرام شاہ بن مسعود
کہ ہست نامش بر نامۂ ظفر عنوان
کشاد، دولت و دین چشم تا رود بر تخت
نہادہ جان و جہان گوش تا دہد فرمان

تبارک الله ازان ساعتِ خجسته چه بود
که بازگشت مظفر زغز و هندوستان
جهان به کام و فلک بنده و ملک داعی
امید تازه و دولت قوی و بخت جوان
فتوح سوی یمین و سعود سوی یسار
سپهر زیرِ رکاب و زمانه زیرِ عنان
خهے فزوده مے جودِ تو ز جامِ امید
زہے شگفته گل فتحِ تو زخارستان
زطبعِ تست زمان را بهار گوهر بار
زجودِ تست زمین را خزان درم افشان
قوی دلت که مبادا سبک دریغ که شد
به هر دروغ به این بندۂ ضعیف گران
بدان خدای که هرذره بر خداوندیش
همی نماید چون آفتاب صد برهان
بدان رسولؐ که بر فرقِ آسمان سایش
ملک تعالیٰ تاجی نهاد از فرقان
به راحتِ دمِ جان بخش عیسی مریم
به بسطتِ کف پر نورِ موسی عمران
به حسنِ نغمۂ داوٗد رفعت ادریس
به نظمِ ملکِ سلیمان و حکمتِ لقمان
به مردی علی و راست گوئیِ صدیق
به صولتِ عمرو شرم روئیِ عثمان

به رزم رستمِ دستان و بزم کیخسرو
به بذل حاتم طائی و عدل نوشروان
به عهدِ تو که درازست پیشِ او مدت
به عفو تو که فراخ است نزد او میدان
که حقِ نعمتِ یک روزهٔ تراکان ست
فزون زریگِ بیابان و قطرهٔ باران
به عمر خود نه فراموش کردم و نه کنم
نه نیز در دلم آید که هرگز این بتوان
وزین خلاف بود بس نه گفته ام که تو شاه
نه آفتاب جهانی و سایهٔ یزدان
ملک به مدحت ایامِ تو زبان بکشاد
فلک به خدمتِ درگاهِ تو به بست میان
خدایگانا گندم نه خورده چون آدم
برونِ فتادم ناگه ز روضهٔ رضوان
دریغِ من که چو شد کار مملکت چون تیر
کشید بر من سرگشته روزگار کمان
من اوّلاً کیم و آخر آن چه سهو بود
اگر کنم که به بخشایش تو ارزد آن
امیدِ خلعت "ثمّ اجتباہ" می دارم
که روز و شب شده ام "ربنا ظلمنا" خوان
خدای عزّ و جل داند ای سلیمان فر
که ہمچو عنقا ازین شرم گشته ام پنہان

مرا عزیز تو کردی بہ جست جوی یقین
کنون ذلیل مگردان بہ گفت و گوی گمان (۸۶)

یہ طویل "سوگند نامہ" جو اکسٹھ اشعار کا ہے اس لئے اہم ہے کہ بالکل اسی زمین اور تعداد میں روحانی غزنوی (۸۷) نے اپنا اہم "سوگند نامہ" بعد میں لکھا تھا جس پر ہم تاریخ بہرام شاہی میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ سید حسن کے اس "سوگند نامہ" کے شروع کے اشعار (۵ بعد) میں وہ زمانہ یاد کیا گیا ہے جبکہ شاعر اپنے ممدوح کے ساتھ ہندوستان سے کامران و شادمان واپس کیا گیا تھا اور آخر کے اشعار میں شاعر اپنی اس شرم کا ذکر کرتا ہے جو اسے غوری تعلق کی وجہ سے پیش آئی۔

اسی "عفوِ تقصیر" کے سلسلے کا یہ قصیدہ بھی معلوم ہوتا ہے۔

برآنم کہ امروز چون داد خواہی
نہم قصہء در چنین بارگاہی
چو عیسیٰ بہ کیواں پریدم زخاکی
چو یوسفؑ بہ ایوان رسیدم زچاہی
جہاندار شاہا ز رای بلندت
بیفزود من بندہ را پایگاہی
بران داشت ادبار بی مایۂ را
کہ جوید ز نصمیم آبی و جاہی
خرد بر گزیند ز اشعار بندہ
سہ قطعہ بہ مدح چو تو پادشاہی
ولیکن بحق خدای کہ برحق
پرورد شاہی چو بہرام شاہی
من از خاندان ماندہ مظلوم و آں گہ
ہمہ مرد مان را بہ عدلت پناہی (۸۸)

اسی سلسلے کا یہ قصیدہ بھی ہے جو المعجم فی معایر اشعار العجم (صفحہ ۳۲۴) میں بھی مندرج ہے۔

زہی رفیع محلت برون زحدِ قیاس
بنای دولت و دین را قوی نہادہ اساس
کشادہ مہر تو چون ابرِ چشم ہای امید
کشیدہ کینِ تو چون برق دشنہای ہراس
مضای رای تو چون گوہرِ ظفر بنمود
خرد بدید کہ از برق چون جہد الماس
بحق گزیدہ ترا روزگار برہمہ خلق
غلط نہ کرد زہی روزگار مرد شناس
موافقان را باست نہ مالدو چہ عجب
در آسیاسی فلک سنبلہ نہ گردد آس
مدان کہ فتنہ بخسپد درین زمانہ ولیک
ز عدل تست کہ بازی شدہ ست در فرناس
عدو چو گشت فضولی حقیر تر گردد
کہ تعبیہ ست کمی در فزونیِ آماس
بزرگوارا . در بندِ قومی افتادم
کہ نقدِ رائج شان ہست محضر افلاس
نہ ناطق و ہمہ منطق فروش چون طوطی
نہ مردم و ہمہ مردم نہاد چون نسناس
سیہ سرود و زبان لیک گنگ چون خامہ
سپید کارو دو روی و ضعیف چون قرطاس

آخر کے اشعار میں وہی غوری لوگوں کی برائی بیان کی گئی ہے۔ ایک اور قصیدہ اسی سلسلہ کا معلوم ہوتا ہے۔

لبم زان پستۂ خندان شکر یافت
دلم یاقوت جان افشان گہر یافت
تر و خشکم بداد و مہربان شد
چو با من جانِ خشک و چشم تر یافت
چنین ناگاہ برجانم بجشود
مگر ازلطفِ شاہنشہ خبر یافت
خداوند جہان بہرام شہ آنک
برای خدمتش جوزا کمر یافت
برین رحمت کہ برمن بندہ فرمود
حقیقت دان کہ ملکِ بحر و بر یافت (۸۹)

پھر چند قصیدے ایسے ملتے ہیں جو خاص خاص موقع پر لکھے گئے ہیں ان کا مختصر تذکرہ غیر موزوں نہ ہوگا۔ ایک مرتبہ بہرام شاہ کے پاؤں میں درد تھا۔ تو شاعر نے حسنِ تعلیل سے یہ حسن پیدا کیا۔

چون دلم درخدمتِ آن سرو گلنار ایستد
دیدہ در نظّارۂ آن لعلِ دُربار ایستد
روز شادی بہ نشینی خود کند ہر دشمنی
دوست آن باشد بہ جانان وقت تیمار ایستد
کار مردان بابت ہر نو عروسی کی بود
این چنین شاہِ نکو عہدِ نکو کار ایستد
گوہرِ کانِ خداوندی ملک بہرام شاہ
آن کہ ہر لفظش بجای دُرِّ شہوار ایستد
دردِپایش راکہ زائل باد عذر انیست و بس
کان خداوند ازبرای خلق بسیار ایستد (۹۰)

ایک رباعی (دوبیتی) بھی اسی کے حسب حال ہے۔

اے جانِ جہانیان باری تو فدا
شکر ایزد راکہ یافتی از درد شفا
ناید ز طبیب ہیچ حاجت ورنہ
تعجیل تری بود نزول عیسیٰ

ایک مرتبہ بہرام شاہ نے شیر کا شکار کیا۔ اور بیک وقت پانچ شیر مار گرائے اس شکار کا ذکر آتا ہے۔

ناگاہ چو بشنید شہنشہ خبرِ شیر
فرمود کہ تازید سبک بر اثرِ شیر
چندان کہ خبر گشت یقین شاہ زمرکب
بر پیل شدو کرد چو شاہان خطرِ شیر
خود شاہ درین بود کہ از لشکر منصور
آوازہ در افتاد کہ اینک اثرِ شیر
گر شیر بہ چنگال ہمی جست پیِ پیل
گہ پیل بہ خرطوم ہمی کوفت سرِ شیر
چون نشترِ فصّاد گہی باز و گہی نیش
در کرد فرانچۂ پُر نیشترِ شیر
کوشید چو بیلک زدلش نیش بگذشت
تاریک شد آن دیدہ خیرہ نگرِ شیر
تا پنج عدد شیر نیفگند شہنشہ
نامد بہ سوی خوابگہ از آب خورِ شیر (۹۱)

ایک اور دوبیتی ملتی ہے جو اس واقعہ کے مطابق ہے

ای شاہا تو شیری فگندی گہ گہ
اقبال ہمی کرد پیاپی خہ خہ

باخصمان شرط کن بہ روزی زہ زہ
از شیران پنج پنج از ایشان دہ دہ

پھر بہرام شاہ کے تین بیٹے یعنی مسعود شاہ' خسرو شاد اور شاہنشاہ جو غزنین میں تھے ان کی مدح میں بھی قصیدے ملتے ہیں۔ اختصار کے ساتھ ان کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ مسعود شاہ کی مدح میں ایک قصیدہ ہے۔

این چہ نقش ست کہ از مشکِ سیاہ آوردی
وین چہ نقص ست کہ در گوشۂ ماہ آوردی

عہد ہمچون گل ترسال بہ سال آوردی
باز ہمچون مہ نو ماہ بہ ماہ آوردی
من نہ گفتم کہ چنان زلف سیہ گر باشد
آن کہ از طرف دو عارض دو گواہ آوردی
شاہ مسعود شہ آن شہ چو دین رویش دید
ملک راگفت نکو پشت و پناہ آوردی
اینت برجیس کہ براوج سعادت بردی
وینت حورشید کہ بر ظلّ الہ آوردی
بخت می داند کز بہرِ عروسِ دولت
بس جواں بخت بکار آمدہ شاہ آوردی (۹۲)

خسرو شاہ کی مدح میں کئی قصیدے ہیں۔ ایک قصیدہ عمادی غزنوی کے جواب میں ہے

ای یافتہ از چہرۂ تو حسن کمالی
دادہ ست جمالیت خدا وہ چہ جمالی
اقبال مرا گوید کای نادان ہی ہی
در دولت خسرو تو و محتاج سوالی

خسرو شہ بہرام شہ آن شاہِ جوان بخت
کایّام نیاورد چنو نیک خصالی
شاہا ز حسن بشنو حرفے کہ عجب نیست
کان شکر خدایست تبارک و تعالی
از لفظ متیں معنی عذبم چو بخندد
گوئی کہ جہد بیرون از سنگ زلالی
زنہار چو وطواط و عمادیم مپندار
کافسوس بود عیسیٰ با خر بجوالی
خود حکم تو کن این بہ باشعر عمادی
کای برسمنِ از مشک بعمدا ز دہ خالی (۹۴)

ایک قصیدہ خسرو شاہ کی صحت یابی کے متعلق ملتا ہے۔

اے بخت بدہ مژدہ کہ برخاست بہ یک بار
از گوہرِ شمشیر خداوندی زنگار
ای خلق بنازید کہ بار دگر آمد
فرخندہ نہالِ چمنِ دولت پُربار
دل شاد بخندید کہ از مطلعِ امید
بنمودِ ہلالِ فلکِ شاہی دیدار
شکر از تو خدایا کہ ازین جای مبارک
شد مردمکِ چشم جہان داری بیدار
آرام دل و روشنیِ چشمِ شہنشاہ
خسرو شہ فرخندہ کہ پاداش فلک بار
از رنج برون آمد المنۃ للّٰہ
چونان کہ دُر از آب و زر از کان و گل از خار

شاہا ز گلِ باغِ جلالِ تو کہ بشگفت
شد آتش نیلو فری از عطر چو گلزار
از یمن رضای تو شفایافت و گرنہ
عیسیٰؑ بہ زمین آمدی از چرخ برین کار
از بہر شفای تنِ او ثور و حمل را
ہم نام تو چون کردی از خنجر خون خوار
بر پوستِ سبز فلک از کلکِ عطارد
تعویذ بہشتی بر او گنبد دوّار
شاہا ہمہ این در دلم آید کہ چہ باشد
کز بندۂ خود یاد کند شاہ جہاندار
پرسد کہ مرا چاکر کی بود شکر پاش
گوید کہ مرا بندہ یکی بود گہر بار
خود رہ در سایہ مہر زان کہ رو انیست
تاذات چو خورشید تو بارم بہ دہد بار
آن را کہ ہمی بردی از خاک بہ افلاک
چون ابر میانِ رہِ رحمت کن و بگذار
بر صورت میمونِ تو آن دل کہ سبک شد
از روشنیِ دیدہ کنون ہست گران بار (۹۴)

آخر کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی زمانہ ہوگا جبکہ بہرام شاہ ہمارے شاعر سے ناراض تھا۔ یعنی وہی سوری کی معیت کی وجہ سے۔ اس ممدوح کے متعلق اور بھی کلام ملتا ہے۔ لیکن اب ہم اس کے چھوٹے بھائی معین الدولہ شاہنشاہ کی مدح کا قصیدہ پیش کرتے ہیں جس میں بہرام شاہ کی مدح بھی ہے اور غزنین کی مرفہ ّحالی کا تذکرہ بھی ہے۔

خدای داند و بس تا چه خرّم ست جهان
برین نظام جهان را کسی نداد نشان
رعیّت ست مرفّه زمانه شد ساکن
به آرزو که چنان خواست این چنین نتوان
ابو المظفرِ بهرام شاه بن مسعود
که هست نامش بر نامهٔ ظفر عنوان
نظر کن از درِ گنبد به خشک رود که باز
نگار خانهٔ مانی شده ست آبادان
میانِ هر دو سه گام ست عشرت آبادی
چنان که گوئی دل را دل ست و جان را جان
ز دل کشایِ چون باغ لیک روزِ بهار
ز زر فشانیِ چون شاخ لیک وقت خزان
ز نورِ شمسهٔ او شمس کرده دریوزه
در آستانهٔ او آسمان شده حیران
اگر نه غزنین دریاست چون کزو برخاست
پر از عجائبِ دریا هزار فتنهٔ خان
معزِ دولت و دین و معینِ ملت و ملک
که هست نور دل و چشم سایهٔ یزدان
ابو الملوک خداوند زاده شاهنشه
که شد به دولتش آراسته زمین و زمان
ز نورِ رایش یک ذرّه قبهٔ خورشید
ز بحر طبعش یک قطره چشمهٔ حیوان
بزرگوارا، شاها، ز حضرتِ شاهی
به کوشک رفتی با رای پیر و بخت جوان

چو آبِ صافی ز ابرو چو بادِ خوش زیمن

چو درّ ناب زبحر و چو زرّ پاک ازکان

اگر تفاوت هرگز فتاد ذات ترا

ز محض تربیتِ شاه و حرمتِ خود دان

اگرچه نور ز خورشید یافت شش سیّار

نه هر یکی را بر چرخ دیگر ست مکان

هزار سال اگر بر درخت باشد شاخ

جدا نه کرده بگردد نهال دربستان

نه دوریِ به کمال و نه نیز نزدیکی

که هر دو چون به نهایت رسد شود یکسان

نه بنی آن که دو دیده نه بیند ابرو را

اگرچه بیند هفت آسمان و چار ارکان

هلال وار چو کردی ز چرخ ملک طلوع

شود هر آئینه بدری مسلّم از نقصان

همیشه تاکه بود اوج شمس در جوزا

هماره تاکه بود خانۂ قمر سرطان

خدایگانِ سلاطین چو شمس قاهر باد

تو چون قمر شده از نوررای او تابان

رضای او به همه وقت مر ترا حاصل

که او به از دو جهان وزهر چه هست دران (۹۵)

اشعار کی اتنی زیادہ تعداد اس لئے دی گئی ہے کہ یہ معلوم ہو سکے کہ بہرام شاہ کا چھوٹا بیٹا شاہنشاہ کسی اختلاف کی وجہ سے (شعر ۱۴) غزنین سے (۱۲، ۱۷، ۱۸) کسی کوشک کی طرف

چلا گیا تھا لیکن اس کی یہ دوری (۱۴، ۱۵، ۱۶، ۲۲) ایسی نہیں ہے کہ وہ اپنے والد کے فیض سے محروم رہ سکے۔ اس کے بعد ہمارا شاعر ابو علی حسن ابن احمد بن حسین کے بیٹے ابوالحسن حسین المخاطب بہ "نجیب الملک" کی مدح کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس کے نام، کنیت، خطاب اور عہدے کے متعلق اشعار پیش کرنے سے پہلے ایک قطعہ نقل کیا جاتا ہے۔

گرچہ گردد برای ماہ افلاک
ورچہ باشد بہ کامِ ما ارکان
ہیچ بزمی چنان بود خرم
ہیچ طبعی چنان بود شادان
کہ دم روزِ عید مارا بود
نزدِ صدرِ زمین و زینِ زمان
حسن احمد آن جوادِ کریم
آن قضا قدرت و قدر امکان
کامِ دل یافتیم در شوال
کین ہمی خواستیم در رمضان
اسپ عشرت کشیدہ اندر زین
گوی رامش فگندہ در میدان
یا رب آن دل کشای بزم چہ بود
کہ ہمی طیرہ گشت زہرہ ازان
از چنان مجلسی بیفتادم
ہمچو آدمؑ ز روضۂ رضوان
ابرِ احسان چو خواست گشت مطہر
من سرگشتہ از میانِ جہان

نیم شب چون در آمدم از خواب
نیک رنجور گشتم و حیران
تا درین بودم آمد آوازی
کہ سبق برد از ہمہ قرآن
غافل از آن کہ صاحبِ مکرم
کرد مسعود مر مرا احسان
کامِ انعامِ عام زان کہ نہ کرد
نام تو در جریدۂ نسیان
دل من غاب خواب بیہودہ ست
بر گرفتہ ست آفتِ حرمان
ای خداوند من نجیب الدین
این سخن را پدید کن برہان
خبری کان ازو نہ بس عجب است
جہد کن تا رسد بہ تو بہ عیان
تا بود اوجِ شمس در جوزا
تا بود خانۂ قمر سرطان
باد ہموار یاورش گردون
باد پیوستہ ناصرش گردان (۹۶)

میرا خیال ہے کہ شروع کے اشعار میں شاعر وہ زمانہ یاد کر رہا ہے جبکہ ابو علی حسن ابن احمد وزیر مقرر ہوا تھا۔ یعنی شوال ۵۴۱ھ (مطابق مارچ ۱۱۴۷ء) جیسا کہ ہم اس کے تقرر کا زمانہ لکھ چکے ہیں۔ آٹھویں شعر میں اپنی اس محرومی کو شاعر بیان کر رہا ہے جو سوری کی معیت کی وجہ سے در پیش ہوئی تھی۔ پندرہویں شعر سے اس کے لڑکے نجیب الدین کی مدح شروع

ہوتی ہے۔ غالباً اسی ابو علی حسن کے انتقال پر شاعر نے یہ مرثیہ لکھا ہو گا۔

ای بی خبر ز نیک و بدِ کشتِ روزگار
از خوابِ غفلت آخر یک بار سر برار
بر ساحلِ رحیلی برگ سفر بساز
در منزل سپنجی تخم امل مکار
زین دیو خانہ چون شرف الملک درگذر
تا جانِ خود فرشتہ کند بر سرت نثار
اے دیدۂ بتولؑ بگریید ہای ہای
وے عترت رسولؐ بنالید زار زار
واللہ کہ ماتم شرف الملک ابو علی
از ماتم حسینؑ علیؑ ہست یادگار
آب ارزسنگ یابد ہموارہ رہ گذر
گل گر ز چوب گردد پیوستہ آشکار
آبِ حیات شرع و گلِ بوستانِ ملک
در سنگ و چوب از چہ نہان شد بہ نوبہار
خود در کنارِ خاک چگونہ ست حال تو
ای سعز آسمانت بہ پرورده در کنار
دردا و حسرتا کہ جگر گوشگانِ تو
ہستند سوختہ دل ازین چرخ کامگار
خشنود باد جانت از ایشان کہ از تو خود
بودہ ست و ہست و باشد خشنود کردگار (۹۷)

یہاں "ابو علی" یہی ابو علی حسن معلوم ہوتا ہے جس کا ماتم غزنین میں بہت

ہوا۔اسی لئے کہا گیا ہے کہ ع از ماتم حسین، علی ہست یادگار۔ "جگر گوشگانِ تو" سے مراد اس کے لڑکے حسین وغیرہ ہوں گے۔ لیکن افسوس کہ حسین کے دوسرے بھائیوں کا حال معلوم نہیں ہے۔اگر ساتویں شعر کا آخری لفظ "نو بہار" ہی ہے (گو کہ رامپور کے نسخے میں بزنہار" ہے) تو وہ زمانہ ۵۴۴ھ کے پہلے کا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ ابو علی حسن جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اس سال کے محرم تک ضرور زندہ تھا' اب ہم اس فرزند یعنی ابوالحسن حسین ابن حسن ابن احمد کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ایک ترجیع بند میں اس کا نام و نسب صاف طور پر آیا ہے۔

فرزانہ حسینِ[1] حسنِ[2] احمدِ[3] خاصہ
آن کرد خدایش ز ہمہ خلق خلاصہ
فرخندہ جمالت کہ گلِ دولت و دین ست
باغِ نظر منتخب الملک حسن باد (۹۸)

اس ممدوح کی مدح میں اکثر ترجیع بند ہی ہیں۔اس کا خطاب نجیب الدین اور نجیب الملک کئی جگہ ملتا ہے۔ہم صرف ضروری اشعار نقل کرتے ہیں۔

روزی نگر کہ طوطیِ جانم سوی لب است
از بہر پستہ آمد و در شکر اوفتاد
این ہم بدان سبب کہ ز کلکِ نجیب دین
گرچہ شبہ نمود ہمہ گوہر اوفتادہ
آنکلک کیست' کلک حسینِ حسن کہ ہست
از جامِ جودِ او دل و جانِ امید ہست (۹۹)

نجیب الملک دوسرے ترجیع بند میں ملتا ہے۔

صفتِ گلستانِ رخسارت
چون کند بلبل زبان گشتہ

از تو تا دولت نجیب الملک
چرخِ کہنہ ز سر جوان گشتہ
خاصہٴ شاہ و خواجہ زادہٴ من
گل باغ ہنر حسینِ حسن (۱۰۰)

اس کی کنیت "ابوالحسن" ایک دوسرے ترجیع بند میں ہے۔

دوست کامی کہ در آفاق چنونست منم
زان کہ پروردہٴ مخدومِ زمان بو الحسنم
آن بحق خواجہ و مخدوم و ولی نعمت من
آرزوی دل و اقبال حسین ابن حسن (۱۰۱)

اسی ترجیع بند میں اسے "تاج الدولہ" بھی کہا ہے۔

دولتش بادا ہمرہ کہ تاج الدولہ
ناگہانیش بہ عموی سفر آہنگ افتاد
آن بحق خواجہ و مخدوم و ولی نعمت من
آرزوی دل و اقبال حسین ابن حسن

دوسرا ترجیع بند جو اوپر مذکور ہوا ہے اسی حسین ابن حسن کی (وزارت کی) تہنیت میں ہے اور اس سے اس کی تاریخ بھی معلوم ہو سکتی ہے۔

ای ماہ در ہوای تو جانم بہ لب رسید
اے مہر از فراق تو روزم بہ شب رسید
بگذار نامِ ہجر کہ ہنگامِ غم گذشت
وردہ شرابِ وصل کہ وقتِ طرب رسید
در شو بہ تہنیت کہ درین موسمِ شریف
جشنِ عجم مقارنِ عیدِ عرب رسید

پیش آی پیش صدرِ عرب خواجۂ عجم
کش این دو اصل ہم عجم و ہم عرب رسید
آن اصل کیست اصل حسینِ حسن کہ ہست
از جامِ جودِ او دل و جانِ امید ہست (۱۰۲)

وہ زمانہ "جشن عجم" اور "مقارن عید عرب" کا ہو گا۔ یعنی ۵۴۴ھ۔ ۱۱۵۰ء کی "عید نو روز" اور عید الضحیٰ کے قریب کا ہو گا۔ کیونکہ اس عہد میں یہی دو عیدیں پڑ سکتی تھیں اور پھر ہمارا شاعر ۵۴۵ھ۔ ۱۱۵۱ء میں عازم بیت اللہ ہو جاتا ہے۔ گو کہ یہ بھی ممکن ہے کہ موخرالذکر سال میں یہ ترجیع بند لکھا ہو کیونکہ اس سال کے محرم میں تو کم از کم اس وزیر کا باپ حسن ابنِ احمد ہی وزیر تھا۔ اسی "نوروز" اور عید کے زمانہ میں اوپر کا پہلا ترجیع بند بھی کہا ہو گا۔

معذور ہمی دار چو عید آمد و نوروز
گر بار گرانی بر تو پیشتر آریم
عیدی بر تو از لب دریای بزرگی
گر قیمتِ آن دانی عقدِ گہر آریم
فرزانہ حسین حسن احمد خاصہ
آن کردہ خدایش ز ہمہ خلق خلاصہ

لیکن اس ترجیع بند کا ایک شعر (آخر بند میں) ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا باپ منتخب الملک حسن اس وقت زندہ تھا۔

فرخندہ جمالت کہ گلِ دولت و دین است
باغ نظرِ منتخب الملکِ حسن باد (۱۰۳)

یہی وہ زمانہ تھا جبکہ سید حسن اپنے وطن غزنین میں وعظ و نصیحت کرنے میں مشغول تھا۔ متعدد تذکروں میں یہ بیان ملتا ہے۔ چنانچہ دولت شاہ (ص ۱۰۴۔ براؤن) ریاض الشعرا (ق ۹۶۔ الف۔ امپریل لائبریری۔ کلکتہ) مخزن الغرائب (جلد اول حبیب گنج) تذکرہ

حسین دوست (ق ۶۳-الف حبیب گنج) مرآۃ الخیال (ص ۴۵-۱۸۳۱ء) عرفات العاشقین (ق ۴ب- حبیب گنج) صحفِ ابراہیم (ق ۲۲۰-ب- بانکی پور) آتشکدہ آذر (ص ۹۱-۱۲۷۷ء) مجمع الفصحا (ص ۱۹۲- جلد اول) ریاض العارفین (ص ۱۸۵ طہران ۱۳۰۵) یدِ بیضا (ص ۴۸- دفتر دیوانی و مال حیدر آباد) وغیرہ تذکروں میں ہے کہ سید حسن جب وعظ کہتا تھا تو غزنین کے "ہفتاد ہزار" لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ آتشکدہ (ص ۹) میں ہے کہ ان میں سے چار ہزار اس کے مرید ہو چکے تھے لیکن میرا خیال ہے کہ ہفتاد ہزار سے یہ معنی نہیں نکلتے کہ اتنی تعداد میں حاضر ہوتے تھے بلکہ زیادہ سے زیادہ تعداد کے لئے استعارۃً ایسا کہا گیا ہے۔ بہر حال یہ تعداد ایسی تھی کہ سلطان بہرام شاہ کی نظر میں کھٹکی اور شاعر کی بڑھتی ہوئی طاقت دیکھ کر ہراساں ہوا چنانچہ اس نے "دو شمشیر یک غلاف بہ پیش وی فرستاد یعنی جای دو سلطان در یک شہر ممتنع است۔ سید مطلب را دریافت و روانہ حجاز گردید (۱۰۴)

میرا خیال ہے کہ اسی موقع پر سید حسن نے یہ طویل قصیدہ فخریہ کہا ہوگا۔ جو لباب الالباب (۲: ۱۷۱-۲۷۶) میں بھی ہے۔ اور جس کا نام بقول صاحب مونس الاحرار (ص ۶۰۵ حبیب گنج) "صفیر الضمیر" ہے (۱۰۵)

داند جہان کہ قرۃِ عینِ پیمبرم
شائستہ میوۂ دلِ زہرا و حیدرم
دریا چو ابر بار دگر آب شد ز شرم
چون گشت روشنش کہ چہ پاکیزہ گوہرم
دُرّی پُر از عجائب دریا شود ز حکم
ہر قطرۂ کہ در صدف جان بہ پرورم
طبعم چو آتش تر و ہر دم خلیل وار
ہر خوش گلی دگر دمد از آتشِ ترم

سہل ست اگر بہ حظر من بنگری از آنک
منظورِ عالمِ ملکوت است حظرم
گل بلبلی گزیند در باغ سیرتم
مہ اختری پسندد درپیش اخترم
دارم زبانِ و ژاژ نہ خائم کہ سوسنم
بینم بہ چشم و عشق نہ بازم کہ عبہرم
بی نقش ہمچو آینہ آبی منقشم
بی عطر چون ملائکہ جانی معطرّم
زان تا لبی سپید کند ہر سیہ زبان
در دا کہ چون زبانِ قلم گشت دفترم
زین آب گون قفس کہ شب و روز می پرد
چون عمّ خویش جعفرؓ طیار بر پرم
با این شرف زغصۂ طفلانِ روزگار
خونا بہ چون جنین دہنِ بستہ می خورم
چون سرو پاک دامن خواہم ہزار دست
تا از درون چو غنچہ گریبان دل درم
چون سر فگندہ گریم گوئی صراحیم
چون خون گرفتہ خندم گوئی کہ ساغرم
تاثیر جذبہ رای عروسانِ قدس را
در دل کہ ہست آئینۂ غیب بنگرم
از روی آن کہ روی دلم سوی ہزل نیست
من درگنہ ز توبہ بسی بی گنہ ترم

گفتی دریغ رنجِ حسن هم گزاف نیست
آخر به بوی و رنگی این رنج می برم
استغفر الله ار به مثل زلتی کشم
الحمد لللہ از سر آن زود بگذرم
در خواب کم شود دلِ آگاهِ من ازانک
بیدار کردۂ نفسِ صبح محشرم
احوال خویش اگرچه بگفتم یکان یکان
سوگندی خورم که نه دارند باورم
ناوردۂ به شعر چو من در هزار سال
اینک تو ایدری فلکا و من ایدرم
در عهدِ من هر، آن که کند دعویِ سخن
خصمش خدای گر بنشیند برابرم
بر خلق داوری نه کنم بهرِ نظم و نثر
ایرا که من نه خواسته داد است داورم
مردانگیِ باز و جوانمردیِ خروس
خرسندیِ هما و وفای کبوترم
منت خدای راکه نیفگند دست حرص
اندر نشیب وقف نه بالائے منبرم
سردیِ زرق و خشکیِ سالوس چون نه بود
حاجت نیوفتاد به زهد مزوّرم
نثر دروغ بر چو منی افترا کنند
کز نظم راست گرد ز دریا بر آورم

از باطل زمانه کیم سایه برفتد
کاندر پناهِ سایۂ حق بو المظفرم
سلطان یمین دولت بہرام شاہ شاہ
کا قبال او گرفت بہ انصاف در برم
در آرزوی آرزو اندر نیا مدہ است
آنہا کہ شد بہ قوت جودش میسرم
ای کاش کی پذیرد و کاریش آمدی
تا جان نہادہ بر طبقی پیشِ او برم
گوید چنو بہ شکر و خود او را سزد کہ ہست
از آسمان سریر و ز خورشید افسرم
بوسید تاج و تخت سر و پای من ازانک
چون تخت پایہ دارم و چون تاج سرورم
جز خیر ناید ازمن و گر نیستی چنین
در ملک و دین خدای نہ کردی مخیّرم
قصدی ٗ ہمی کنند زکوتاہ دیدگی
تادر حسن بہ چشم کرم بیش ننگرم
گرہست بندۂ کہ بگوید جواب این
پذرفتم از خدای کہ او را پرورم

ان اشعار میں خاندانی فخر اور شاعرانہ تعلّی کے علاوہ آخر میں بہرام شاہ کی زبانی یہ کہلایا گیا ہے کہ اگر کوئی دوسرا شاعر اس جیسا کلام کہے تو بادشاہ اسی کی تربیت (۳۵) کرے گا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ (۱۱، ۲۴، ۲۶، ۳۴) شاعر کے حاسد غمازی کرتے ہیں لیکن محض حرص وہوس کی بنا پر شاعری کر کے پیٹ نہیں بھرتا بلکہ حقیقت میں اس کا ذوق ایسا

بلند ہے کہ کوئی اس کا نظیر نہیں ہے اور وہ تمام زرق وریا سے پاک ہے' اتنے جوش و خروش سے کہنے کے باوجود شاعر شاید دیر تک بہرام شاہ سے مستفیض نہ ہو سکا۔ اس لئے وہ اب حجاز کے لئے روانہ ہوتا ہے اور جیسا کہ برٹش میوزیم والے دیوان نمبر ۱۵۱۴ ق ۱۲۲ ب سے معوم ہوتا ہے کہ اس نے یہ قصیدہ "در بادیہ گفتہ بود"

جان می برد بہ عشرتِ حورانِ گلشنم
دل می کشد بہ خدمتِ دیوان گلخنم
عیسیٰ ست جانِ پاک و خرست این تن پلید
بی کار خرہمی ہمہ بر عیسیٰ افگنم
تن دیو و جان فرشتہ و من کفشِ دیوِ شوم
بر تارکِ فرشتہ میمون ہمی زنم
در حلقِ جان زبس کہ فگندم طنابِ تن
شد جانِ دوست* روی چو تن نیز دشمنم
ترسم زننگِ صحبتِ زاغ سیاہ تن
بازِ سپید جان پرد زین نشیمنم
برپای عقل بندِ گران است این سرم
در حبسِ چرخ کور روان ست این تنم
شاد از چہ ام ازین کہ درین غمکدہ یکیست
درمان و درد و نیک و بد و سور و شیونم
از تنگِ آب و دانہ چو سیمرغ فارغم
بی بیک مہر و ماہ جو فردوس روشنم
از نفخ صور ہم نہ بمیرد چراغِ من
کز زیتھا یعنی چکیدہ ست روغنم

آن آتشی کہ باغِ ارم گشت بر خلیلؑ
جست از دل چو سنگ و زبانِ چو آہنم
آن حرمتم مبین کہ چو خورشید سرورم
این خدمتم نگر کہ چو سایہ فروتنم
ہستم چہار میخ درین خانہ دو در
پر ہا زنم چو باز کشایند روزنم
تازین سکون و زان حرکت ہم نہ بگذرم
ناید پدید کنگرۂ قصرِ مسکنم
یک روزی گذشتم دامن کشان زچرخ
آلودہ شد بہ چشمۂ خورشید دامنم
ہم باکمند عقلم و ہم بالگامِ شرع
تا کرۂ سپہر نہ گوید کہ توسنم
سنگ سخن بلند بر انداختم ازانک
تا آبگینہ خانۂ افلاک بشکنم
دردِ سرم مباد کہ بر بایدم گلی
باید ز مہ گلاب وز خورشید چندنم
گر منکری بیاید و گوید کہ نگردم
تا دعوی رسول نہ گردد مبرہنم
از بعد پانصد و چہل و پنج گوبیا
درمن نگر کہ معجزہ جدؐ خود منم

اس قصیدے میں بھی وہی فخر اور جوش ہے۔ اور آخر میں پھر اپنے خاندانی اور نسلی اعزاز و افتخار کو زور دار لہجہ میں یاد کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں قصیدے

قریب عہد کے ہیں' اور چوں کہ یہ دوسرا قصیدہ ۵۴۵ھ۔۱۱۵۰ء کا ہے (اور حج کی) بادیہ پیمائی کے دوران میں (بغیر ممدوح کی مدح کے کہا گیا ہے) اس لئے ظاہر ہے کہ پہلا قصیدہ شاعر کی غزنین سے روانگی کے وقت کا ہوگا۔ اور وہیں کہا گیا ہوگا' کیونکہ بہرام شاہ کی مدح بھی اس میں ہے۔ اس قصیدے کے پہلے شعر میں شاعر نے ع جان می برد بہ عشرت حورانِ گلشنم سے حجازہی کا استعارہ کیا ہے اور وہ اس حجازی تعلق کو خصوصاً آخر کے دو شعروں میں زیادہ زوردار لہجہ میں پیش کرتا ہے اور اس محبت کی شراب میں سرشار ہو کر تمام دنیوی خواہشات سے بے نیاز نظر آتا ہے۔ اسی حجازی عقیدت کا پُرجوش مظاہرہ آگے آنے والے ترجیع بند میں بھی ہے۔

حج کے لئے روانگی

غرض کہ سید حسن ۵۴۵ھ۔۱۱۵۰ء میں عازم حج ہوتا ہے۔ اور وہ زمانہ اس سال کے وسط تک ہوگا۔ کیونکہ ہم تاریخِ بہرام شاہی میں لکھ چکے ہیں کہ اس سال کے آخر میں علاءالدین "جہان سوز" غوری نے غزنین کو تباہ کیا تھا اور چونکہ شاعر کی روانگی کے وقت کا قصیدہ جو اوپر مذکور ہوا بہرام شاہ کی مدح میں ہے اس لئے ظاہر ہے کہ بہرام شاہ اس وقت تک حکمران تھا اور غزنین تباہ نہ ہوا تھا۔ بہر حال شاعر اس زمانے میں سفر کی صعوبتوں (۱۰۶) کے باوجود مکہ معظمہ حج کے لئے پہنچتا ہے اور اغلب ہے کہ اسی سال ۹ ذی الحجہ ۵۴۵ھ (پنج شنبہ ۲۹ مارچ ۱۱۵۱ء) میں حج ادا کیا ہوگا کیونکہ بعد میں وہ مدینہ طیبہ اور غالباً بیت المقدس بھی پہنچتا ہے اور ایسے دشوار گذار اور طویل سفر کے بعد سلطان مسعود سلجوقی (المتوفی ۵۴۷ھ۔۱۱۵۲ء) کے دربار سے مستفیض بھی ہوتا ہے جس کا تذکرہ آگے آئے گا۔

حج کر کے شاعر مدینہ طیبہ پہنچتا ہے اور چونکہ اس نے ۵۴۵ھ۔۱۱۵۱ء سے پہلے حج نہ کیا ہوگا اس لئے ظاہر ہے کہ وہاں ۵۴۶ھ۔۱۱۵۱ء سے پہلے نہ پہنچا ہوگا۔ وہاں پہنچ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں یہ ترجیع بند پیش کرتا ہے۔ جو اپنی آپ نظیر ہے:

یا رب این مائیم و این صدرِ رفیعِ مصطفاست
یا رب این مائیم و این فرقِ عزیزِ مجتباست
یا رب این مائیم و این روی زمینِ یثرب است
کآسمان راهفت پشت از رشک یک رویش دو تاست
خواب گاهِ مصطفیؐ و کعبه مان از پیش و پس
بارگاه و منبرِ کنانه مان از چپ و راست
یا رب این راحت که مادیدیم در دنیا که دید
یا رب این دولت که ما داریم در عالم که راست
یارب این روضه ست واین گلهای رنگین زان دوست
یا رب این مائیم و این دلهای سنگین زان ماست
در دلِ سنگ آب و آتش زین طرب رقّاص گشت
ای دل ارسنگی پس آخر آتش و آبت کجاست
سرفراز ای مردمِ دیده کزین هر ذرّهٔ
سرمهٔ خاک کفِ پایِ نبی الانبیاست
سلموا یا قوم بل صلوا علی الصدر الا مین
مصطفی ماجآء الاّ رحمة للعالمین (۱۰۷)
منت ایزد را بدین گردونِ اعلا آمدیم
منت ایزد را بدین درگاه والا آمدیم
اشک باران با دلی پرُ آتش و چشمی پرُ آب
همچو ابرِ تیره از پستی به بالا آمدیم
لب به مدحت برکشاده چون عطارد تافتیم
جان به خدمت برمیان بسته چو جوزا آمدیم

در بسی بینیم چون براوج گردون بر شدیم
در بسی چینیم چون در موجِ دریا آمدیم
از رخِ خوبان گل افشانہا کند روح الا مین
بر سرِ ما چون بدین روضہ تماشا آمدیم
صاحب لو انہم جاؤک مارا بار داد
تا نہ پنداری کہ بی دستور این جا آمدیم
ذرّۂ بودیم زیرِ سایۂ پنہاں شدہ
آفتابِ دین چو بر ما تافت پیدا آمدیم
سلموا یا قوم بل صلوا علی الصدر الا مین
مصطفی ماجآء الأ رحمة للعالمین

سات سات اشعار کے یہ سات بند اسی جوشِ عقیدت اور والہانہ انداز میں ہیں چھٹے بند میں شاعر کہتا ہے۔

ابرِ رحمت مہترا ! زان دست چون جیحون فرست
تشنگان را شربتی گر ممکن ست اکنون فرست
گر کشائی چشمۂ زان چشمۂ پُر نم کشای
ور، فرستی نافۂ زان نافۂ پُر خون فرست
قصۂ این خاکپایان را بخوان دستی بر آر
چون پسندیدی بنزدِ خالقِ بیچون فرست
ہر دعا کین جمع کرد و ہر ثنا کین بندہ گفت
بر زمین مگذار، یک یک را سوی گردون فرست
لافِ فرزندی نیارم زد درین حضرت و لیک
مدحتی آوردم اینک خلعتی بیرون فرست

سیم و زر قدری نہ دارد، ئیستم دربندِ آن
از قبول خویش زنجیری بدین مجنون فرست
یا رسول اللہ سزواری • کہ گویم ای خدا
بر رسول اللہ درود داز ہر چہ است افزون فرست
سلّموا یا قوم بل صلوا علی الصدر الا مین
مصطفی ماجآء الاّ رحمۃ للعالمین(۱۰۸)

تاریخ گزیدہ(۱۰۹) (حبیب گنج)اور پھر تذکرہ دولتشاہ(ص۔۱۰۵)وغیرہ میں ہے کہ "چون بدین بیت رسید، شعر: لاف فرزندی نیارم زد...... خلعتی بیرون فرست، دستے از قبہّ بیرون(۱۱۰) آمد باحلہ ّ وگفت یابنی خذ"لیکن مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے خزانۂ عامرہ (ص۱۷۹۔نول کشور۔۱۹۰۰ء) میں لکھا ہے۔"لیکن اگراین چنین سانحۂ جلیلہ بہ عالم وقوع می آمد ایستادہ ہای بارگاہِ نبوت کہ سوانح کلی وجزوی آستانِ معلّی را بہ ضبطِ کتابت می آرند البتۃ آن را بہ قلم می آوردند ودر کتبِ سیر مبارک ثبت می کردند، بعضی مردم نقل کردہ اند کہ خدام روضۂ منورّہ خلعتی برای او حاضر ساختند، این راباور توان کرد......" مولانا آزاد نے "بعضے مردم" کا حوالہ اور نام نہیں دیا اور ہم کو بھی کوئی ایسا تذکرہ نہیں ملا۔بہر حال شاعر نے انتہائی خلوص کے ساتھ یہ ترجیع بند پڑھا ہوگا۔اور وہیں (یعنی مدینہ منوّرہ) یہ قصیدہ بھی لکھا ہوگا(گو کہ راحت الصدور(ص۱۹۲) میں ہے کہ "این قصیدہ از مکہ بحضرت اعلیٰ فرستاد"

ہرگز بود کہ باز ببینم لقای شاہ
شکرانہ در دو دیدہ کشم خاک پای شاہ
ہرگز بود کہ برمنِ سرگشتۂ غریب
چون روی شاہ خوب شود باز رای شاہ
ہرگز بود کہ باز بخندد چوگل دلم
در نو بہارِ بزم ز ابرِ سخای شاہ

گاهی چو سایه روی نهم بر زمینِ ملک
گاهی چو ذرّه رقص کنم در هوای شاه

فخرِ ملوک و صدرِ سلاطین که چرخ گفت
بر تختِ دولت است کلاه و قبای شاه

شاها، به کعبه رفتم دانی چرا؟ ازانک
گفتند خانه ایست معظّم چو جای شاه

لبیک ها به نامِ مبارک زدم چنانک
گنبد کنان رسید به گردون صدای شاه

موقف نه بود جز رهِ صدرِ رفیعِ ملک
زمزم نه بود جز رهِ بحرِ عطای شاه

در مروه جز مروّتِ خسرو نه یافتم
و اندر صفا نه دیدم الّا صفای شاه

بگشاد کا رها حجرالاسود و سزد
کآمد به رنگِ رایت عالم کشای شاه

گفتم که خویشتن را قربان کنم، خرد
گفت ای ضعیف هی تو نه شای فدای شاه

امروز سرکشان همه گردن نهاده اند
تاجان فدا کنند برای لقای شاه

درخانهٔ خدای و به بالین مصطفیٰ ؐ
گفتم دعای ملک و نمودم ولای شاه

اکنون عزیمتِ سفرِ قدس کرده ام
هم کرده دان به دولتِ بی منتهای شاه

پذرفتم از خدای کہ از بہرِ شاہ را
خواہم مزید دولت و عمراز خدای شاہ
برخاک ہریکی ز بزرگانِ انبیا
یک حاجتِ بزرگ بخواہم برای شاہ
گر بر فلک چو عیسیٰ برباید م شدن
ہم برشوم بہ جان و بجویم رضای شاہ
چندان کہ ملک راند برچتر آسمان
خورشید تاج ورکہ بہ زیبد گدای شاہ
بادا مرصّع از گہرِ اخترانِ سعد
چتر سپہر پیکرِ خورشید سای شاہ

اس قصیدے کے متعلق چند باتیں قابلِ غور ہیں۔

ا۔ راحت الصدور (ص ۱۹۲) میں ہے کہ یہ قصیدہ مکہ معظمہ سے شاعر نے بھیجا۔ لیکن اس انتخاب کے تیر ہویں شعر سے صاف ظاہر ہے کہ اس نے اس وقت تک مدینہ منورہ کی بھی زیارت کرلی ہے۔

۲۔ راحت الصدور (ص۔ ۱۹۲) میں سنجر کی مدح کے سلسلے میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ قصیدہ شاعر نے "بہ حضرت اعلیٰ فرستاد" یعنی سنجر کے دربار کو بھیجا۔ اور ایسا ہی پروفیسر براؤن کے ترجمہ (رائل ایشیاٹک سوسائٹی جنرل اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۸۵۶) سے ظاہر ہوتا ہے لیکن منتخب التواریخ (بدایونی ۱: ۳۹ بعد۔ کلکتہ ۱۸۶۸ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ بہرام شاہ کی مدح میں کہا گیا تھا اور اس میں مطلع کے بعد یہ دو شعر ہیں:

بہرام شہ کہ جانِ سلاطین فداش باش
باشد کہ جانِ ایشان باشد سزای شاہ
سیارگانِ چرخ در افتند چون شہاب
پای اربرون نہند زحدِّ وفای شاہ

اور یہ شعر بھی ملتا ہے:

تا ہند وپارس خطۂ او را مسلّم است
آیم بہ بوم ہند و بیارم ثنای شاہ (۱۱۱)

ان میں سے دوسرا شعر توضرور راحت الصدور (ص ۱۹۲۔ س ۱۱) میں ملتا ہے لیکن بقیہ دو شعر کسی نسخے میں نہیں ہیں۔ اس لئے خیال ہوتا ہے کہ یہ دو شعر اس نے شامل کر کے بہرام شاہ کو بھی وہ قصیدہ بھیج دیا ہوگا۔ مذکورہ بالا انتخاب میں بادشاہ کے رایت کو سیاہ کہا ہے اور انیسویں شعر میں اس کے چتر کو "سپہر پیکر" یعنی سیاہ کہا ہے (گوکہ راحت الصدور میں "سپید پیکر") اس لئے ظاہر ہے کہ یہ قصیدہ بہرام شاہ کی مدح میں بھی ہو سکتا تھا۔ کیونکہ ہم اپنے مضمون "اسلامی اور غزنوی علم" (معارف۔ مارچ تا اپریل ۴۴ء) کے سلسلے میں لکھ چکے ہیں کہ بہرام شاہ کا بھی علم اور چتر "سیاہ" تھا۔ اور سلجوقی علم کی طرح سلجوقی چتر تو سیاہ تھا ہی جیسا کہ راحت الصدور (ص ۲۴۶) میں ہے: ع ای چتر کسوتِ سیہ اکنون سپید گشت'

۳۔ چودہویں اور سولہویں شعر' سے معلوم ہوتا ہے کہ اب شاعر کا ارادہ بیت المقدس جانے کا ہے اور ممکن ہے کہ وہاں بھی گیا ہو۔ اگر واقعی وہاں بھی پہنچا ہوگا تو اسے کافی وقت لگ گیا ہوگا۔ کیونکہ ۵۴۶ھ۔ ۱۱۵۱ء کے اوائل میں تو وہ مدینہ طیبہ ہی پہنچا ہوگا۔ اور وہاں سے بیت المقدس کا طویل سفر اور وہ بھی اس زمانہ کا دشوار گذار راستہ' دیر ہی میں طے کیا گیا ہوگا۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ وہ واپسی میں بغداد اس سال کے آخر ہی تک پہنچ سکا ہوگا۔

عراق میں آمد

مذکورہ بالا قصیدہ جو بہرام شاہ کی مدح میں بھی ہے شاعر نے ۵۴۶ھ۔ ۱۱۵۱ء کے اوائل میں کہا ہوگا یعنی اس وقت تک تو کبھی کا علاء الدین "جہان سوز" غوری کا تسلط غزنین پر قائم ہو چکا ہوگا اسی لئے اس نے کہا ہے کہ 'ع آیم بہ بومِ ہند و بیارم ثنای شاہ' یعنی بہرام شاہ اس وقت ہندوستان میں ہوگا اور شاعر کو یہ واقعہ معلوم ہو گیا ہوگا۔ (۱۱۲)

بہر حال اگر شاعر بیت المقدس بھی نہ گیا ہو گا تب بھی وہ اس سال کے اواسط تک ہی بغداد پہنچ سکتا تھا۔ دولت شاہ (ص ۱۰۵) وغیرہ نے لکھا ہے کہ "چون سید حسن از حج باز گردید و مردم آن کرامت (متعلق بہ مدینہ منوّرہ) دیدند بسیار معتقد او شدند۔ در آن حین سلطان مسعود بن محمد بن ملک شاہ در دار الاسلام بغداد بودہ بروزگار الراشد خلیفہ عباسی و سلطان مسعود در اکرام و اعزاز سید مبالغہ بسیار نمودہ و تحفۂ اندودہ ترتیب کردہ سید را بطرف غزنین روان ساخت............"

سلطان ابو الفتح مسعود کے الطاف و اکرام کا یہ قصہ صحیح ہو گا لیکن یہ قول صحیح نہیں ہے کہ وہ زمانہ خلیفہ الراشد کا تھا۔ کیونکہ خلیفہ مذکور کا انتقال ۵۳۰ھ۔۱۱۳۵ء میں ہو چکا تھا اور ہمارا شاعر ۵۴۶ھ۔۱۱۵۱ء میں بعہد خلیفہ المقتفی (م ۵۵۶ھ۔ ۱۱۶۰ء) بغداد پہنچتا ہے۔ خود سلطان ابو الفتح مسعود (م ۵۴۷ھ۔ ۱۱۵۲ء) کی مدح میں ہمیں کوئی قصیدہ نہیں ملتا۔ لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ ہم تک نہ پہنچ سکا ہو۔ تاہم اس کے انتقال (یکم رجب ۵۴۷ھ۔ ۳۱/اکتوبر ۱۱۵۲ء) پر ایک "مرثیہ" بطور ترجیع بند ملتا ہے جو راحت الصدور (ص ۲۳۶) میں بھی منقول ہے اور اس طرح کہ "بحضورِ امرای دولت برخواند"۔

شاہِ جہان گذشتہ و ماہم چنین خموش
کو صد ہزار نعرہ و کو صد ہزار جوش
ای تیغ بہرِ قبضۂ مسعود خون ببار
وی کوس بہرِ رایتِ بو الفتح بر خروش
ای سلطنت چو صبح بدر جامہ تا بہ ناف
وی مملکت چو شام ببر موی تا بہ گوش
ای سکہ بی عیار بماندی در آن مپیچ
وی خطبہ از خطاب فتادی در آن مکوش
ای تیرِ آسمان کمرِ چرخ برکشای
وان ترکشِ مکوکبِ شہ باز کن ز دوش

ای تاج، عقدِ ملک چو بگسست خاک خور
وی تخت، جامِ شاہ چو بشکست زہر نوش
ای چتر، کسوتِ سیہ اکنون سپید گشت
چون تیغ شہ تو نیز کبودی طلب بدوش
شاہِ فرشتہ سیرت مسعود در گذشت
ہمچون فرشتہ از سرِ افلاک برگذشت

یہ چھ چھ اشعار کے پانچ بند ہیں۔ایک جگہ ہے۔

این طرفہ کز وفاتِ پسر شد پدر یتیم
این کز فراقِ خسرو شاہ سنجری

ایک دوسری جگہ ہے

رفتی و بہرِ شاہِ ملک شہ بہ روزِ بد
الحق ستودۂ دولت و راہی گذاشتی

یعنی مسعود کے بھتیجے ملک شاہ بن محمود بن محمد بن ملک شاہ کے متعلق تلمیح ہے اور وہی اب جانشین ہوا تھا اس لئے شاعر آخری بند میں کہتا ہے:

شاہِ جہان ملک شہِ محمود را شناس
صاحب قران ملک شہِ محمود را شناس
شاہان و خسروان ہمہ کان بودہ اند و پس
یاقوت کان ملک شہِ محمود را شناس
سلطان غیاثِ دولت و دین جانِ پاک بود
آرامِ جان ملک شہِ محمود را شناس
بیش از یقین ملک شہِ محمود راشمر
بیش از گمان ملک شہِ محمود را شناس

در ملکِ عزّو دولت و جاہِ ابد ہمی

تو جاودان ملک شہِ محمود را شناس

یعنی غیاث الدین ابوالفتح مسعود کے انتقال پر مغیث الدین ملک شاہ ابن محمود تخت نشین ہوتا ہے اور اس کے تخت نشن کرانے میں کسی معین الدین کو اپنی جان کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ اس کا مرثیہ بھی بطور ترجیع بند موجود ہے۔

ماہِ تمامِ ملک بہ زیرِ نقاب شد

آب حیاتِ شرع دریغا سراب شد

سروی زبوستانِ معانی فرونشست

برجی ز آسمانِ معالی خراب شد

کوری بکرد مردمکِ چشمِ مردمی

چون پیر پیکریست گرفتارِ خواب شد

بگری تمام ملک بسی کز فراق او

در سنگ خارہ دیدۂ آتش سراب شد

حقاً کہ برفلک دلِ روز از غمش بسوخت

واللہ کہ در ہوا جگرِ شب کباب شد

با شاہ گفتہ بود کہ جانم فدات باد

بود آن دعا بہ دل کہ یکی مستجاب شد

بر اخترانِ ملک بسی شکر واجب ست

کان مہ فدای حضرتِ این آفتاب شد

از دل معینِ دولت و دین جان بہ شاہ داد

مزد خدایگانِ بزرگان بزرگ باد

یہ سات سات شعر کے پانچ بند ہیں۔ لیکن ہم صرف ضروری اشعار یہاں نقل کرتے ہیں۔

گر کوه و سنگ و گل بمثل دیده داردی
بر تربتِ مبارکِ او خون بباردی
شاهی بنالدی و ممالک بگریدی
مردی بخوابدی و جوانی بنالدی
منت خدای راکه ملک شاه ما بیافت
آن آرزو که در دلِ اسکندر اوفتاد
پای امیر اگر فلک از جای خویش برد
چون شاه عالمش خضری برسر اوفتاد

آخری بند یہ ہے:

دایم علاء دولت و دین کامگار باد
عمرِ درازِ او، مددِ روزگار باد
گر سوده شد نگینی در خاتمِ جلال
تاجِ سرِ ملوکِ جهان یادگار باد
گر تیره گشت ماهی از سایهٔ زمین
خورشیدِ ملک در کنفِ کردگار باد
ورخشک شد نهالی درباغِ مملکت
اصلش همیشه سبز و تر و میوه دار باد
ورچشمهٔ فرو شد الحق دریغ بود
بحر هزار چشمه گهر در کنار باد
مخدوم زادگان و بزرگان که حاضر ند
هر یک درین ثواب برین بادسار باد
چشمِ همه به صورتِ این برق ریز هست
ملکِ همه به دولتِ او برقرار باد

یہاں شاعر نے "مخدوم زادگان" کا ذکر بھی کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس امیر معین الدین کے بیٹوں اور دوسرے اکابر (بزرگان) کی موجودگی میں یہ ترجیع بند پڑھا گیا ہوگا۔ تاریخ سے نہیں معلوم ہوتا کہ یہ امیر کون تھا۔ ممکن ہے کہ وہ بوزابہ ہو جو ۵۴۲ھ۔۱۱۴۷ء میں اسی کی کوشش کی وجہ سے سلطان مسعود سے جنگ کرنے میں قتل کیا گیا تھا' اور چونکہ وہ آرزو (یعنی تخت نشینی کی تمنا) اب پوری ہوئی تھی اس لئے وہ پرانا غم یاد ہوگا۔(۱۱۳)

راحت الصدور (ص۲۵۱) میں ہے کہ "(سلطان ملک شاہ بن محمود) آسائشی و آرایشی عظیم داشت و بہ لہو و طرب عمری گذاشت بہ پادشاہی غرور و مملکتی از مزاحم دور' و سید اشرف (حسن) این قصیدہ (ترجیع بند) بہ تہنیتِ ملک در حقِ او گفت و بہ روزِ بار (یعنی در رجب ۵۴۷ھ۔ اکتوبر ۱۱۵۲) برخواند" (یعنی ہمدان میں پڑھا ہوگا اور اغلب ہے کہ اوپر والے ترجیع بند بھی وہیں پڑھے ہوں)۔

صبحِ ملک از مشرقِ اقبال سر بر می زند
نورِ خورشیدش علم بر چرخِ اخضر می زند
ہر نفس گردون غرامتہای دیگر می کشد
ہر زمان دولت بشارتہای دیگر می زند
آسمان روی زمین را حسنِ جنت می دہد
مشرقِ صحنِ جہان را آبِ کوثر می زند
چرخ گوئی چترِ مروارید می سازد بہ شب
پس بہ روز از ماہ و زہرہ زرّو زیور می زند
زرگرِ قدرت زسیمِ ماہ و زرِّ آفتاب
از پیِ سلطان ملک شہ تخت و افسر می زند
دست ضرآبِ طبیعت بر نشاطِ نامِ او
بردمِ طاؤس پنداری کہ ہم زر می زند

ای جہان از فتنہ باصد سال دیگر ایمنی
زان کہ از رنگِ ملک شہ بوی سنجر می زند
منت ایزد را جہاں فرّ ملک شاہی گرفت
بانگِ نامِ دولتش از ماہ تا ماہی گرفت

سات سات شعر کے یہ پانچ بند ہیں۔ چوتھے بند میں شاعر کہتا ہے:

خسروا گفتم سپہر امکان شوی اینک شدی
پادشاہِ جملۂ گیہان شوی اینک شدی
در ممالک کوس اسکندر زنی اینک زدی
در مظالم جانِ نوشروان شوی اینک شدی
از رخِ دنیا گلِ دولت چنی شاہا چدی
بر تنِ امکان سر احسان شوی اینک شدی
طالعِ میمونِ تو حکم ہمایون کردہ بود
کآفتابا' سایۂ یزدان شوی اینک شدی
بر درِ بغداد گفتا خواجہ ام برہانِ دین
کای ملک تا پنج مہ سلطان شوی اینک شدی
از ملک شہ جدّ خود چون یاد کردی بخت گفت
خسروا واللہ کہ صد چندان شوی اینک شدی
منت ایزد را جہان فرِّ ملک شاہی گرفت
بانگ نام دولتش از ماہ تا ماہی گرفت

اس بند میں خواجہ برہان الدین دراصل وہ بزرگ ہیں جن کی خدمت میں سنائی نے اپنا حدیقہ رائے لینے کے لئے بھیجا تھا اور ان کے نام حدیقہ کے آخر میں منظوم خط ہے ان کا پورا نام مع القاب اس میں یہ ہے۔ ''امام برہان الدین ابوالحسن علی بن ناصر غزنوی الملقب بہ بریان گر''۔ شاعر اس بند میں کہتا ہے کہ امام برہان الدین نے مجھ سے بغداد میں کہا تھا کہ

اے بادشاہ تو پانچ ماہ میں سلطان ہو جائے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم پانچ ماہ قبل (یا کچھ اتنی ہی مدت پہلے) امام برہان الدین بغداد میں زندہ تھے اور شاعر سے پھر ملاقات ہوئی تھی۔ بہر حال ملک شاہ بن محمود کی تخت نشینی پر وہ ترجیع بند پڑھا گیا تھا یہ ممدوح صرف چار ماہ یعنی رجب ۵۴۷ھ اکتوبر ۱۱۵۲ء سے شوال ۵۴۷ھ جنوری ۱۱۵۳ء تک ہمدان میں حکمران رہا۔

عراق کے قیام کے دوران میں یعنی بغداد سے ہمارا شاعر سنجر کی مدح میں ایک قصیدہ خراسان (نیشاپور) کو بھیجتا ہے۔ اس کے کچھ اشعار یہ ہیں:

ہر نسیمی کہ بمن بوی خراسان آرد
چون دمِ عیسیٰ در کالبدم جان آرد
دلِ مجروحِ مرا مرہم راحت سازد
جانِ پُر دردِ مرا سایۂ درمان آرد
خسروِ اعظم سلطانِ سلاطین سنجر
کآن چہ خواہد بہ ضرورت فلکش آن آرد
"شاہ سنجر" بہ خطِ نور نویسد خورشید
چون زر از صلبِ عدم در رحمِ کاں آرد
خسروا حاجتم این ست کہ ایزد بہ کرم
بازم اندر کنفِ سایۂ یزدان آرد
بجلالِ تو کہ گردون ہمہ عالم بر من
بی جمالِ تو ہمی تنگ چو زندان آرد
ہیچ ابری نہ جہد از طرف نیشا پور
کہ ازیں دیدہ بہ بغداد نہ باران آرد
من نہ دارم طمعِ آن کہ بجوید شاہم
یا حدیثم بہ زبانِ گہر افشان آرد

لیک در خاطرم آید کہ دبیرِ خاصہ
نام این گم شدہ در اولِ فرمان آرد
دُر بیارم' اگرم شاہ زپستیِ عراق
ابر کردار بہ بالای خراسان آرد
لا اری الھد ھد اگر رنجۂ شود ہدہد پیر
مژدۂ تخت و عروسی بہ سلیمان آرد (۱۱۴)

اس قصیدے سے صاف ہے کہ شاعر بغداد سے سنجر کو یاد کر رہا ہے جیسا کہ اس نے حج اور زیارت کے بعد بھی کیا تھا۔ آخر شعر میں خود کو "پیر" (ضعیف) ظاہر کیا ہے اور ہے بھی حقیقت کہ وہ اب تک کافی معمر ہو چکا ہوگا۔

خراسان کو واپسی

اس کے بعد ہمارا شاعر خراسان کی طرف روانہ ہوا ہوگا اور اسی زمانے میں اس نے اپنے قدیم ممدوح بہرام شاہ غزنوی کے متعلق سنا ہوگا کہ ۵۴۷ھ۔۱۱۵۲ء میں سنجر اور علاء الدین حسین "جہان سوز" غوری کی جنگ میں موخر الذکر کی قید پر اسے غزنین پر پھر قبضہ مل چکا ہے۔ چنانچہ اس نے یہ قصیدہ اسی زمانے میں لکھا ہوگا۔

آخر دلم بہ آرزوی خویشتن رسید
ذانچ از خدای خواستہ بودہ بہ من رسید
آن مہ کہ کرد طوفی سوی شرف شتافت
و آن گل کہ رفت سالی نزد چمن رسید
دل رفتہ بود و جان شدہ منّت خدای را
کآن دل بہ سینہ آمد و آن جان بہ تن رسید
خوش خوش کشادہ بلبل مردہ چو گل سخن
کآن طوطی شکر لب شیرین سخن رسید

شاہی کہ از نہادِ کمند زرہ ورش
باطبع آفتاب شکن در شکنِ رسید
نقاش صنعِ چہرۂ خوبش ہمی نگاشت
بی کار شد چو کاز بہ شکل دہن رسید
در بوستانِ حسنش بنگر کہ چون بہ وقت
نو بادۂ بنفشہ ز برگِ سمن رسید
گفتم ز نقل دانِ لبش بادۂ چشم
چون بر سمن بنفشۂ نو بر شکن رسید
بر شادی رسیدن شاہی کہ بردنش
از جان ندای اذھب عنا الحزن رسید
بہرام شاہ شاہ کہ در ملک او رساد
آنہا کزو بہ بندۂ مسکین حسن رسید (۱۱۵)

دوسرے شعر میں ع واں گل کہ رفت سالے نزد چمن رسید۔ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بہرام شاہ کم از کم ایک سال باہر رہا ہے۔ تب کہیں خوشی حاصل ہوئی ہے اور ع از جان ندای اذھب عنا الحزن رسید۔ یہ موقع اس کی سلطنت کے زمانے میں یہی تھا۔ جبکہ علاء الدین "جہان سوز" غوری سے وہ شکست کھا کر بھاگ گیا تھا۔ اور اب موخر الذکر کی قید پر پھر غزنین پر قابض ہوا ہے۔ اس کی تفصیل ہم تاریخ "بہرام شاہی" میں دے چکے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ شاعر خراسان پہنچ کر سنجر سے پھر مستفیض نہ ہو سکا۔ کیونکہ پھر اس کی مدح میں کوئی اور قصیدہ نہیں ملتا لیکن مرو کے ایک امیر جمال الدین محمد کے دربار سے وابستہ نظر آتا ہے۔ اس کی مدح میں ایک قصیدہ یہ ہے:

چو دولت رفت بر تختِ امارت
مہِ تاجش پذیرفت استدارت

وزیر چست مخل و شهم مقبل
که باشد درهمه کارش مهارت
بسازد کارِ عقبی از کفایت
بگیرد نامِ دنیا از حقارت
به عزت ماهِ گردونِ سعادت
به گوهر دُرِّ دریای طهارت
خرد راگفت کای نقادِ مردان
کجا و در که دیدی این امارت
گراز صدری چنینم مژده گیری
دهم ملکیت حق این بشارت
خرد مسکین درین خدمت فرو ماند
فتاد اندرِ نمازِ استخارت
ز رای پیر و ازعقل جوان هم
نمود الحق درین باب استشارت
سعادت کردش از دنبالۀ چشم
به مولانا جمال الدین اشارت
خجسته حاتم طائی محمّد
که جودش ملکِ کانها کرد غارت
چو از مکه شدم سوی مدینه
خدایم داد توفیق زیارت
پیامی داد جدّم مصطفیٰ خوب
به دستوری رسانیدم سفارت

پیام آن ست کای شائستہ فرزند
کہ بادا بحر را علمت غزارت
فرو شو نزد آن آزاد مردی
کہ دارد در جوان مردی بصارت
بگو کای خواجۂ مقبول مقبل
غلامانت سزاوار امارت
بنای عمرِ تو معمور بادا
کہ کردی روضۂ مارا عمارت
بجز از مال فانی جاہِ باقی
کہ میمون باد بر تو این تجارت(۱۱۶)

اس انتخاب کے گیارہویں شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ شاعر نے حج وزیارت کے بعد لکھا تھا۔ اور سولہویں شعر سے واضح ہوتا ہے کہ اس ممدوح نے مدینہ طیّبہ کے حرم کی کچھ تعمیر میں حصہ لیا تھا۔ پہلے' دوسرے اور پانچویں شعر سے ممدوح...... جمال الدین محمد کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ وہ وزیر یا امیر (سنجر کا؟) تھا۔ اس امارت کی بشارت ایک دوسرے قصیدے میں جو مذکورہ بالا قصیدے سے پہلے لکھا گیا ہوگا (گو کہ برٹش میوزیم والے مخطوطے میں یہ دوسرا قصیدہ پہلے کے ساتھ ہی ہے۔ اور بطور مطلع ثانی کے شروع ہوتا ہے) اس طرح ملتی ہے:۔

صبا دوش آمد و دادم بشارت
کہ خیز ای دُرِّ دریای طہارت
بدہ مژدہ کہ از ابرِ کرم یافت
نہالِ باغِ امیدم نضارت
چو نیک و بد نہ دانستم درین باب
فتادم در نمازِ استخارت

زرای پیر و از بختِ جوان نیز
درین معنی نمودم استشارت
ظهیرِ دولت و ملت محمد
کہ دارد در جوان مردی مہارت
گر از خورشید رایش تافتی ماہ
بماندی تا ابد در استنارت
ہزاران خادم و شاگرد ہستش
کہ کمتر شان منم با این حقارت
ولیکن راستی داند کہ چون تو
نہ بود ست و نہ باشد در سفارت
زہی اندر فنون و علم و حکمت
شدہ چون بحرِ یک فن در غزارت
مبارک روی محمودت بود زود
کہ بر ملکت بحق یابد امارت
حدیثی نیست رسمی آن چہ گفتم
کہ در سیماش دیدم این اشارت
مجیر من تو بس باشی کہ دارم
بہ مہرت خانۂ دل را اجارت
چو لالہ سرخ رویم کن ہمادان
کہ کردی روضۂ جدّم زیارت (۱۱۷)

اشعار ۱، ۲، ۱۰، ۱۱ سے ممدوح کو "امارت" ملنے کی "بشارت" دی گئی ہے وہ گویا دعا ہو گی جس کے قبول ہونے پر اسے وہ عہدہ مل گیا ہو گا، جس کا ذکر پہلے قصیدے میں ہو چکا ہے۔ اسی

جمال الدین ظہیر الدولہ محمد کی مدح میں ایک اور قصیدہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرو شاہجان میں ہے۔

ای صبا طوف درگلستان کن
هم دمی با هزار دستان کن
راز برگهای سوسن گوی
ناز بر شاخهای ریحان کن
چون رسیدی بدان همایون صدر
خدمت و بندگی فراوان کن
چون شدی تازه و خوش و خرّم
روی میمون به مرو شهجان کن
حضرتِ عالیِ جمالی را
خوش تر از بارگاهِ رضوان کن
یا رب او راکه دارد استحقاق
صاحب جملهٔ خراسان کن (۱۱۸)

اسی زمانے میں ایک ممدوح "رئیس دین" ہوں گے جو شاعر کے ساتھ حج میں تھے۔

اکفی الکفاتِ مشرق و مغرب رئیس دین
کآمد فلک به زیر و محلّش زبر نشست
چون خیزران دو تاشد تا پای همتش
برپشتِ قبهٔ فلکِ شیشه گر نشست
وی چون ز شرط سوی حرم شد کریم وار
گای دوسر براسبک خاصم گر نشست
آری نه سیدی که سواری براق بود
بر لاشهٔ برهنه بس مختصر نشست (۱۱۹)

ان ممدوحین کی مدح چونکہ شاعر نے اپنے حج (۵۴۶ھ۔۱۱۵۱ء) کے بعد کی ہے اس لئے ظاہر ہے کہ وہ زمانہ ۵۴۸ھ۔۱۱۵۳ء کے اوائل سے پہلے نہ ہوگا۔ کیونکہ حج کے بعد شاعر بغداد کو جاتا ہے۔اور سلطان مسعود سلجوقی کا مرثیہ ۵۴۷ھ۔۱۱۵۲ء میں لکھتا ہوا پایا جاتا ہے اور پھر ہمدان میں سلطان ملک شاہ بن محمود کی تخت نشینی (رجب ۵۴۷ھ۔اکتوبر ۱۱۵۲ء) پر ایک ترجیع بند پڑھتا ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ وہ ۵۴۸ھ۔۱۱۱۳ء کے اوائل تک خراسان پہنچا ہوگا۔اور کچھ عرصہ کے بعد سنجر کی قید پر (جمادی الاول ۵۴۸ھ۔اگست ۱۱۵۳ء) غزّ ترکوں کے فتنے کا تماشا دیکھا ہوگا۔

میرا خیال ہے کہ انھیں غزّوں کے اس فتنے اور خراسان کی بدحالی کی وجہ سے ہمارا شاعر مرو سے خوارزم کو نکل جاتا ہے اور وہاں اتسز (م ۵۵۱ھ۔۱۱۵۶ء) کی مدح اسی زمانے میں کرتا ہے۔

دیدم بخواب دوش براقی ز نورِ جان
میدانش نہ ولیکن جولانش بی کران
بالای او وجود و ہم او طایراز وجود
پہنای او مکان و ہم او فارغ از مکان
مریخ روز و تیر ذکا و زحل رکاب
خورشید روی و زہرہ نشاط و قمر عنان
گفتم کہ این براق چہ و این فرشتہ کیست
دولت چہ گفت ؟ گفت کہ آگہ شو و بدان
واللہ کہ آن براق ملک و آن فرشتہ ہست
خوارزم شاہ اتسزِ شاہِ جہان ستان
دادہ فلک عنانِ ارادت بہ دستِ او
یعنی کہ مرکبم بہ مرادِ خودت بران

خواہی ببند کار جہان خواہ برکشای

خواہی بدار گنج زمین خواہ برفشان

ای بر ہزار میر و ملک تاج و افتخار

دی تا دویست جد و پدر شاہ و پہلوان

ہم کار من بخدمت تو گشت منتظم

ہم نامِ تو بہ مدحتِ من ماند جاوداں (۱۲۰)

اس قصیدے کے سال تصنیف کو متعین کرنے کے لئے کہ وہ اسی زمانے میں لکھا گیا ہوگا۔ ہم پہلے تو یہ کہیں گے کہ وہ ۵۳۶ھ کے بعد لکھا گیا ہوگا۔ کیونکہ ہمارے شاعر کے یہاں (ابو محمد) عبدالجبار بن عبدالجبار بن محمد ثابتی الخرقی کی مدح میں بھی ایک قصیدہ ملتا ہے۔ یہ ان علماء میں سے تھے جن کو اس سال مرو سے اتسز اپنے ساتھ (ابن الاثیر۔۱۱:۴۰) خوارزم کو لے گیا تھا اور اسی سال سے اتسز کی طاقت بہت بڑھ گئی تھی۔ اور قصیدے میں ع خوارزم شاہ اتسز شاہ جہان ستان۔ سے بھی ظاہر ہے کہ یہ قصیدہ اتسز کی خود مختاری کے بعد لکھا گیا ہوگا۔ لیکن اسی زمانے میں یعنی ۵۳۶ھ کے قریب بھی نہیں لکھا ہوگا۔ کیونکہ شاعر اس وقت خراسانی ممدوحین اور بالخصوص ابوالقاسم زید بن الحسن "نقیب النقبا خراسان" کے دربار سے متعلق نظر آتا ہے اور اس کے متعلق ہم اوپر لکھ بھی چکے ہیں۔ پھر ابوالحسن عمرانی کی مدح کرتا ہوا پایا جاتا ہے جو "نقیب النقبا" کی طرح رے سے متعلق ہے اور ۵۴۰ھ کے قریب گذرا ہے۔ ۵۳۹ھ میں وہ اصفہان میں علی بن عثمان کی مدح میں بھی مصروف ہے اور ۵۴۰ھ میں تاج الدین ابو طالب کی مدح کرکے ۵۴۱ھ کی بہار تک وہ غزنین آجاتا ہے اور وہیں ۵۴۵ھ تک پایا جاتا ہے۔ پھر اسی سال حج کے لیے روانہ ہوتا ہے اور ذی الحجہ کے ماہ میں حج کرکے مدینہ طیبہ ہوتا ہوا بغداد پہنچتا ہے وہاں ۵۴۷ھ میں سلطان مسعود سلجوقی کا مرثیہ لکھتا ہے اور ہمدان میں ملک شاہ بن محمود کی تخت نشینی پر ترجیع بند پڑھتا ہے اور ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ وہ ۵۴۸ھ میں خراسان کو واپس ہوتا ہے۔ غرض کہ ظاہر ہے کہ وہ خراسان

کی بدحالی دیکھ کر اسی سال وہاں سے خوارزم روانہ ہوا ہو گا۔ کیونکہ اس وقت وہی ایک دربار شعرا کے لئے طمانیت بخش ہو سکتا تھا۔

اتسز کے علاوہ خوارزم میں ہمارے شاعر نے (ابو محمد) عبدالجبار بن ثابتی الخرقی کی کسی بیماری سے صحت یابی پر ایک قصیدہ لکھا تھا۔

ای مبارک ترِ عشقت ز سعادت بسیار
وی گرامی ترِ و صلت ز جوانی صد بار
عقل در عمر نیابد ز تو چابک تر دوست
وہم در خواب نبیند ز تو زیبا تر یار
عاشقِ عشقِ تو زانم کہ اگر مردہ شوم
پس صد سال مرا زندہ کنی عیسیٰ وار
ناردانی شدہ اشکِ منِ و ہم نیست شفا
دردِ دِل راچہ تشفا بود از آبِ انار
چون بہ عناب لبت روی بہی نیست مرا
تاچہ خود چشمِ مرا چشمِ تو دارد بیمار
مرضِ چشمِ من و چشمِ تو کاری ست بزرگ
خیز بر صحتِ مخدومِ جہان مژدہ بیار
مرکز جود و سپہرِ ہنر و عمدہ جاہ
صدر با حشمت و با مرتبہ عبدالجبار
آفتابی کہ عجب بنود اگر از رایش
انجم چرخ ہمہ ہدیہ دہد چون اثمار
ای شگفتہ ز بہارِ تو بہارِ دولت
معتدل باد مزاجت ہمۂ سال بہار

چرخ گر کرد گنه، کرد ہم استغفاری
بی شک آرد بہ تو شکرانۂ آن استغفار
رنج بیماری ازین عارضہ دیدی تو و باد
کوکبِ بختِ تو تا صبح قیامت بیدار

اس قصیدے میں میں عبدالجبار کو "صدر" کہا ہے۔ اگر وہ اتسز کا وزیر نہ بھی رہا ہو تب بھی اس لفظ سے اسے قاضی یا محض عالم سمجھنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ کیونکہ اسی زمانے میں اس کا اطلاق اس معنی (۱۲۱) میں بھی ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ یہ قصیدہ اسی عبدالجبار کے متعلق ہے جس کو اتسز اپنے ساتھ مرو شاہجان کی فتح (۱۷ ربیع الاول ۵۳۶ھ) پر خوارزم کو لے گیا تھا۔ ایرانی فاضل عباس اقبال نے حدایق السحر کی تعلیقات (ص ۱۱۳ بعد) میں اس کا ترجمہ دیا ہے لیکن مخدومی پرنسپل محمد شفیع صاحب نے اورینٹل کالج میگزین (فروری ۱۹۳۲ء ص ۴۷ بعد) میں اور پھر تتمہ صوان الحکمہ (عربی ۱۹۳۵ء ص ۲۱۱) میں صحیح طور پر ثابت کر دیا ہے کہ یہ "الفیلسوف بہاء الدین ابو محمد عبدالجبار بن عبدالجبار محمد ثابتی الخرقی" ہے جو "شافعی علماء" میں سے ہے اور بقول سبکی (طبقات الشافعیۃ الکبریٰ) وہ ۴۷۷ھ میں پیدا ہوا اور ۵۵۳ھ میں انتقال کیا۔ (۱۲۲)

اتسز اور عبدالجبار کے متعلق صرف ایک ایک قصیدہ ملتا ہے اس لئے خیال ہوتا ہے کہ خوارزم میں زیادہ قیام نہ رہا ہوگا۔ اور وہاں وطواط کی موجودگی میں رہتا بھی کیوں کر جب کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ ہمارا شاعر غزنین ہی میں (دو قصیدوں میں) وطواط کے متعلق حسد سے کہہ چکا تھا:

بسانِ طوطی چون طبعِ من شکر خاید
ز رشک گیرد وطواط را روان آتش

(در مدح بہرام شاہ)

زنہار چو وطواط و عمادیم مپندار
کافسوس بود عیسیٰ با خر بجوالی

(در مدح خسرو شاہ بن بہرام شاہ)

یہ زمانہ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں خراسان والوں کے لئے بہت سخت تھا۔ ہر جگہ غزترکوں نے اپنا فتنہ پھیلا دیا تھا۔ تاریخ ابن خلدون (ترجمہ۔ ج ۱۴: ص ۲۰۰ بعد) میں ہے کہ سنجر کی گرفتاری پر اس کا وزیر ناصر الدین طاہر بن فخر الملک دوسرے امرا کے ساتھ مرو سے نیشا پور پہنچا۔ وہاں سلیمان شاہ بن محمود کو بلوا کر سریر حکومت پر متمکن کیا۔ اور ۱۹ جمادی الآخر ۵۴۸ھ میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ پھر خراسانی لشکر نے مل کر ترکوں کے خلاف مرو کے باہر صف آرائی کی۔ لیکن ہار گئے چنانچہ طوس اور پھر نیشاپور میں (ماہ شوال) ترکوں نے اپنا مشہور جدال و قتال اور قیامت کا نمونہ پیش کیا۔ اسی واقعہ سے متاثر ہو کر انوری نے خراسان کو خونین داستان Tears of Khorasan (یعنی ع بر سمرقند اگر بگذری ای باد سحر ...... الخ) لکھی تھی پروفیسر براؤن نے (ج ۲۔ ص ۳۸۶) اس کا سال ۵۵۰ھ لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ Kirkpatrick کا خیال ہے کہ انوری نے وہ اشعار سمرقند کے حاکم محمد بن سلیمان کے لئے لکھے تھے۔ لیکن پروفیسر شیرانی صاحب کا خیال (تنقید شعر العجم۔ ص ۲۴۳) صحیح ہے کہ وہ سنجر کے بھانجے رکن الدین محمود خان بن ارسلان خان محمد (بن بغرا خان) کے نام بھیجے گئے ہوں گے۔ ان فضلا کا یہ خیال بھی ہے کہ یہ سفارت نامہ ۵۵۰ھ کے درمیان بھیجا گیا ہوگا۔ لیکن میں نے (معارف۔ ستمبر ۴۲ء ص ۲۱۲) لکھا تھا کہ وہ ۵۴۸ھ کے فوراً بعد ہی بھیجا گیا ہوگا کیونکہ اس سال کی مصیبت ایسی نہ تھی کہ دو تین سال کے پہلے اس کے خلاف جوش نہ پیدا ہوتا۔ میرا یہ خیال اب صحیح نکلا جبکہ تاریخ ابن خلدون (ج ۱۴۔ ص ۲۰۲) سے معلوم ہوا کہ ماہ شوال ۵۴۸ھ میں ناصر الدین طاہر کے انتقال پر سلیمان شاہ نے اس کے بیٹے نظام الملک دوم (قوام الدین حسن؟) کو اپنا وزیر بنایا لیکن ترکوں کے مقابلے کی ہمت نہ تھی اس لئے سلیمان شاہ عاجز ہو کر صفر ۵۴۹ھ میں جرجان چلا گیا تو ارکین دولت نے رکن الدین محمود خان کو سمرقند سے بلوایا اور شوال ۵۴۹ھ میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ اس وقت غزترک ہرات کا محاصرہ کئے ہوئے تھے۔ کئی لڑائیاں ہوئیں۔ آخر انھوں نے جمادی الاول ۵۵۰ھ میں وہاں کا محاصرہ اٹھا لیا اور مرو کو چلے گئے۔ نیشاپور وغیرہ پر

موید آی آبہ نے قبضہ کر لیا تھا۔ آخر رجب ۵۵۰ھ میں محمود خان اور ترکوں کے درمیان صلح ہو گئی۔ لیکن چونکہ اسے ترکوں سے کھٹکا لگا ہوا تھا اس لئے وہ اپنی قدیم دوستی کی بنا پر اتسز بن محمد خوارزم شاہ (المتوفی ۵۵۱ھ) سے مشاورت اور مصالحت کے لئے نیشا پور سے خبوشانِ استوا (قوچانِ حالیہ) میں آکر ملاقات کرتا ہے (مقدمہ حدائق السحر ح۔ ن) اور اس ملاقات کا زمانہ تین ماہ کا طول کھینچتا ہے جبکہ ۵۵۱ھ کے اوائل میں وہیں سنجر کی رہائی کی خبر ان کو معلوم ہوتی ہے۔

سنجر کی وفات (۱۲۳) (دوشنبہ ۱۴ ربیع الاول ۵۵۲ھ) پر محمود خان دوبارہ تخت نشین ہوتا ہے اور ہمارا شاعر غالباً اسی زمانے میں اس کی مدح میں کئی قصیدے لکھتا ہے کیونکہ محمود خان کا پہلا دور ۵۴۹ھ تا ۵۵۰ھ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ایسی پریشانیوں سے پُر تھا کہ اس وقت شعر و شاعر کی قدر دانی مشکل تھی۔ بہر حال اس کی (دوبارہ) تخت نشینی پر سید حسن ایک طویل قصیدہ لکھتا ہے جس کے کچھ اشعار یہ ہیں:

وقت آنست کہ مستان طرب از سر گیرند (۱۲۴)
طرّۂ شب ز رخِ روز ہمی بر گیرند
راویان ہر نفسی تہنیتی نو گویند
مطربان ہر کرتی پردۂ دیگر گیرند
ترک این گنبد نُہ پوشش گردان گویند
کم این خانۂ پُر روزنِ بی در گیرند
خوش و خرم بنشینند چو خاقان محمود
یادِ اقبالِ شہِ عالم سنجر گیرند
دو فلک تخت کہ شان در عددِ تاج وران
اوّلِ خسرو و ثانیِ سکندر گیرند

که گمان برد که پیری و جوانی شب و روز
رایت رای مبارک زمه و خور گیرند
یا که دانست که هرگز پدری و پسری
فرّ داودؑ و سلیمانؑ پیمبر گیرند
گر پدر بحرِ محیط ست پسر عنبر اوست
ساحلِ بحر به بودی دمِ عنبر گیرند
ور پدر کوهِ عظیم ست پسر گوهر اوست
خاتم از کوه نه گیرند ز گوهر گیرند
ور پدر چرخِ رفیع ست پسر اخترِ اوست
تابش از چرخ نه گیرند ز اختر گیرند
خه خه ای شاهِ زمانه که هزارت شمرند
هم به امر تو چو اندازهٔ لشکر گیرند
زور و زر هست همه تاج وران را لیکن
نامِ محمود و محمدؐ همه در زر گیرند
صبح وشام از چه شود روشن و تاریک از انک
تاج و چترت را بر دیده در بر گیرند
ملاء اعلیٰ چون خطبه به نامت شنوند
هفت گردون را چون پایهٔ منبر گیرند
منت گاهی در ذمت شاهان بنهند
خلعت روزی بر قامت قیصر گیرند
قدسیان بانگ برآرند به تکبیر سبک
فتح نامت چو کبوتر همه در پر گیرند

تازی و پارسی معجزم از باغ علوم
خشک خاری ست کہ در شاخِ گل تر گیرند

اوپر کے دوسرے شعر میں "تہنیت" ہے اور چودھویں شعر میں "خطبہ" پڑھے جانے کا ذکر ہے یعنی یہ اشعار محمود خان کی تخت نشینی پر لکھے گئے ہوں گے یا شروع میں تو ضرور لکھے گئے ہوں اسی لئے اپنی عربی دانی کا تعارف بھی آخری شعر میں ہے تیرہویں شعر میں سلجوقی سفید تاج اور سیاہ چتر کی حسن تعلیل موجود ہے۔ پانچویں سے بارہویں شعر تک محمود خان کے والد محمد خان کے متعلق ذکر ہے۔ یعنی وہ اس عہد تک زندہ تھا۔ یہ بات ہم کو پہلی باریہیں سے معلوم ہوتی ہے۔ ابن الاثیر طبع لیڈن (ج ۱۱۔ ص ۵۴ بعد) اور ابن خلدون (ترجمہ۔ ج ۱۲۔ ص ۱۳۱۷ اور ج ۱۴۔ ص ۱۸۳) وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ارسلان خان محمد کا ایک لڑکا بغرا خان ایک درباری شخص شریف علوی محمد ابو شجاع کے ورغلانے میں آکر اپنے باپ کے خلاف ہو گیا۔ باپ نے بیٹے کو اور اس شخص کو قتل کر دیا۔ جس سے ان کے حمایتی ترک (قارغلیہ) نے اس کے خلاف بغاوت کی۔ اس نے سنجر سے مدد مانگی۔ اور سنجر نے ۵۲۴ھ میں ان ترکوں کو بھگا دیا۔ لیکن سنجر کو چند ایسے اشخاص ملے جنھوں نے غلط یا صحیح یہ کہا کہ ارسلان خان محمد نے اس (سنجر) کے قتل کے لئے ان کو مقرر کیا ہے۔ اس بات پر سنجر کو غصہ آیا اور اس نے ارسلان خان کو بلخ میں قید کرا دیا جہاں اس کا انتقال ہوا۔ یعنی ۵۲۴ھ میں وہ قید ہوا اور ابن خلدون (۱۴: ص ۱۸۳) سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ۴۹۴ھ میں سنجر نے اس کو دوبارہ ترکستان کا حکمران بنایا تھا۔ یعنی اس وقت سے اب تک وہ اگر زندہ بھی رہتا تو بہت زیادہ عمر ہوتی۔ یعنی ۵۵۲ھ میں (جس کے پہلے یہ قصیدہ نہ لکھا گیا ہو گا) وہ بہت ہی زیادہ معمر ہوتا۔ اور پھر بلخ کی قید میں اس کے انتقال کا معاملہ رہ جاتا ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ محمود خان اس کا بیٹا نہیں بلکہ پوتا ہو گا اور مزید تائید اس خیال کی اس طرح ہو جاتی ہے کہ سید حسن کے شاگرد نے مقدمہ میں اس کا نام "محمود خان بن محمد بن بغرا خان" لکھا ہے۔ محمود خان کے اس ابتدائی عہد کے متعلق ایک اور قصیدہ ہے۔

فسانه گشت به یک بار داستانِ کرم
بریده شد پیِ حاجت نه آستانِ کرم
برون ز قبّهٔ مینا ست بارگاهِ وفا
ورای خانهٔ عنقاست آشیانِ کرم
به بوی فضل و کرم خانماں رہا کر دم
که روی فضل سیه باد و خانمان کرم
عجب مدار که شد تند خاطرِ تیزم
که تیغ خاطر چوبی ست از فسانِ کرم
به آب و دانه چو من بلبلی نپردازم
اگر نه بودی پژمرده بوستانِ کرم
زحد ببردم، نی نی ہنوز سرمست ست
ز جامِ جود و سخا طبعِ شادمانِ کرم
ہنوز قاعدهٔ ہست در وجود ہنر
ہنوز منطقهٔ ہست بر میانِ کرم
به فرِّ دولتِ خاقان جلالِ دولت و دین
که نوکِ خامهٔ اوہست ترجمانِ کرم
کریم عادل محمود بن محمد آن
که ہست غایتِ سوگند او بجانِ کرم
ہزار منّتِ حق را که خطبه و سکّه
به نامِ مجلس اعلاست درجہانِ کرم

آخر شعر میں پھر صاف کہا ہے کہ محمود خان بن محمد کے نام خطبہ پڑھا جاتا ہے اور یہ بھی کہ سکّے اس کے نام سے رائج ہیں۔ چنانچہ خیال ہوتا ہے کہ محمود خان کے پہلے دورِ پریشانی میں سکّے رائج نہ ہو سکے ہوں گے بلکہ دوسرا دور جو سنجر کی وفات سے شروع ہوتا ہے

ایسے کام کے لئے زیادہ موزوں رہا ہوگا۔ اسی لئے یہ خیال صحیح ہو سکتا ہے کہ ہمارا شاعر دوسرے دور میں اس کے دربار سے متعلق ہوگا جبکہ شاعروں کی قدر بھی ہو سکتی تھی ایک اور قصیدہ اس طرح شروع ہوتا ہے۔

ای گوہرِ مطہرِ مردی و مردمی
اصلِ تو کانِ گوہرِ مردی و مردمی
در جنگ و صلح رستمِ میدان و مجلسی
در کین ومہر حیدرِ مردی و مردمی
دارد دلِ تو نور ز ایمان و معرفت
بارد لبِ تو شکرِ مردی و مردمی
چرخ ار زمبح صادق درپیشِ آفتاب
پرسد کہ کیست یاورِ مردی و مردمی
گوید جلالِ دنیا محمود خان کہ ہست
بر چرخ ملک محور مردی و مردمی
ای مایۂ سعادت دنیا و آخرت
وی معجزِ پیمبرِ مردی و مردمی
القابِ عالیِ تو طرا زیست ہر کجا
بر رایتِ مظفر مردی و مردمی
قدرت نعوذ باللہ اگر سرکشی کند
عاطل بماند افسرِ مردی و مردمی

سید حسن کے شاگرد نے جو مقدمہ اس کے دیوان پر لکھا تھا اور جس کے ضروری اقتباسات شروع میں دے چکے ہیں اس میں محمود خان کے القاب "شمس الملوک' جلال الدین" وغیرہ ہیں۔ یعنی یہ القاب اس کے دوسرے عہد حکومت میں ضرور تھے اس مقدمہ میں کنیت بھی "ابو القاسم" ہے دیوان میں ایک قطعہ بھی ملتا ہے جس میں صرف شمس

الملوک" لقب آیا ہے اور اس کے التفات کا اعتراف کیا ہے:

جانم غریق نعمتِ شمس الملوک شد
دین طرفہ تر کہ می زیم اکنون بجانِ شکر
از بس کہ ابرِ لطف ببارید برسرم
بشگفت از بہارِ دلم بوستانِ شکر
در گلشن ثناش زبانم چو بلبل است
دستانِ مدح می زند و داستانِ شکر
حقا کہ تیرِ مدح برون پرّد از جہان
گر درکشم بہ قوتِ مہرش کمانِ شکر
ای بر دلم کشادہ بہ بیعت درِ امید
جان بستہ ام بجانِ کرم برمیانِ شکر
پایم چودر رکابِ سعادت بہ عونِ تست
آن بہ کہ سوی صدرِ تو تا بم عنانِ شکر
زین پس اگر خدای بخواہد بہ دولتت
ہر لحظہ گوہری بدر آرم زکانِ شکر

ان اشعار سے شاعر کی تربیت کا حال معلوم ہوتا ہے۔ محمود خان کی اسی قدر شناسی کی وجہ سے شاعر نے ذو قصیدے ملمع مجوب میں بھی لکھے ہیں جو ممکن ہے کہ اظہار قابلیت کے لئے ہوں کیوں کہ وہ "گیرند" والے قصیدۂ بالا میں کہہ بھی چکا ہے کہ ع تازی و پارسیِ معجزم از باغِ علوم، بہر حال چوں کہ عربی میں کل یہی سرمایہ باقی ہے۔ اس لئے اس کا نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

طلع الشمس علی الندمان
فاشرب الراح علی الریحان

شاید ار داد ز گل بستانی
که به رخ رشک گلِ بستانی
افرغ القهوة فی الکاس لکی
یفرغ القلب من الاشجانِ
باده از دست غمت بستاند
چون تو از دستِ منش نستانی
ضحک الورد بلا ثغر کما
بکت السحب بلا اجفانِ
من چو ابر از غمِ تو گریانم
تو چو گل باہمہ کس خندانی
جار فی الود فاشکوه الیٰ
ملک المشرق بغرا خانِ
خسرو عادلِ خاقان محمود
او چو محمود بہ ملک ارزانی
غرر الورد علی الاغصان
لمعت فی طرف الریحانِ
رفت بر تختِ گلِ زندانی
چو پیمبر بچۂ کنعانی
مسمعات الطرفی بدویہ
یتبارین لدی الالحان
بلبلان در چمنش پنداری
مطربانند ز پر دستانی

حات ها تسکرنا حات فقد
حرم الحزن علی السکدانٖ
درده آن بادۂ شادی درده
تاکہ مانٖ از کفِ غم بستانی
مرض اللھو بغمٍ عجباً
و توخت فتن الازمان
ست عہدیِ فلکِ می بنی
بی وفائیِ جہان می دانی
از تری الملک تتبع ابداً
لست بالمالک بغرا خان
طمعِ و دولتِ جاوید مدار
از شہنشاہِ جہان خاقانی
قرۃ فی حدق الدولۃ بل
فلذۃ من کبر السلطانٖ (۱۲۵)
شاہِ شاہان جہاں محمود آں
کہ نذارد چو محمد ثانی

دوسرا قصیدہ (ملمع مجوب) اس طرح ہے:

الاحات خمرا کا لعندم
کانک مازجتھا من دم
میِ درغمی خوارگر درغمی
کہ شادی فزاید ھمی درغمی
یلوح سناھا علی وجنتی
اذا انحدرت کا سھا فی فم

بیا نوش کن با وبت نوش لب
شرابِ محرم اگر محرمی
فاھلا بسکری من مغنم
و ھبعام بصحوی من مغرم
خوشا گر تو با ما بہ ھنگامِ گل
خرامی بہ ھنگامۂ خرمی
ملیک غدا بین جمع الملوک
بمنزلۃ الفصّ فی الخاتم
چراغ بنی آدم و شمع ملک
کہ عالی ست زو منصبِ آدمی
فما اطیب الرّاح لا سیما
علیٰ ذکر خاقانی الاعظم
جلال دول شاہ محمود خان
کزو گشت بنیادِ دین محکمی
فیا رب عمرہ فی ملکہ
الیٰ حین منقرض العالم (۱۶۲)
شدہ ختم بر فرِّ او خرمی
شدہ وقف بر طبع او بی غمی

ان عربی قصیدوں سے اگر سید حسن کو اظہار قابلیت منظور تھا تو ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ممدوح بھی عربی قصیدوں کی قدر جانتا ہوگا۔(۱۲۷) ورنہ عربی میں لکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ گو کہ یہ قصیدے بلند پایہ نہیں ہیں تاہم ان سے اس کی قدرتِ زبان اور آگاہیِ اسلوبِ شعر کا پتہ چلتا ہے۔

ہمارے شاعر نے رکن الدین محمود خان کے وزیر خالد مالکی کی مدح میں بھی ایک قصیدہ لکھا تھا۔

یارب این بوی خوشِ سنبل و گل یا سمن است
یا نسیمی ز سر چار سوی یارِ من است
یا عبیرِ کلۂ تافتۂ شمشاد ست
یا بخارِ رخِ افروختۂ نسترن است
مگر این موسم خند یدنِ باغ ارم ست
مگر این نوبتِ پاشیدنِ مشکِ ختن است
ای عجب این دم مشکین کہ جہان خرّم کرد
مگر از سینۂ پُر نورِ اُویسؓ قرن است
اینت اقبال کہ آمد بہ مشامِ دل من
اثرِ دشمتی از ہمتِ مخدومِ من است
آن خردمند کہ بر تختِ سخن جمشید است
و آن سخن ور کہ بہ میدان ہنر تہمتن است
وطنِ خالد جز خلد مدان فردا از انک
خلد را امروز اندر دلِ خالد وطن است
خالد مالکی آن صدر کہ خالد بہ بہشت
ہمچو رضوان ز نسیمِ کرمِ خویشتن است
پرتوِ خاطرِ او طبعِ مرا قوت داد
خہ خہ ای خاطر چون تیغ کہ آن عکس من است
بہ قبول سخنش یک سخنم را صد کرد
گرچہ دانست کہ در ہر سخنم صد سخن است

مادحِ او من و مدح فرستد عجب است
عشق بر بلبل و گل چاک زده پیرہن است

آمد ار کارِ ثنای تو مثمّن چو بهشت
گرچه شعرِ تو مسدّس چو نجومِ پرن است

آن مسدس را هر شش جهت آورده سجود
و آن مثمن را در هشت بهشتش عدن است

قلمت را سزد ار کلکِ عطارد خوانم
زانکه این طبعِ لطیفِ تو عطارد وطن است

با عطارد شده ام هم قلم واین شرحم
از پیِ مدحتِ خورشیدِ زمین و زمن است

خسروِ عادلِ محمود که همچون هم نام
مسجد آباد کن و غازیِ بت خانه کن است

مردمی را چو خرد در سرو مردم در چشم
مملکت را چو فرح در دل و جاں در بدن است

پارۂ گوشت چو جان دادش ماه چنگل است
قطرۂ آب چو پروردش دُرِّ عدن است

که دل و جانِ مرا همچو فرائض مطلوب
خدمت درگہِ آن شاهِ مبارک سخن است

چه کنم فتنه ازان است که برنارد چرخ
هر مرادی که برین جان و دلم مفتتن است

از پیِ آن که حسن نام و حسینی نسبم
کارِ ناسازم چون کارِ حسینؓ و حسنؓ است

خاصه امسال که گوئی زقضای گردون
بن هر خار کمین گاهِ ہزار اہرمن است
شاه محمود که او را به مقام محمود
از بس اخلاق محمدؐ و نجسته سنن است
عالم از روی و زر ایش حسن آبادی شد
که همه چیزش تا من که غلامم حسن است

اس قصیدے کے ساتویں اور آٹھویں شعر میں خالد مالکی کا نام آیا ہے جو محمود خان کا صدر تھا۔ یہ اطلاع سب سے پہلے ہم کو اسی قصیدے سے ملتی ہے لباب الالباب (ج ۲: ص ۱۳۸۔۱۴۵) میں اس کا نام ضرور آیا ہے۔ لیکن اس کی صدارت کا حال یہیں معلوم ہوتا ہے اور نام بھی اس میں "الامیر العمید فخر الدین تاج الافضل خالد بن الربیع المکی الطولانی ہے اور آگے ہے کہ ......از افاضل جہاں واعیان خراسان بود...... و میان او و حد الدہر انوری مکاتبت و مشاعرات است...... حالات تو خیر صحیح ہیں لیکن اسے "مالکی" کی جگہ "مکی" لکھا ہے اور یہ غلط ہے۔ مذکورۂ بالا قصیدہ اسے "مالکی" کہتا ہے اور اس سے زیادہ صحیح ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟ عباس اقبال نے بھی مقدمہ حدائق السحر (ب۔ س ۸) میں اسے 'مالکی" لکھا ہے اور ایسا ہی پروفیسر شیرانی صاحب نے کتاب تنقید شعر العجم (۸۲۱) ص ۲۰۶۔ ۲۵۸) میں لکھا ہے۔ لباب میں علاء الدین "جہان سوز" کے یہاں انوری کی طلبی کا مشہور واقعہ لکھا ہوا ہے جس میں یہ ہے کہ خالد کے اشارہ سے انوری جو کہ ملک طوطی (ناصر الدین ابو شجاع طوطی بن اسحٰق الخضر) کے یہاں تھا علاء الدین کے پاس پہنچنے سے بچ جاتا ہے۔ غرض یہ کہ خالد مالکی کو لباب میں علاء الدین "جہان سوز" کے دربار سے وابستہ بتایا گیا ہے جو ممکن ہے کہ صحیح ہو۔ لیکن اسی کتاب میں کسی بادشاہ محمد (ص ۱۴۱) اور حسن (ص ۱۴۴) کی مدح میں خالد کے اشعار ملتے ہیں اور یہ ایسے ممدوح ہیں جن کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہے۔ (گو کہ تعلیقات کے ص ۵۶۴ میں محمد کو سلجوقی المتوفی ۵۱۱ھ سمجھا گیا ہے) بہر حال خالد مالکی پہلے کہیں بھی

ہا ہو لیکن مذکورہ بالا اشعار میں وہ محمود خان کے دربار سے متعلق ہے جہاں وہ غالباً ۵۵۳ھ سے وزیر ہوا ہوگا۔ کیونکہ اس کے پہلے قوام الدین حسن اس کا وزیر تھا جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے۔

دسویں شعر میں سید حسن انکسار ظاہر کرتا ہے اور گیارہویں بارہویں اور تیرہویں شعر سے واضح ہوتا ہے کہ خالد نے کچھ اشعار سید حسن کی مدح میں پہلے لکھے تھے اور وہ شاید "مسدس" (مسمط) میں ہوں گے۔ اکتیسویں شعر میں شاعر اپنا نام "حسن" اور نسب حسینی (سید) بتاتا ہے اور چونکہ خالد کے اشعار کے بعد سید حسن نے یہ قصیدہ لکھا تھا اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے باہمی تعلقات کو کچھ عرصہ ضرور ہو چکا ہوگا۔ خالد کے علاوہ ایک قصیدہ محمود خان کے دوسرے وزیر قوام الدین (بو محمد) بن ناصر الدین طاہر کی مدح میں بھی معلوم ہوتا ہے:

خدای عزو جل داد بندہ را در سر
دو دیدبان کہ گرامی تر ند یک ز دگر
ہزار منتّ حق راکہ داشت ارزانی
چنین نفیس دو گوہر بصدقِ حق پرور
قوامِ دولت و دین بو محمدِ طاہر
کہ دین و دولت از و یافتند زینت وفر
سپہر ساختہ از جزم او بسی وزنہ
زمانہ آختہ از عزم او بسی خنجر
عطا گزاریِ مقصودِ او ز زرّ و زسیم
بزرگواریِ میراثِ او ز جدّ و پدر

یہ قصیدہ طویل ہے لیکن ہم نے چند اشعار پر اکتفا کیا ہے۔ اس میں ممدوح کا نام قوام الدین ابو محمد ابن طاہر ملتا ہے۔ میرا ظنِّ غالب ہے کہ یہ قوام الدین (ابو محمد) حسن

بن (ناصر الدین) طاہر (بن فخر الملک بن نظام الملک) ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لقب (قوام الدین) اور ولدیت (طاہر) کے علاوہ قصیدے میں کہا گیا ہے: ع بزرگواریِ میراثِ اوز جدّو پدر۔ یعنی اس کے باپ (ناصر الدین طاہر المتوفی ۵۴۸ھ) اور دادا (فخر الملک۔ م ۵۰۰ھ) سے "بزرگواری" (وزارت) چلی آرہی ہے لیکن اس کی کنیت "ابو محمد" صرف سید حسن کے قصیدے میں ملتی ہے۔

انوری نے بھی اسے اپنے کلیات (ص ۷۰۵) میں یاد کیا ہے:

قدر من صاحب قوام الدین حسن داند ازانک

صدر او را یادگار از ناصر الدین طاہرم

اور تاریخ بیہق (ص ۷۵) میں اس کے متعلق ہے...... اما قوام الدین الحسن بن ناصر الدین (طاہر) کہ وزارتِ سلطان سلیمان و وزارتِ سلطان محمود خان بمکانِ او آراستہ بود در بیہق مقیم است من سنۃ ثلاث خمیس و خمسماۃ الی یومنا ہذا (یعنی ۵۵۳ھ) یعنی قوام الدین الحسن نے سلطان سلیمان سلجوقی (در ایام اسارتِ سنجر بدستِ غزان) اور پھر سلطان محمود خان بن محمد خان کی وزارت کے بعد ۵۵۳ھ تک سبکدوشی بھی حاصل کرلی تھی۔ اس لئے ظاہر ہے کہ وہ خالد مالکی سے پہلے صدر رہا ہو کیونکہ تاریخ ابن خلدون (اردو ترجمہ۔ ص ۲۰۲۔ ج ۱۴) میں ہے کہ سلیمان بن محمد نے (جو ۱۹ جمادی الآخر ۵۴۸ھ سے سنجر کی جگہ حاکم بنایا گیا تھا) شوال ۵۴۸ھ میں ناصر الدین طاہر کے انتقال پر اس کے بیٹے نظام الملک دوم (یعنی اسی قوام الدین حسن) کو اپنا وزیر بنالیا تھا۔ پھر شوال ۵۴۹ھ میں جب محمود خان حاکم ہوا اس نے بھی اسے اپنا وزیر بنالیا ہوگا۔

عراق کو روانگی

اس کے بعد ہمارا شاعر پھر عراق (اور ہمدان) کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ راحت الصدور (ص ۲۶۲۔ ۲۶۳) سے معلوم ہوتا ہے کہ سلیمان سلجوقی اپنے بھائی مسعود بن محمد کے

انتقال (۵۴۷ھ) پر قلعہ فرزین میں سات سال تک (لیکن یہ زمانہ کم ہوگا) مقید رہا۔ پھر بعض مخلص امیروں کی مدد سے وہاں سے بھاگ نکلا۔ جن امراء نے اس کا ساتھ دیا ان میں یمین الدین امیر بار اور رشید جامہ دار بھی تھے۔ ہمارا شاعر ان دونوں کی مدح ایک ہی قصیدے میں کرتا ہے۔

دل و جانم یمینِ دین دارد
کہ بہ پاکیش در یمین دارد
کین و مہرش کہ آن مبارا این باد
مزہَ زہر و انگبین دارد
علم او حجتِ فلک داند
حلمِ او قوتِ زمین دارد
ہست خورشید در گریبانش
زان کہ دریا در آستین دارد
بخدا را چو طالعِ سعدش
حلقہء اسمان نگین دارد
روی من ہمچو موی دلداران
در فراقش ہزار چین دارد
از غریبان کجاش یاد آید
ہمدمی چون صفیِ دین دارد
تاجِ دولت رشید مسعود آنک
چون سعادت بسی قرین دارد
زان بہ دل ہمچو دیدہ نزدیک ست
کہ دلِ نیک دوربین دارد
حسن از ذکر و شکر ہر دو بزرگ

آفرینش بر آفرین دارد
تا برایشان چو زر نثار کند
طبع پرُ لولوی ثمین دارد
یا رب او را بدین غرض برسان
کز جہان آرزو ہمین دارد (۱۹۲)

اس قصیدے میں رشید (۱۳۰) کو "صفی الدین' تاج الدولہ" اور "ابن مسعود" کہا ہے اور یہ اطلاع ہم کو سب سے پہلے یہیں سے ملتی ہے۔ یمین الدین کے متعلق ایک اور قصیدہ ملتا ہے جس میں اس کو "صدر" کہا ہے:

از گریہ اگر یک دم سر بر کنمی من
چون شمع بسی آتش برسر کنمی من

گر چشمۂ نوشت دہدی آب حیاتم
ہرگز سخنِ چشمۂ کوثر کنمی من
جانی ست مرا خشک وبتا ورنہ ہم آخر
از بادۂ لبہات ہمی تر کنمی من
بردیدۂ من پای چو ابرو بنہی تو
در گردنِ تو دست چو چنبر کنمی من
مشغولِ توام گر نہ مہ و سال و شب و روز
از دیدہ و جان خدمتِ مہتر کنمی من
فرزانہ یمین الدین آن جان کہ خوشستی
گر نعلِ سمندش را افسر کنمی من
توفیقِ عزیز ست و گرنہ بہ ثنایش
از گوی فلک حقۂ گوہر کنمی من

وان پیکر بدخواہِ فرو مایۂ او را

از تیغ زبان ہمچو دو پیکر کنمی من

سر بر خطِ فرمانش ہمی دارم اگرنی

خاک از ستمِ دہر بہ سربر کنمی من

اقبال چنان گفت کہ گر خواہدی آن صدر

از مہر و مہش بادۂ و ساغر کنمی من

مردی نہ بود کشتنِ نامردان ورنی

برجملۂ اعداش مظفر کنمی من

اور انھیں امیروں کا آقا یعنی سلیمان سلجوقی جو ہمدان میں ۱۲ ربیع الاول ۵۵۵ھ (سہ شنبہ ۲۲ مارچ) ۱۱۶۰ھ میں تخت نشین ہوا تھا اس کی تہنیت میں ہمارا شاعر ایک قصیدہ پیش کرتا ہے۔ راحت الصدور (ص ۲۷۵) کے الفاظ ہیں:

سلطان سلیمان در دوازدہم ربیع الاول سنہ خمس و خمسین و خمس مایۃ بہ دارالملک ہمدان رسید و بر تخت سلطنت نشست و بہ پادشاہی پیوست، و سید اشرف (حسن) بہ تہنیت در حضرت این قصیدہ روزِ بار برخواند بہ حضور امرای دولت، قصیدہ۔

شاہِ شاہانِ جہان بر تختِ سلطانی نشست

مردمِ چشمِ سلاطین در جہان بانی نشست

منت ایزد راکہ در صدرِ خراسان و عراق

ہم خداوندِ عراقی ہم خراسانی نشست

منت ایز را جہان چو روضۂ فردوس گشت

وین فلک قدر و فلک قدرت بہ رضوانی نشست

مردم و دیو و پری اکنوں بہ خدمت ایستند

چون سلیمان شاہ بر تختِ سلیمانی نشست

چشم رعنائی بدوزند اخترانِ روز کور
خسروِ سیارہ چون بر اوجِ کیوانی نشست

پای قدرش از سر افلاک جسمانی گذشت
مہر مہرش بر دل پاکانِ روحانی نشست

پیشِ حزمش باد در بالا بہ واجب ایستاد
پیشِ عزمش کوہ در پستی بہ نادانی نشست

رسمِ باطل زود بر خیزد چو رای پادشاہ
نوبتِ حق پنج فرمودہ بہ سلطانی نشست

ای بر ایوانت شدہ کیوانِ ہندو پاسبان
ماہِ رومی بردرِ بارت بہ دربانی نشست

بخت چون بر تخت دیدت تہنیتہا کرد و گفت
ایکہ بر تختِ جہان داری تو می دانی نشست

چون جہان داران کمر بربند و عالم می کشای
وقتِ کار آمد کنون بی کار نتوانی نشست

زابرِ کف بارانِ رحمت بر مسلمانان ببار
ہین کہ گرد کفر بر روی مسلمانی نشست

لیکن سلیمان شاہ کی سلطنت دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ بلکہ اسی سال وہ ماہ رمضان ۵۵۵ھ (ستمبر ۱۱۶۰ء) میں تخت سے اتار دیا گیا اور قید کر دیا گیا۔ جہاں وہ اگلے سال قضا کر گیا۔ غرض کہ تقریباً چھ ماہ کی یہ سلطنت جو انتشار سے پُر تھی ایسی نہ تھی کہ ہمارا شاعر کچھ عرصے تک مدح سرائی کرتا اور اپنا پیٹ پالتا۔ اور خود ممدوح کو بھی لہو و لعب سے کب فرصت تھی کہ قصیدے سنتا چنانچہ ہمارے شاعر کے یہاں مذکورہ بالا قصیدے کے علاوہ کوئی اور کلام اس کی مدح میں نہیں ملتا۔ اور اب ہم شاعر کی زندگی کے بالکل آخری دور میں آگئے ہیں۔

شاعر کی وفات

دولت شاہ (ص ۱۰۵۔ براؤن ایڈیشن) لکھتا ہے کہ "...... سلطان مسعود در اکرام و اعزاز سید مبالغہ بسیار نمودہ و مھہ ء زر اندودہ تربیت کردہ سید را بہ طرف غزنین روان ساخت، چون سید بہ ولایت جوین رسیدہ در قصبہ آزادوار فجاۃً بہ جوارِ رحمتِ ایزدی انتقال کرد فی شہور سنہ خمس و ثلثین و خمس مایہ واکنون تربتِ شریف سید حسن در قصبہ آزادوار مذکور است و معروف......"

شاعر کے انتقال کا یہ مقام سب سے پہلے دولت شاہ کے یہاں ملتا ہے اس کے بعد مختلف تذکروں میں اسی کی نقل ہے جن کا تذکرہ تحصیل حاصل ہے۔ دولت شاہ کی مذکورہ بالا عبارت سے تین باتیں معلوم ہوتی ہیں کہ:

۱۔ سلطان مسعود سلجوقی نے انعام واکرام کے ساتھ شاعر کو غزنین کی طرف روانہ کیا۔

۲۔ سلطان مسعود کے عہد کی روایت سے شاعر کے انتقال کا سال ۵۳۵ھ بتایا گیا ہے۔

۳۔ شاعر جب جوین کے قصبہ آزادوار کو پہنچا تو اسے مرگِ مفاجات سے دوچار ہونا پڑا۔

پہلی بات تو اس طرح غلط ثابت ہو جاتی ہے کہ شاعر نے سلطان مسعود کے انتقال پر مرثیہ لکھا تھا اس سے ظاہر ہے کہ اس کی زندگی میں وہ روانہ نہیں ہوا ہوگا۔ اور اسی لئے اس کے انتقال کا سال ۵۳۵ھ بھی غلط ہے کیونکہ وہ تو کم از کم ۵۵۵ھ تک زندہ تھا جبکہ اس نے سلطان سلیمان سلجوقی کی تخت نشینی پر قصیدہ لکھا تھا۔ اب صرف تیسری بات رہی یعنی اس کا قصبہ آزادوار میں وفات پانا۔ تو یہ ممکن ہے اور اسی سلسلے میں ہم کو پھر شاعر کے شاگرد کے اس مقدمے کو دیکھنا چاہئے۔ انڈیا آفس کے مخطوطہ نمبر ۹۳۱ کے ساتھ ہے۔ شاگرد لکھتا ہے۔

...... در حالِ ارتحال وصیّت فرمود کہ اشعارِ تازی و پارسی و انواع تصانیف مرا بنام بادشاہ عالم...... شمس الملوک...... ابوالقاسم محمود بن محمد بن بغرا خان، یمین امیر المومنین خلد اللہ ملکہ ...... جمع کنند...... پس بحکم اشارت این بزرگوار ...... حالا اشعارِ لطیف او را بنام جمشیدِ سریرِ سیادت و خورشیدِ آسمان سعادت جمع کردہ آمد...... و مدد دہند تا باقی تصانیف او را بہ قوت

ایشان بر حکم وصیّت آن شہید جمع شود و بہ ارباب فضیلت رسد کہ حقوق دینی و دنیاوی بیست سالہ وی در ذمتِ من است و مدتی مدید بود تا این ضعیف از فرطِ ولای آن شہید بہ غربت در خدمت او غربت را بر قربتِ اقاریب اختیار کردہ بود و مولد و منشار او داع نمودہ' اکنون عزیمت مصمّم است کو بقیّت عمر در خدمتِ تربت و نشر فضل و منقبتِ او گذارد و بہ جمع تالیفات و بہ شرحِ تصنیفاتِ او مشغول باشد......

اس عبارت میں "در حالِ ارتحال وصیّت فرمود" سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو مرگِ مفاجات سے دور ہونا نہیں پڑا جیسا کہ دولتشاہ کے اقتباس مذکورہ بالا سے معلوم ہوتا ہے۔اب رہا قصبہ آزادوار میں شاعر کا انتقال' تو یہ بعید بھی نہ ہوگا۔کیونکہ میرا خیال ہے کہ شاگرنے جو بار بار شہید کہا ہے وہ غریب الوطنی کی موت ہی کی وجہ سے کہا ہوگا ورنہ کسی اور وجہ سے موت ہوئی ہوتی تو در حال ارتحال کے سلسلہ میں کچھ کہتا اور ان الفاظ سے کہ "آن مخدوم در ایّام خود از طلبِ دیگر علوم بجمع سخنانِ خود نہ رسیدی......" ظاہر ہوتا ہے کہ "علوم کی طلب" (یعنی مدح گوئی کی اچھی توجیہ ؟) کے دوران میں انتقال ہونے کی وجہ سے "ذو الشہادتین" بھی کہا ہے جیسا کہ ہم شروع شروع میں بیان کر چکے ہیں۔ بہر حال اگر قصبہ آزادوار میں انتقال ہوا ہوگا تو ہمدان سے (جہاں کہ وہ سلیمان سلجوقی کی مدح سرائی کر رہا تھا) واپسی پر ہوا ہوگا۔کیونکہ وہیں سے وہ مقام قرب بھی ہے اور راستے میں بھی پڑتا ہے۔حمد اللہ مستوفی کی نزہت القلوب (ص ۱۹۲۔بمبئی) سے معلوم ہوتا ہے کہ جوین کی مغربی سرحد (اسفرائن کے جنوب و مشرق میں) جاجرم اس طرح واقع ہے کہ بسطام سے سات فرسخ پر مغز ہے وہاں سے سات فرسخ دیہ سلطان ہے۔وہاں سے تین فرسخ پر رباط سونج اور وہاں سے چھ فرسخ پر جاجرم ہے۔جاجرم سے آٹھ فرسخ (۱۳۱) پر قصبہ آزادوار ہے۔اب شاعر کے انتقال کی تاریخ بھی محدود کی جاسکتی ہے۔اوپر کے اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو القاسم محمود خان بن محمد خان کی زندگی ہی میں شاعر کا انتقال ہوا۔بلکہ محمود کی زندگی ہی میں شاعر کا یہ کلام بھی مرتب ہو چکا تھا۔جبھی تو شاگرد نے محمود خان کو "خلد اللہ ملکہ" دعائیہ فقروں

سے یاد کیا ہے محمود کی تاریخ وفات مجمل فصیحی (ق ۱۶۸' ب۔ بانکی پور) میں ۵۵۸ھ ۱۱۶۳ء ہے۔ گو کہ روضۃ الصفا (جلد چہارم۔ ص ۱۱۳' ۱۱۴' لکھنو' ۱۹۱۶) میں لکھا ہے کہ محمود خان نے سلطان سنجر کے انتقال (۵۵۱ھ۔ ۱۱۵۶ء یا ۵۵۲ھ۔ ۱۱۵۷ء) پر (۱۳۲) ساڑھے پانچ سال حکومت کی۔ یعنی زیادہ سے زیادہ ۵۵۷ھ۔ ۱۱۶۳ء تک۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ بادشاہت کے اختتام ۵۵۷ھ۔ ۱۱۵۷ء کے بہت پہلے شاعر انتقال کر چکا تھا بلکہ اس کا دیوان بھی مرتب ہو چکا تھا۔

اب دوسری طرف آیئے ہم راحت الصدور (ص ۲۷۵) دیکھ چکے ہیں۔ کہ سلطان سلیمان سلجوقی کی تخت نشینی پر یعنی ۱۲ ربیع الاول ۵۵۵ھ (سہ شنبہ ۲۲ مارچ ۱۱۶۰ء) میں سید حسن نے یہ قصیدہ تہنیت پڑھا تھا۔

شاہِ شاہانِ جہان بر تختِ سلطانی نشست
مردمِ چشمِ سلاطین در جہان بانی نشست

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر ۵۵۵ھ۔ ۱۱۶۰ء تک ضرور زندہ تھا۔ لیکن اوپر دیکھ چکے ہیں کہ ۵۵۷ھ۔ ۱۱۶۳ء کے پہلے انتقال کر چکا تھا۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ اس کا انتقال ۵۵۶ھ۔ ۱۱۶۱ء میں ہوا اور یہ تاریخ اس لئے زیادہ قرین قیاس ہے کہ مجمع الفصحا (ج ۱۔ ص ۱۹۲) مراۃ الخیال (ص ۴۶۔ ۱۸۳۱) آتشکدہ (ص ۹۱۔ بمبئی) ید بیضا (ص ۴۸' نسخہ دفتر دیوانی و مال' حیدر آباد) فہرست انڈیا آفس (جلد دوم۔ ص ۶۴۰) وغیرہ میں شاعر کی وفات کا سال ۵۶۵ھ ہے جو اغلب ہے کہ ۵۵۶ھ سے بدل گیا ہو۔ بہر حال ۵۵۶ھ۔ ۱۱۶۱ء ضرور صحیح ہو گا۔

غزنین میں مزار

آج کل بھی غزنین میں مشہور ہے کہ شاعر کی نعش بعد میں جوین (آزاد وار) سے کھدوا کر لائی گئی اور اسی کے ساتھ ساتھ شہر کے دو طرف ایک کشادہ سڑک ہے۔ اس

سڑک کے کنارے شہر کے جنوب و مشرق میں سید حسن کا مزار موجود ہے اور قبر کے کتبے کی عبارت یہ ہے:

............ھواللہ تعالیٰ شانہ............

در عہدِ سلطنتِ قوی مکنت اعلیٰ حضرت معدلت آئین سراج الملت والدین امیر حبیب اللہ خان، مرزا غلام حسین ابن مرحوم میر حسن علی برجندی قوم عرب آن خدیمہ کہ یکے از متخد مین دولت بہ سر شتہ داری دفتر غزنین مامور بود در تاریخ ۱۳۲۲ھ بود کہ این بقعۂ متبر کہ کہ منہدم سپاہ ہلاکو بودہ (۱۳۳) بہ اشارۂ صاحبِ مرقدِ مبارک خالصاً للّٰہ تعالیٰ از مالِ خود در احیای مواد دادہ۔ مجمٰی کہ در بابِ احوالِ نور اللہ مرقدہ از کتب اخبار مستفسار گردیدہ این است کہ جناب سلالتہ السادات سید حسن غزنوی علیہ الرحمہ معاصر سلطان بہرام شاہ مغفور بود۔ ہم در آں عصر اتفاقاً شرفِ پای بوسی روضۂ مبارک جدِّ امجد بزرگوار خود را حاصل داشتہ ترجیع مبنی بر نعتِ حضرت سالار انبیاً کہ از زادۂ طبع خود بودہ بہ عرض رسانیدہ کہ مقطع آن این است:

لافِ فرزندی نیارم زد و لیکن ای حبیبؐ
مدحتی گفتم ز حضرت خلعتی بیرون فرست۔

دستی از قبر متبرکہ بیروں آمد باحلہ، آوازی مسموع شدہ کہ خذیابنی............"

خلیل اللہ خلیلی نے بھی "احوال و آثارِ حکیم سنائی" (ص ۵۸) میں سید حسن کی نعش کے لائے جانے کا ذکر کیا ہے لیکن کوئی سند پیش نہیں کی۔ پورے آٹھ سو سال گذر جانے کے بعد اب بھی افغانستان کے لوگ سید حسن غزنوی کو اپنے لئے ایک قابل فخر ہستی سمجھتے ہیں۔ اور شاید یہی عقیدت ہے کہ جس کی بنا پر کم و بیش چودہ غزلیں اس سے منسوب کرتے ہیں۔ گو کہ مجھے یقین ہے کہ وہ غزلیں اس حسن کی نہیں ہیں بلکہ کسی بعد والے حسن کی ہوں گی کیونکہ ہر غزل کے مقطع میں التزاماً حسن تخلص موجود ہے۔ جیسا کہ اس عہد میں عموماً نہیں تھا۔ دوسرے یہ کہ زبان بھی بعد کی معلوم ہوتی ہے۔ نمونہ کے لئے ایک پوری غزل

پیش کی جاتی ہے۔

مرا عشقِ نگاری خوار کردہ ست
چہ گویم عشق ازین بسیار کردہ ست
دلی بی عشق در عالم مبادا
مرا این چند در دل کار کردہ است
بفضلِ حق عجب آسان بود عشق
غم ہجرش چنین دشوار کردہ ست
فغان ہر لحظہ از دستِ رقیبان
رہِ عشاق را پُر خار کردہ ست
اگر یا بم دمے وصل تو ای جان
فلک بختِ مرا بیدار کردہ ست
گدای کوی خود گردان حسن را
کہ جان در کوی تو درکار کردہ ست

اس کے علاوہ تیرہ غزلیں اور ہیں جو اسی سید حسن سے منسوب کی جاتی ہیں ہم یہاں صرف مطلع لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں:

ای مہِ نازنینِ من بہرِ خدا بیا بیا
ای شہِ جان نشینِ من بہرِ خدا بیا بیا
کجائی ای می و مطرب خدا را
کہ ہجران سوخت جانِ این گدا را
بنما مرا جمالت ای نازنین خدارا
کہ بیادِ وصلِ رویت نہ کند دلم مدارا
مرا عشقِ نگاری خوار کردہ ست
چہ گویم عشق ازین بسیار کردہ است

گر نه می سوزد دلش این آه و این فریاد چیست
آتشی گر نیست در کاشانه این بیداد چیست
ای شاهِ شاهان فریاد فریاد
ای ماهِ تابان فریاد فریاد
ای گُلِ خندانِ من یک دم بخند
ای مہِ تابانِ من یک دم بخند
نہ دارد زمانہ بقائے بہ کس
چہ درخواب نازی تو ای بوالہوس
بیا ای دلبرا بنگر بسویم
کہ ہجرت سوخت جانم راچہ گویم
فتد اندر، دلم ہر لحظہ آتش
چو یادت آورم ای ماہِ دلکش
بیا ای دیدہ تا یک دم بگریم
بہم با خوش دل و خرّم بگریم

بہ ہر دم ہزاران درود و سلام
زما بر روانِ تو ہر صبح و شام (نعت)
الا ای دل ربای نازنینم
جمالِ خود نما تا من بینم
منِ سرگشتہ دل داری نہ دارم
بہ دردِ ہجر غم خواری نہ دارم

یہ چودہ غزلیں جو ہمارے کسی نسخے میں نہیں ہیں کابل اور غزنین کے مختلف ''ادبا''
سے حاصل ہوئی ہیں اور انھیں دعویٰ ہے کہ یہ سب کی سب ہمارے سید حسن کی ہیں لیکن

افسوس ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض غزلیں جن کا قافیہ تک ٹھیک نہیں ہے اور جن پر یہاں بحث کرنا گویا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے ایسے بڑے شاعر سے منسوب کی جاتی ہیں جس کی سند لغات میں لی جاتی ہے۔ جس کی تقلید بڑے بڑے شعرا نے کی ہے اور جس کی خود اس کے عہد میں مختلف اہلِ کمال نے قدر کی تھی۔

کلام حسن کی اہمیت

کتب لغت میں شواہد

ہم یہاں اب اس کا ایسا کلام نقل کرتے ہیں جو مختلف لغات میں بطور سند کے لیا گیا ہے اور اس سے شاعر کی اعلیٰ قابلیت اور مقبولیت کا پتہ چلتا ہے۔ اس میں ضرور یہ اوصاف تھے ورنہ ہر شاعر کا کلام لغات کے لئے مستند نہیں سمجھا جاتا۔

منشی محمد پادشاہ کی مشہور لغت "فرہنگ آنندراج" میں سید حسن غزنوی کا کلام مختلف مقامات پر بطور سند کے موجود ہے۔ (اس لغت کے اندراجات قریباً سب کے سب اور لغتوں سے ماخوذ ہیں اور ان کا حوالہ مولف نے ساتھ ساتھ دیا ہے......)

جلد اول۔ صفحہ ۳۲۴ میں یہ شعر ہے:

ناوردهٔ برون چو منی در ہزار سال
اینک تو ایدری فلکا و من ایدرم

(بہرام شاہ کی مدح والا قصیدہ)

صفحہ ۵۰۸ میں یہ شعر ہے:

اگرچہ مشک شوم بوی من ہمی نہ کشد
بوی آن کہ زمن بہتری مگر یابد

(احمد عمر خازن کی مدح کا قصیدہ)

صفحہ ۵۶۵ میں یہ شعر ہے:

بید بر پردۂ بلبل زطرب سر جنبان
سرو بر نغمۂ قمری ز فرح دست زن است

(خالد مالکی کی مدح کا قصیدہ)

صفحہ ۸۴۸ میں یہ شعر ہے:

سپاہِ غور ہم کور است خواہی باہمہ کری
چو آتش نیزہ زن بودند، ہمچو آب جوشن در

(بہرام شاہ کی مدح والا قصیدہ)

صفحہ ۸۷۸ میں ایک رباعی ہے:

ای سر تا پا بہ نازکی سرو سہی
از جملۂ نیکوان بہ خوبی تو بہی
بر حسن و جمال بیش می افزاید
چشم آر ورا چو خاک بر روی نہی

جلد دوم صفحہ ۳۲۴:

کشادہ صورتِ دولت بشکرِ شاہ دہان
چو بست زیورِ اقبال بر عروسِ جہان

(بہرام شاہ والا قصیدہ)

صفحہ ۴۲۴:

نادیدہ دہانت کہ گمان کرد کہ ہرگز
خوش تر ز شکر کوزہ بود سفتِ سفالی

(خسرو شاہ بن بہرام شاہ کی مدح)

صفحہ ۵۶۷:

(تیغِ تو رنگ ریز و ضمیرِ تو نقش بند)
خلقِ تو گل فروش و زبانت شکر گراست

(خسرو شاہ بن بہرام شاہ کی مدح)

صفحہ ۸۸۸:

بدان کہ فتنہ نہ خسپد درین زمانہ ولیک
ز عدلِ تست کہ باری شدہ ست در فرناس

(بہرام شاہ کی مدح)

جلد سوئم صفحہ ۸۹:

زان تابلی سفید کند ہر سیہ زبان
دردا کہ چون زبانِ قلم گشت دفترم

(بہرام شاہ کی مدح)

صفحہ ۸۳۸

درآن زمانکہ قبای سیاہ پوشیدی
یکی بگوی چہ ماند دو ہفتہ ماہ ترا

(تغری طغان بیگ کی مدح)

مصطلحات الشعرا نول کشور پریس کان پور ۱۳۱۶ھ۔۱۸۹۸ء

صفحہ ۱۴۰:

بعمر چند نہادہ ست یک شب روی برر ویم
بر آنم تا کنم یک روز جانِ خویش درجانش

(بہرام شاہ کی مدح)

فرہنگ جہانگیری لکھنو ۱۸۷۶ء جلد اول صفحہ ۸۱:

شخصم چو موی گشتہ عجب تر مگر کہ کرد
اشکم چو چشم چشمۂ آموی موی او

(ابراہیم بن حسن کی مدح کا ترکیب بند)

صفحہ ۱۵۵:

شاہا نعالِ خنگِ تو ہر ماہ ماہ باد
اقبال را بہ پیش تو صد راہ راہ باد

(ابراہیم بن حسن کی مدح کا ترکیب بند)

صفحہ ۴۷۹ میں وہی رباعی ہے:

اے سر تا پا بہ نازکی سرو سہی
از جملہ نیکوان بہ خوبی تو بہی
بر حسن(۱۳۴) و جمال بیش می افزاید
چشم آر ورا چو خاک بر روی نہی

(فرہنگ آنندراج جلد اول صفحہ ۸۷۸)

سعد الدین وراوینی کے مرزبان نامہ (چاپ اروپاص ۸۸) میں سید حسن کا یہ شعر ملتا ہے۔

روزی نگر کہ طوطیِ جانم سوی لبت
بر بوی پستہ آمد و بر شکر او فتاد

سند بادنامہ، المعجم فی معاییر اشعار العجم اور راحت الصدور میں سید حسن کے متعدد اشعار ہیں۔

ہندوستان اور سید حسن

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ ہمارا شاعر ۵۱۳ھ۔۱۱۱۹ء میں بہرام شاہ کے ساتھ ہندوستان آیا تھا اور کچھ دن اس نے قیام بھی کیا تھا بلکہ یہاں اس نے والی ہند ابراہیم بن حسین علوی سے تربیت بھی حاصل کی تھی۔ چنانچہ اس تعلق کی یادگار میں ہم کو دو چیزیں ملتی ہیں۔

(۱) سید حسن کے کلام میں ہندوستانی الفاظ اور (۲) سید حسن کے کچھ کلام کی ہندوستان میں مقبولیت۔ ہم پہلے سید حسن کے یہاں بعض ہندوستانی الفاظ کا استعمال بتاتے ہیں اور اس سلسلے میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہماری زبان اردو کی داغ بیل گو کہ عربوں اور ہندیوں کے میل جول سے پڑ چکی تھی لیکن با قاعدہ اس کا سلسلہ غزنویوں کے عہد سے چلتا ہے۔ جبکہ ہندوتانی لونڈی غلام بکثرت غزنین گئے اور غزنین کے لوگ یہاں آئے۔ پروفیسر محمود شیرانی صاحب نے "پنجاب میں اردو" میں بتایا ہے کہ کس طرح ہمارے الفاظ فارسی شعرا کے کلام میں جگہ پا چکے تھے۔ ہم نے بھی اپنے مضمون فارسی پر "اردو کا اثر" (معارف فروری تا مارچ ۱۹۴۱ء) میں فارسی کے متقدمین اور متوسطین شعرا وغیرہم کے کلام سے ہندوستانی الفاظ جمع کئے ہیں۔ یہاں ہم صرف اپنے شاعر کے کلام سے بعض ایسے الفاظ پیش کرنا چاہتے ہیں۔

ایک لفظ "بیلک" ہے جس کے متعلق پروفیسر شیرانی صاحب نے (پنجاب میں اردو ص ۲۹۔۳۰) "شرف نامہ" کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ ایک قسم کا ہندوستانی تیر تھا۔ ہمارا شاعر کہتا ہے:

زبیلک فتنہ را کردند ہمچون خارِ پشت اکنون
نمی داند کہ در عالم کجا و چون کند سر بر

(بہرام شاہ کی مدح والا قصیدہ)

کوشید چو بیلک ز دلش نیش چو بگذشت
تاریک شد آن دیدۂ خیرہ نگر شیر

(بہرام شاہ کی مدح

ایک لفظ "چندن" یعنی "صندل" ہے جو بغیر معرب یا مفرس ہوئے ملتا ہے۔

درد سرم مباد کہ بر بایدم طلی
باید ز مہ گلاب و ز خورشید چندنم

(۵۴۵ھ والا قصیدہ)

ز ہر تن فضل راست تریاک
درد سر آز راست چندن

(نصر اللہ بن محمد کی مدح)

"فوّارہ" اگر عربی (مثلاً وفار التنوّر۔ قرآن مجید) نہیں ہے اور بقول صاحب غیاث اللغات وہ ہندوستانی "پھوار" کا مفرس ہے تو وہ بھی سید حسن کے یہاں ملتا ہے:

گر درین باغ بہشت آسای جوی می نہ رفت
یاسمن راچیست پس فوّارہ می گوں آمدہ

(بہرام شاہ کی مدح والا قصیدہ)

یاسمن چون شدہ فوّارۂ می
جوی می باید راندن بہ چمن

(حسن بن احمد کی مدح)

بر عزم گریہ سوی دو فوّارۂ سرشک
آتش ز چشمۂ جگرم ہم بر آمدہ

(غزل)

ایک لفظ قرنفل ہے جو کرن پھول کا مفرس ہے:

خورشید گل فروش و مہ لالہ پوش را
در بندِ مشک و دامِ قرنفل فگندہ

(حسین بن حسن کی مدح والا ترجیع بند)

ایک رباعی میں یہی لفظ ہے:

بر بوی کہ از مشک و قرنفل شنوی
از دولت آن زلف چو سنبل شنوی
چون نغمۂ بلبل ز پیِ گل شنوی
گل گفتہ بود ہرچہ ز بلبل شنوی

یہ تو ہندوستانی الفاظ کا استعمال تھا۔ اب ہمارے شاعر کے کلام کی مقبولیت اپنے ملک میں دیکھئے۔ ہمارے یہاں کس کو معلوم ہے کہ یہ شعر سید حسن کا ہے:

مہ نورمی فشاند و سگ بانگ می زند
مہ راچہ جرم خاصیتِ سگ چنان فتاد(۱۳۵)

یہ شعر بہرام شاہ کے وزیر حسن بن احمد کی مدح والے قصیدے میں ہے جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔ اسی طرح سے ہمارے یہاں میلاد کی محفلوں میں سید حسن کا یہ شعر اکثر پڑھا جاتا ہے:

سلموا یا قوم بل صلوا علی الصدر الامین
مصطفیٰ ماجآء الّا رحمۃ للعالمین (۱۳۶)

یہ ترجیع یا تضمینی شعر اس ترجیع بند کا ہے جو شاعر نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں پیش کیا تھا۔

شاعر کی اپنے زمانے میں قدر

۱۔ سید حسن نے ایک قصیدہ جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں بہرام شاہ کی تخت نشینی پر لکھا تھا۔ اس کا مطلع یہ ہے:

منادی بر آمد ز ہفت آسمان
کہ بہرام شاہست شاہِ جہان

طبقات ناصری کے انگریزی ترجمے (راورٹی۔ ص ۱۱۱ح ۱) سے معلوم ہوتا ہے کہ بہرام شاہ کے ایک سکے پر جو مضمون کندہ تھا اور جس کا انگریزی ترجمہ راورٹی نے دیا ہے بالکل مذکورہ بالا شعر کا ہم معنی تھا۔ اگر سید حسن کا یہ شعر بہرام شاہ کے سکے پر کندہ تھا تو ہم کو یہ کہنا پڑے گا کہ شاید اتنی قدر کسی اور شاعر کی کبھی نہیں ہوئی تھی۔

۲۔ خلیل اللہ خلیلی نے "احوال و آثار حکیم سنائی" (۱۳۱۵/۵۸) میں لکھا ہے کہ سنائی نے "کارنامہ بلخ" میں یہ اشعار اسی سید حسن کے متعلق لکھے ہیں:

شاخ دیگر جمال دین حسنی
آن چون نامِ خود از نکو سخنی
سیدی خوب روی و پاکیزه
سخنش هم چو غیب دوشیزه
قوتِ نظم و نثرش از نسب است
زان که از شاخ افصح العرب است

۳۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ایک "صاعد" ابو بکر بن حیدر کرمانی نے جو شاعر بھی تھا سید حسن کی مدح اور جواب میں یہ قطعہ بھیجا تھا:

به من سید حسن زینِ زمانه
ز دل تحفه غذای جان فرستد
بدان نظمِ بدیع و نثر رایق
تو گوی معجزِ فرقان فرستد
ولیکن مدتِ بسیار دارم
که می درد مرا درمان فرستد
مراین مشتاق و مهجور حزین را
شفا زان لفظ دُر افشان فرستد

شراب از مایۂ کوثر رساند
نسیم از روضۂ رضوان فرستد
جوابِ آن فرستادن کہ داند؟
مگر زندہ شود حسّان فرستد
خرد نپسندد از طبعِ من ارچہ
بضاعت زیرہ از کرمان فرستد

۴۔ خالد مکی کے متعلق جو قصیدہ منقول ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بھی سید حسن کی مدح میں کچھ اشعار لکھے ہوں گے گو کہ وہ اشعار ہمیں نہیں مل سکے۔ سید حسن نے اس قصیدے میں کہا ہے:

خالدِ مالکی آن صدر کہ خالد بہ بہشت
ہمچو رضوان ز نسیم کرمِ خویشتن است
پرتوِ خاطرِ اوطبع مرا قوت داد
خہ خہ ای خاطر چون تیغ کہ آن عکس من است
بہ قبول سخنش یک سخنم را صد کرد
گرچہ دانست کہ در ہر سخنم صد سخن است
مادحِ او من و او مدح فرستد عجب است
عشق بر بلبل و گل چاک زدہ پیرہن است
آمد ار کار ثنای تو مثمن چو بہشت
گرچہ شعر تو مسدس چو نجوم پرن است

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خالد مالکی نے بھی سید حسن کی مدح میں اشعار لکھے ہوں گے۔

۵۔ روحانی غزنوی نے اپنے طویل "سوگند نامے" میں (جو بہرام شاہ اور اس کے

وزیر حسین ابن حسن کی مدح میں ہے اور جس پر ہم تاریخ بہرام شاہی میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں) اپنے عہد کے بعض شاعروں کا تذکرہ کیا ہے ان میں سید حسن بھی ہے جس کے متعلق روحانی کہتا ہے:

حسن کہ آئینۂ نور و نفسِ ناطقۂ اوست

از و چگونہ برم گوی نطق درمیدان

اور اسی "سوگندنامے" میں حسن کی سرگردانی اور پریشانی حال کو اس طرح بیان کرتا ہے:

یکے از ایشان پنجک ستان و پنبہ فروش

کہ کرد گردش چرخش چو چرخ سرگردان

یہ شعر دراصل شروع میں ہے جہاں کہ روحانی نے اپنے معاصرین کے کلام کی تذلیل کی ہے اور بعد میں انھیں کی تعریف کی ہے جس میں سے اوپر والا شعر (حسن کہ آئینہ نور............الخ) بھی ہے۔

۶۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ۵۴۷ھ۔ ۱۱۵۲ء میں جب بہرام شاہ دوبارہ غوریوں کے زوال پر غزنین کا حکمران ہوا تھا تو یہ خبر سن کر ہمارے شاعر نے ایک قصیدہ لکھا تھا جس کا مطلع یہ تھا:

آخر دلم بہ آرزوی خویشتن رسید

و آنچ از خدای خواستہ بودم بہ من رسید

لباب الالباب (جلد اول صفحہ ۵۹) میں الملک المعظم پیغو ملک حسن بن علی (ظاہراً از ملوک الطوائف خانیہ ماوراءالنہر است۔ چہ ایشان بعد از استیلاء قراخطائیاں در ماوراءالنہر از حدود سنہ ۵۳۰ تا ۶۰۶ منقسم شدہ بودند بہ ملوک صفار بسیار و ہر ناحیہ کوچکی در دست یکی از ایشان بود از جانب قراخطا (حواشی لباب الالباب ص ۳۰۴۔۳۰۵) کے دو شعر یہ ہیں۔

جستم برای فال کتابی و ناگہان

دستم بہ بحر گوہر سید حسن رسید

باصد زبان چگونہ توان گفت شکرِاین

کانچ ازخدای خواستہ بودم بہ من رسید

ان اشعار میں سید حسن کا ذکر ہے اور اس کا مصرع آخر وہی ہے جو سید حسن کے مذکورہ بالا مطلع میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ان اشعار کی تلمیح (جس کے متعلق فاضل مرتب نے کوئی رائے نہ دی تھی) اب واضح ہوگئی اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ یہ بادشاہ پیغو ملک ۵۴۷ھ۔ ۱۱۵۲ء کے بعد ہی حکمران رہا ہوگا۔ کیونکہ اس سال شاعر نے وہ قصیدہ لکھا تھا نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے شاعر کے کلام کی شہرت دور دراز مقامات (مرغینان و کاشان ماوراء النہر جہاں کہ پیغو ملک تھا) تک پھیلی ہوئی تھی اور اس کی قدر کی جاتی تھی۔ گو کہ یہ بھی صحیح ہے کہ دربار کی رسائی کی وجہ سے وہ زمانہ حاسدوں سے بھرا ہوا تھا۔ (۱۷۳)

ان کے علاوہ دیوان کے مقدمے میں شاگرد کے توصیفانہ کلمات اور قریب العہد مولف راحت الصدور (ص۔ ۲۰، ۲۱، ۴۹، ۵۷، ۵۸، ۱۸۷، ۱۸۹، ۱۹۲، ۱۹۳، ۲۴۵، ۲۵۱، ۲۷۵، ۳۱۳ وغیرہا) کا شاعر کو بار بار یاد کرنا ظاہر کرتا ہے کہ شاعر کی اپنے زمانے میں کافی قدر تھی اور اس کا کلام بھی بے شک قابل قدر تھا۔ تبھی تو ڈاکٹر محمد اقبال صاحب نے اسے (راحت الصدور دیباچہ ص ۱۱) فارسی کے بزرگ ترین شعرا میں شمار کیا ہے۔ متعدد معاصرین اور مقلدین نے اس کے قصیدوں پر قصیدے لکھے ہیں لیکن ہم پہلے ان اکبر شعرا کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں جن کی تقلید ہمارے شعرا نے کی ہے۔

دوسرے شعرا کی تقلید

ہمارے شاعر نے دوسرے شعرا کی تقلید میں جو کچھ لکھا ہے اس کا بھی کچھ تذکرہ کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ اور اس قبیل میں مسعود سعد سلمان (م ۵۱۵ھ) کا نام پہلے آتا ہے۔ مسعود کا ایک قصیدہ ہے:

که وداع بت من مرا کنار گرفت
بدان کنار دلم ساعتی قرار گرفت
وصال آن بت صورت همی نه بست مرا
بدان زمان که مرا تنگ در کنار گرفت
چو وصل او را عقل من استوار نداشت
دو دست من سر زلفینش استوار گرفت
بر ویش اندر خندان نگاه کر دم تیز
که دیده ام همه دیدار آن نگار گرفت
نه دیر بود که برخاست آن ستوده خصال
برفت و ناقهٔ جمازه را مهار گرفت
برو نشست وبجست او ز جای خویش چو دیو
بقصد غزنین هنجلدره گزار گرفت
قطار بود دمادم گرفته راه به پیش
کلنگ وار بره بردم و قطار گرفت
درین میانه بغرید کوس شاهنشه
زبانگ او همه روی زمین هوار گرفت (۱۳۸)

اس قصیدے میں تشبیب کافی اچھی ہے اور رنگینی بھی پائی جاتی ہے عاشق کی بے قراری کا نقشہ ہے۔ اور گریز میں بڑی برجستگی ہے۔ سادہ ہے لیکن جدت ہے اب سید حسن کا قصیدہ دیکھئے:

زمانه دامن اقبال شهر یار گرفت
سعادتش به دل و دیده در کنار گرفت

ظفر بہ ہمت روی ظفر جمال نمود
جہان بہ دولت شاہِ جہان قرار گرفت
یمینِ دولت و دین و امینِ ملت و ملک
کہ آرزو زیمینش رہِ یسار گرفت
ابو المظفرِ بہرام شاہ بن مسعود
کہ زرّ خورشید ازرای او عیار گرفت
جبین خورشید ازیمن نام او بر چرخ
بہ داغ بہر ام اندر ازل نگار گرفت
گرفت شہپرِ سیمرغ نفرت از منقار
چو بامِ چتر رفیعش رہِ شکار گرفت
فراخ سال عطا ہا چو بر کف او بنمود
چو حرص را ہوسِ جود تنکبار گرفت
مراد ہا کہ ازو آرزو ہمی یابد
چو آرزو ست کہ نتوانش درشمار گرفت
کنون زغنچۂ اقبال بشگفد گل بخت
چو عالم از نظرش رونقِ بہار گرفت (۱۳۹)

اس میں شک نہیں کہ اس کی تمہید اچھی نہیں ہے اور تشبیب ہی نہیں ہے تو رنگینی اور لطافت کا ذکر ہی کیا؟ لیکن شاعر نے تشبہات واستعارات میں اپنے قوت تخلیل سے جو ندرت اور جدت پیدا کی ہے اور خصوصاً ایسے عہد میں جبکہ اس کی شاعری کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا جیسا کہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں) وہ قابل داد ضرور ہے۔ اشعار ۵ تا ۸ سراسر اس کے حسن تخئیل کے گواہ ہیں اور اس کی دقت نظر پر دال ہیں۔

۲۔ پھر معزی (۵۴۲ھ۔۱۱۴۷ء) کا نام آتا ہے۔ معزی کا ایک قصیدہ (انتخاب

شعرائے متقدین نمبر ۳ق۔۶۷۵ب حمیدیہ بھوپال) اس طرح شروع ہوتا ہے:

به فالِ فرخ و عزمِ درست ورای صواب
سفر گزیدم و کردم سوی رحیل شتاب
بدان قضا چو رضا دادم اندر آن ساعت
نشتم از بر دیو جهنده همچو شهاب
گهی شتاب چو صرصر گهی درنگ چو کوه
گهی فراز کبوتر گهی نشیب عقاب
سپهر چون کفِ قلاب و اندر و کیوان
به گونهٔ درمِ قلب در کفِ قلاب
بهشت بود سپهر و مجرّه جوی بهشت
بزرگ و خورد کواکب کواعب اتراب
کسی که باتو بمیدانِ فضل بازد گوے
همی تپد دل او همچو گوے در طبطاب
فراقِ حضرت توجانِ من بفرسوده ست
گواست بر دلِ من بنده ایزدِ وهّاب
همی ثنای تو گویم بوقت بیداری
همی لقای توبینم چوباشم اندر خواب
ترا مباد تهی از چهار چیز دو دست
زکلک و خاتم و زلف نگار و جام شراب

اس قصیدے میں معزی نے اپنا سفر سادہ طریقے پر بیان کر دیا ہے۔ صرف گھوڑے کی رفتار کو مختلف اچھی تشبیہات سے سنوارا ہے لیکن سید حسن غزنوی نے اس کی تقلید میں جو قصیدہ لکھا ہے اس کی تمہید میں ایک جدت پیدا کی ہے۔ مطلع معزی کا ضرور بہتر ہے لیکن اس

کی تقلید میں سید حسن کہتا ہے:

چو عزم کردم سوی سفر بہ رای صواب
بریدہ گشت امیدم ز دیدنِ احباب
بر آن امید کہ بہتر شود مگر کارم
ہمی رسید ہزاران ہزار رنج و عذاب
گہی چو مور بکو شیدم از پیِ اخوان
گہی چو مار بپیچیدم از غمِ اصحاب
درین تفکر بو دم کہ آن بتِ سرکش
بر من آمد بی التماس من بہ شتاب
ہمی فروخت رخش چون بر آسمان عیسی
ہمی تپید دلش چون بر آینہ سیماب
گہی فگندی مشک از دو سنبلِ پرُ چین
گہی فشاندی در از دو نرگسِ سیراب
بشد ز شرم ہمی گفت کاخر ای بد عہد
مکن چنین و دلم رابہ وصل اندر یاب
مگر بہ خواب دری زان ہمی نمی دانی
کہ بیش اگرچہ بکوشی نہ بینیم درخواب
چہ کردہ ام کہ چنین بر گرفتی از من دل
چہ شد کہ خانہ مہرم ہمی کنی تو خراب
مگر کہ عہدِ مرا پاک دادہٴ برباد
مگر کہ نام مرا نقش کردہٴ بر آب

اگرچہ ہست خطا رفتنِ من از پیشت
شدن بہ پیشِ خداوندِ خویش ہست صواب
جہانِ جود و کرم نجم دین و کافی ملک
کہ دین و ملک ازو ثابت ست در ہر باب (۱۰۴)

دیکھئے کتنی اچھی تمہید ہے اور اس ممدوح کے متعلق یہ قصیدہ ہے جس کا انتقال ۵۲۸ھ۔ ۱۱۴۳ء میں ہوا تھا یعنی اس سال کے پہلے ہمارے شاعر نے لکھا ہوگا۔

۳۔ عمادی غزنوی متوفی بحدود ۵۴۵ھ (جس کو لباب ج ۱ ص ۹۹ میں غلطی سے (۱۴۱) شہریاری سمجھ کر لکھا ہے کہ اس کے ایک قصیدے کا جواب یوسف بن ناصر الکاتب نے لکھا تھا) سنائی کا دوست تھا۔ اس کا ایک قصیدہ (مونس الاحرار۔ ص ۲۹۴ بعد حبیب گنج) ہے:

ای بر سمن از مشک بعمدا زدہ خالی
مسکین دل من گشت ز حال تو بحالی
حالی بہ جہان زار تر از حال دلم نیست
تا نیست دل آشوب تر از خال تو خالی
قدّ و دہن و زلف تو وجعد تو دیدم
ہر یک ز یکی حرف پذیرفتہ مثالی
از سیم الفی دیدم وزبسد میمی
از مشک سیہ جیمی وز غالیہ دالی
گفتم کہ تو خورشیدی وان بود حقیقت
گفتی کہ تو چون ماہی وان بود محالی
مہ بدر نماید کہ ز خورشید شود دور
من کز تو شوم دور نمایم بہ ہلالی

ای ازبرِ من دور همانا خبرت نیست
کز مویہ چو موی شدم از نالہ چو نالی
در خواب خیالِ تو بنزدیکِ من آید
گویم کہ مرا ہست مگر با تو وصالی
بیدار شدم چون نہ تو باشی نہ خیالت
عشقِ تو مرا باز نہ داردز خیالی
یک روز بہ سالی نہ کنی یاد کسی را
کاندر غم تو باشد روز لیش بہ سالی
فرخندہ شود روز بر آن کس کہ بہ شبگیر
از روی تو و رای ملک گیرد فالی
شاہ ہمہ شاہان ملک ارغون کہ نہ دارد
در مردی و فرہنگ نظیری و ہمالی

اس قصیدے کی تمہید میں ایسی جدت اور رنگینی ہے کہ عمادی کے معاصرین میں بہت کم ملے گی۔ اس کے جواب میں سید حسن نے خسرو شاہ بن بہرام شاہ (م ۵۵۵ھ) کی مدح میں یہ قصیدہ لکھا تھا:

ای یافتہ از چہرۂ تو حسن کمالی
داد است جمالیت خدا وہ چہ جمالی
از دیدۂ من عشقِ تو انگیختہ سیلی
و زقامت من ہجر تو پرداختہ نالی
نادیدہ دہانت کہ گمان برد کہ ہرگز
خوش تر ز شکر کوزہ بود بستہ سفالی

چون زلفِ تو شد حالم و این از همه خوش تر
کاندر خمِ زلف تو دلم دارد حالی
دل سوخته چون لاله ازینیم که بی تست
بر گل چو دل لاله پدید آمده خالی
هجرانِ تو ام سوخت که گشتم به ضرورت
در مملکتِ وصلِ تو قانع به خیالی
بر بود زمن خواب که تاثیر نه باشد
از خیلِ خیالِ تو ام امید وصالی
بر چرخ هلالی که پدید آید یک چند
از دستِ محاقش نه بود بیمِ زوالی
این نادره بشنو که مرا بیم محاق است
اکنون که تیمار تو گشتم چو هلالی
میم دهنت عینِ کمال ست ومباد انک
درعینِ کمال تو رسد عینِ کمالی
هر گه که کنم قصدِ سوالی ز لبِ تو
تا بوک که بوسی بودم از تو مثالی
اقبال مرا گوید کای نادان هی هی
در دولتِ خسرو تو و محتاج سوالی
خسرو شهِ بهرام شه آن شاهِ جوان بخت
کایام نیا ورد چنو نیک خصالی
شاها ز حسن بشنو حرفی که عجب نیست
کان شکر خدا بست تبارک و تعالی

از لفظِ متین معنیِ عذ بم چو بخندد
گوی کہ جہد بیرون از سنگ زلالی
ز نہار چو وطواط و عمادیم مپندار
کافسوس بود عیسی باخر بجوالی
خود حکم تو کن این بہ یا شعرِ عمادی
کای بر سمن از مشک بعمدا زدہ خالے

اس انتخاب میں آخری مصرع عمادی کا ہے جو اس کے مطلع میں تھا۔ سید حسن کی تمہید بے شک لطیف اور آسان ہے اور طویل ہونے کی وجہ سے بعض باتیں ایسی موثر آگئی ہیں کہ جن کی وجہ سے لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ گریز بھی عمادی سے بہتر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عمادی کی طبیعت بلند ہے اور اس کو قوت اختراع حاصل ہے اس لئے سید حسن کو اس کی تقلید میں لکھنا پڑا۔ وہ اس قصیدے میں اپنے مشہور معاصر وطواط کا بھی ذکر کرتا ہے، ہم کو اس زمین میں وطواط کا کوئی قصیدہ نہیں ملا اور یوں بھی ایسے قصیدے کے متعلق کوئی خاص اشارہ نہیں ہے۔

۴۔ دولت شاہ نے عثمان مختاری کے سلسلے میں لکھا ہے کہ اس کے اس قصیدے کا جواب بہت سے شعرا نے لکھا ہے۔

مسلمانان دلی دارم کہ ضائع می شود جانش
در افتادم بدان دردی کہ پیدا نیست درمانش

دولت شاہ کی تقلید میں پروفیسر عبدالغنی صاحب نے بھی اپنی کتاب Pre-Mughal Persian (۱۸۴) میں عثمان مختاری کا مطلع یہی قرار دیا ہے۔

لیکن ادیب صابر کے دیوان (کاما لائبریری۔ بمبئی) سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مطلع کا دوسرا مصرع ادیب صابر کے مطلع کا ہے اور وہ اس طرح ہے۔

دلم عاشق شدن فرمود و من بر حسبِ فرمانش
در افتادم در آن دردی که پیدا نیست درمانش

اور عثمان مختاری کا مطلع (دیوان ورق ۱۵ الف تا ۱۶ ب) بانکی پور) یہ ہے۔

مسلمان کشتن آیین کرد چشمِ نا مسلمانش
بہ نوکِ ناوکِ مژگان کہ پُر زہر ست پیکانش

اس میں بیاسی اشعار ہیں اور یہ محمود روباہی (والی ہند؟) اور سلطان مسعود بن ابراہیم غزنوی کی مدح میں ہیں۔

کہ گر عثمان مختاری بہ درد از درد در ماند
بجز محمود روباہی کہ داند کرد درمانش
و گر باد از فلک مسعود بن ابراہیم دین پرور
یقین بسیار کردہ ست آن ز بہر دین یزدانش
بہ ہندوستان بکن کاری چنان کاری رہا حشمت
کہ عبرت نام می سازند مردان در خراسانش (۱۴۲)

تھوڑی دیر کے لئے اگر دولت شاہ کا قول صحیح مان لیا جائے کہ عثمان مختاری نے اس زمین میں سب سے پہلے قصیدہ لکھا گو کہ یہ صحیح نہیں ہے تو اس کے لئے بیشک یہ بات قابل فخر ہو سکتی تھی کہ متقدمین سے لے کر متاخرین تک نے اس قصیدے پر قصیدے لکھے ہیں۔ ہم ایسے قصیدوں کا تذکرہ کرنے سے پہلے مناسب سمجھتے ہیں کہ عثمان مختاری کے چند اشعار بطور نمونے کے پیش کریں اور پھر سید حسن کے کلام سے مقابلہ کریں۔ عثمان نے کہا ہے:

دلِ عشاق را زلفش ہمی دامِ بلا گردد
بدین معنی بکار آید بہم ہر حلقہ چندانش
مرا سودای آن باشد کہ برہم برزنم زلفش
مگر بادی جہد کز ہم کند ناگہ پریشانش

دلم سرگشتۂ مہر است و مست عشق از مستی
همی ترسم کہ بگراید سوی چاہ ز نخدانش
بزرگان زان خریدارند رویش راکہ در مجلس
فرو شد قندو گوہر از لب شیرین و دندانش

ان اشعار میں معشوق کی "زلف" "چاہِ زنخدان" لبِ شیریں اور "دندان" کے متعلق اچھی اچھی لیکن سادہ تشبیہیں اور استعارے ملتے ہیں۔اب سید حسن کے کچھ اشعار اس خارجی خوبی کے متعلق سنیے۔

گہر پر زر همی یابم ز یاقوتِ در افشانش
شدم چون ذرّۂ در سایۂ خورشید تابانش
بہ دستان زلف رابر گوش ہر ساعت کند حلقہ
چو من خود حلقہ در گوشم چہ باید کرد دستانش
ز بندِ زلف پر بندش دلی ناگاہ اگر پیچد
فرو افتد ہم اندر حال در چاہِ زنخدانش
دلم خواہد کہ بگریزد ز بندِ زلفِ او لیکن
ز بیمِ آن کہ خون گردد نہ باشد زہرۂ آنش
چنین باعاشقانِ غم زدہ دامن بیفشاند
مگر عاشق شود روزی و غم گیرد گریبانش
دلم را درد ہجرانش بخست و قصدِ جان دارد
کنون جانِ من و انصافِ شاہ و دردِ ہجرانش
خداوندِ جہان بہرام شاہ آن خسروِ عادل
کہ با عمرِ خضر دادہ ست حق ملکِ سلیمانش

جہان داری کہ از چرخ برین بگوشت مقدارش

شہنشاہی کہ از روی زمین بگوید یزدانش

اگر گنجی بہ دست آرد فراہم کردہ چون پروین

زبخشش چو بنات النعش گرداند پریشانش

از آن نیلو فری تیغت بہ ہیجا رنگ بیز آمد

کہ ہمچون معصفر اندر شنم بستہ است داندانش

ان اشعار میں سید حسن نے پھر لطافت طبع دکھلائی ہے۔ دوسرے شعر میں ''زلف رابر گوش کند حلقہ'' کی رعایت سے ''حلقہ در گوشم'' استعمال کر کے بڑا لطف پیدا کیا ہے۔ مختاری نے اپنے تیسرے شعر میں کہا ہے کہ میرا دل کہیں عشق کی مستی کی وجہ سے ''چاہ زنخدانش'' میں نہ گر جائے۔ ''مستی'' اچھی توجیہ ہے لیکن سید حسن نے پہلے تو ''زبند زلف پر بندش'' سے رعایت لفظی پیدا کی ہے اور پھر کہا ہے کہ میرا دل اگر زلف کی قید میں پیچ و تاب کھاتا ہے تو ''چاہ زنخدانش'' میں مقید ہو جاتا ہے۔ گویا کبھی اسیری سے رہائی نہیں ہے۔

پھر سید حسن کے قوافی ''پریشانش'' اور 'دندانش' وغیرہ نئی نئی تشبیہات کی وجہ سے مختاری سے بہت بلند ہو گئے ہیں۔ اب عثمان مختاری سے بھی بہت پہلے کے شاعر حکیم قطران کا قصیدہ اسی زمین میں (مونس الاحرار۔ ص ۵۳۶) دیکھئے۔ وہ آذر بائیجان کے بادشاہ ابو منصور وہسوذان (بن ابو نصر محمد بن مسعود بن) مملان کی مدح میں ہے۔ جو ناصر خسرو کے قیامِ تبریز کے موقع پر یعنی ۴۳۸ھ میں زندہ تھا۔ اس قصیدے کے بعض اشعار یہ ہیں جو اس زمین میں سب سے پہلے اسی کے یہاں ملتے ہیں۔

دل من دلبری دارد کہ نفروشم بہ صد جانش

ہزار آرام دارد جان زلولو پوش مرجانش

مرا دین و دل است آن بت نہ خوانم جز دل و دینش

مرا جانِ جہان است او نہ خواہم غیر جانانش

چو بکشاید گریبان را شبِ تار آن مہ روشن
بر آید افتاب و مہ شبِ تار از گریبانش
فغان از چشمِ پرُ خونش و زان مژگان پرُ آبش
و زان زلفین پرُ تابش و زان رخسار تابانش
بہ دیداری کہ چشمِ من بدید آں دو رخانِ او
دلم بر بود و راضی نیست جان خواہد بہ تاوانش
اگر تو قطرہ باران نہ دیدی در گل خندان
بہ زیرِ دو لبِ رنگین ببین دو رشتہ دندانش
اگر تیری بیندازد ز صد فرسنگ چشمِ او
ہمان ساعت من اندر دل بیابم نوک پیکانش
نہ نازم جز بہ دیدارش نہ خندم جز بہ گفتارش
نہ نالم جز بہ کردارش نہ پویم جز بہ فرمانش
بروی او چنان شادم کہ درویشی کہ بنوازد
سر شاہان ابو منصور وہسوذانِ مملانش

اس قصیدے میں بھی عثمان مختاری کی طرح معشوق کے خارجی اوصاف کا بیان ہے اور بغیر کسی بلند تخیل کے اس عاشقانہ تمہید کو سادہ لیکن دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ عثمان مختاری نے بھی قطران کی تقلید کی ہوگی۔ اور اسی اثر کے تحت سید حسن نے بھی خارجی اوصاف کو مختلف تشبیہات و استعارات کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور یہ بات سید حسن کے دوسرے ہم عصر ادیب صابر کے یہاں نہیں ہے بلکہ موخر الذکر کے یہاں ایسے قصیدے میں اکثر ایک ہی وصف یعنی "زلف" کے متعلق نئے نئے مضامین ملتے ہیں جو اس کی جدت طبع کی دلیل ہیں۔ کچھ اشعار اس کے بھی سنیئے اور لطف اٹھائیے۔

دلم عاشق شدن فرمود و من بر حسبِ فرمانش
در افتادم در آن دردی کہ پیدا نیست درمانش
پریشان زلف دل بندی دلم بر بود ہر ساعت
کہ در زلفش ہمی دیدم نشانِ عہد و پیمانش
بہ پیرایش گر اندر زلف او رہ یافت نقصانی
جمال او ز عشقِ من زیادت شد ز نقصانش
بہ قصد گوی با چوگان بہ میدان دیدمش روزی
ز زلف او و پشت من حسد می برد چوگانش
خم چوگان او با گوی ہر ساعت بہ میدان در
ہمان کردی کہ روزِ باد زلفش باز نخدانش
ز رشک گرد تا با زلف مشکینش نیا میزد
بہ آب دیدہ بیفشاندم سراسر گرد میدانش
دلم را در خم زلفش بہ زندان کرد عشق او
چو مداح خداوند ست نگذارد بہ زندانش
رئیس شرق مجد الدین ابو القاسم علی کا یزد
مزین کرد عالم را بہ عدل و علم و احسانش (۱۴۳)

غرضیکہ یہ زمین ایسی مقبول ہوئی کہ عثمان مختاری، حکیم قطران، سید حسن غزنوی اور ادیب صابر کے علاوہ متعدد دوسرے اکابر نے بھی اسے قبول کیا۔ مثلاً شمالی دہستانی نے (مونس الاحرار ص ۵۴۴)

بتی دارم کہ یک ساعت برون نایم ز فرمانش
چو ایمان دارم اندر دل بہ خوبی عہد و پیمانش

لباب الالباب (ج ا۔ ص ۹۸) میں خسرو ملک غزنوی (حکومت تا ۵۸۲ھ۔ ۱۱۸۶ء)

کے درباری شاعر یوسف بن نصر الکاتب کا بھی ایک قصیدہ ہے۔

زماہ آن رخش لعلی ست در سیب زنخدانش
زجام آن لبش مسی است در زلف پریشانش

انوری نے بھی کہا ہے (کلیات۔ ص ۲۳۴):

ببین وقتِ سخن گفتن لبِ شیرین و دندانش
کہ گوئی دُرّ عمان ست در لعل بدخشانش

لیکن خاقانی کا قصیدہ سب پر غالب ہے:

دلِ من پیرِ تعلیم است و من طفلِ زباندانش
سواد الوجہ سبق و مسکنت کنجِ دبستانش
دلِ من باغبانِ عشق و حیرانی گلستانش
ازل دروازۂ باغ ،و ابد حدِّ خیابانش

اگر دوسرے شعرا کے دواوین (۱۴۴) دیکھے جائیں تو ممکن ہے کہ اور بھی قصیدے اس زمین میں ملیں۔ بہر حال اس کی مقبولیت میں کوئی شک نہیں ہے اور اگر حکیم قطران ہی اس کا موجد تھا تو واقعی اس کی خداداد ذہانت میں شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

۵۔ اتسز خوارزم شاہ (م۔ ۵۵۱ھ) کی مدح میں رشید الدین وطواط (م۔ ۵۷۸ھ) کا ایک قصیدہ (مونس الاحرار۔ ص ۹۱۸) ہے:

زمی افروختہ حسنِ تو در جہان آتش
زدہ مرا غمِ تو درمیانِ جان آتش
اگر برارم از اندوہِ عشقِ تو نفسی
بگیرداز نفسِ من ہمہ جہان آتش
نہ ماند از آتشِ دل آبِ چشم ترسم از انک
بجای اشک زچشم شود روان آتش

مجوی هجر من ای نو بهار حسن کہ من
بہ کارت آیم ہچون بہ مہرگان آتش
منم ہمیشہ در آتش ز آندہِ تو ولیک
مرا نہ دارد با مدح شہ زبان آتش
ابو المظفرِ خورشیدِ خسروان اتسز
کہ از صواعق خشمش کند کران آتش
زکف اوست بہ بخشش کہیں اثر دریا
ز تیغ اوست بہ کوشش کمین نشان آتش
ازان زبانۂ آتش بود بہ شکلِ زبان
کہ از سیاست اوہست ترجمان آتش
رود خدنگِ تو سوی مخالفان ز کمال
چنان کہ سوی شیاطین ز آسمان آتش
خدای داند کز تو بہ دودمان نہ روم
وگر بر آورد و دم زخان و مان آتش
ہمیشہ تا کہ فروزد بہ راغ و باغ و بہار
ز برگِ لالہ و از شاخ ارغوان آتش
بر اہل عالم شاہا خدایگان بادی
چو بر طبایعِ عالم خدایگان آتش
مخالفانِ ترا ہمچو ہاویہ جنت
موافقان ترا ہمچو ضیمران آتش

اس قصیدے میں وطواط نے عاشقانہ تمہید کے ساتھ نئے مضامین پیدا کئے ہیں۔ اور نئی نئی تشبیہات و استعارات سے اپنے کلام کو مزین کیا ہے۔ سید حسن نے بھی اسی طرح

لکھا ہے۔

چہ ساخت در دلِ تنگم چنین مکان آتش
نہ یافت جای مگر در ہمہ جہان آتش
مرا دو چشم چو ابرست و شاید ار چون برق
جہد ز آب دو چشم زمان زمان آتش
مگر دو چشم و دلم ماہی و سمندر شد
کہ کرد این وطنِ آب آن مکان آتش
شدم ز گنبد نیلوفری چو نیلوفر
کہ گردِ من ہمہ آب است و درمیان آتش
زہی چو یوسف در حسن و ہمچو ابراہیم
برآن دو عارض، تو گشتہ مہربان آتش
بہ وعدۂ دلِ من خوش کن ارچہ نہ بود راست
بہ گفت آتش کی گیردت زبان آتش
گرم چو مشک دہی بی خیانتی برباد
ورم چو عود زنی درمیان جان آتش
بہ خوش دلی بکشم گرم و سرد تو کہ مرا
تو در بہار نسیمی و در خزان آتش
نمودہ عرصۂ صحرا ز سبزہ چون دیبا
گرفتہ خطۂ بستان ز ارغوان آتش
میانِ سبزہ گلِ زرد گر ببینی ہیچ
گمان بری کہ گرفتہ ست آبدان آتش

جو شاخِ گل به ده انگشت خواست کرد چراغ
ز برگِ لاله به کف کرد گلستان آتش

عجب که لاله دعای حسود شاه بگفت
دعا که کرد که باداش دردهان آتش

به یمنِ دولت بهرام شه که اندر رزم
زبان خنجر اورا ست ترجمان آتش

شود چو زهره ز خورشید محترق گر هیچ
کند زمانی با عزم او قران آتش

خدایگانا شعری ز گفتهٔ وطواط
که کرده بود ردیفش به امتحان آتش

شنیده شد که تو دیدی و فرّیک نظرت
حرام کرده برآن طبع دُر فشان آتش

حسن هم اکنون دُری ز بحرِ طبع آورد
که هیچو یا قوت او را دهد امان آتش

چو خاک رنگین مدحی مبادی آن باد
چو آب رایق شعری ردیف آن آتش

بسانِ طوطی چون طبع من شکر خاید
ز رشک گیرد وطواط را روان آتش

همیشه تاکه به رفعت بود مثل افلاک
همیشه تاکه زپستی دهد نشان آتش

علو قدر ترا بادهم رکاب افلاک
مضای عزم ترا بادهم عنان آتش

یکی حباب زجودِ تو موج زن دریا
یکی شراب ز عیشِ تو کامران آتش

اتنے زیادہ اشعار نقل کرنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی۔ کہ سید حسن کی طبع کی جولانی معلوم ہو سکے۔ کہ وہ کس طرح اپنے ایک فاضل حریف یعنی وطواط کے مقابلے میں (جیسا کہ آخر کے اشعار سے واضح ہے) اپنی قوتِ تخیّل سے نئے نئے مضامین پیدا کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وطواط کی طبیعت بلند ہے لیکن ہمیں یہ ماننا پڑتا ہے کہ سید حسن نے نئی نئی متعدد تشبیہات و استعارات (شعر ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱) کا ایک نگار خانہ سجایا ہے۔ رعایت لفظی و معنوی (۴، ۹، ۱۱) اور صنعت تضاد (۲، ۳، ۸، ۱۰) سے بڑا لطف پیدا کیا ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ سید حسن کا گریز وطواط سے بہتر ہے گو کہ دعائیہ اشعار میں وطواط بہت افضل ہے۔

دیوان ادیب صابر (آصفیہ ۹۳۶۔ ص ۷۷ بعد) میں بھی اسی زمین میں ایک قصیدہ سنجر کے امیر مجد الدین ابوالقاسم علی کی مدح میں ملتا ہے:

چو دیدہ دید بران روی آبدار آتش
دوید برسرم از عشق آن نگار آتش
سلالۂ نبوی، صدرِ شرق مجد الدین
کہ پیشِ ہمت او ہست پیشکار آتش
جو صاعقہ دلِ صافی ز رای روشن تو
ہمی زنند در اعدادی شہریار آتش
بنور فکرتِ تو شاہ خسروان سنجر
ز آب تیغ فروزدبکار زار آتش (۱۴۵)

لیکن جمال الدین محمد عبدالرزاق اصفہانی (۵۸۸ھ / ۱۱۹۲ء) اور سید حسن کی تقلید میں یہ قصیدہ ۵۷ شعروں کا (مخطوطہ ۱۲۳۷ آصفیہ) لکھا تھا:

در آمد از درم آن شمع و بر رخان آتش
مرا فتاد چو پروانه در روان آتش
نشست چشم سرمست و جام در دستش
مهی که شعلهٔ او زد به قیروان آتش
بدان صفت که بود در بکوه لعل مذاب
بدان صفت که بود آب را میان آتش
چو لعلِ دلبر نوشین چو عیش ایشان تلخ
چو آب صافی و سرخیش همچنان آتش
نگاه کردم و دیدم قدی چو سرو بلند
دو زلفِ مشک و دو لب شکر و رخان آتش
گرفتمش به کنار اندر و همی گفتم
که ای قرار تو اندر میانِ جان آتش
به خاک پای تو گر جز بباد انگارم
و گر چو آب ببارد ز آسمان آتش
مراچه باک که گویم مدیحِ صدر جهان
و گرنه گیرد ازین پس همه جهان آتش
ستوده ثمرهٔ آفاق رکن دین مسعود
که هست از شرفش کمترین نشان آتش
بزرگوارا صدرا قصیدهٔ گفتم
که خواستند ردیفش به امتحان آتش
بدان نهاد که گفتند اشرف و وطواط
ازین نمط دو قصیده ردیف شان آتش

آخر کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ جمال الدین نے یہ قصیدہ اشرف یعنی سید اشرف حسن غزنوی اور رشید الدین وطواط کے مقابلے پر لکھا ہے۔ اور چونکہ اس کے پیش نظر کم از کم ان دو شاعروں کے قصیدے موجود تھے اس لئے اس کی تشبیب زیادہ لطیف اور رنگین ہے گو کہ وطواط کی بلندی اور سید حسن کا تخیل اس کے یہاں کم ہے۔

سید حسن کی تقلید

اب ہم کچھ ایسے شعرا کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں۔ جنھوں نے سید حسن کی تقلید کی ہے اور اس سلسلے میں ہم سب سے پہلے سید حسن کے اس قصیدے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس کے اتباع میں متعدد اکابرین نے اپنے قصیدے لکھے ہیں۔

۱۔ اسی قصیدے کے متعلق دولت شاہ (بہ تصحیح براؤن۔ ص ۱۰۴) کا خیال ہے کہ سید حسن ہی سے فخریہ قصیدے کی ابتدا ہوئی۔ (۱۴۶) اور محمد عوفی (لباب ۲: ۱۰۵) نے دعوت تامل اس طرح دی ہے کہ "او (سید حسنؒ) رایک قصیدۂ مفاخرت با چندان معانی بکر و بنات فکر تمام است و عاقل باید کہ این قصیدہ را بہ تامل بخواند و در معانی او تفکر بلیغ کند تا بر کمال تبرزِ او درین شیوہ واقف گردد" چونکہ ہم اس قصیدے کے کافی اشعار اوپر نقل کر آئے ہیں۔ اس لئے یہاں صرف چند پیش کئے جاتے ہیں۔ دیکھئے اس قصیدۂ "صفیر الضمیر" کا زور کیا ہے:

دانَد جہان کہ قرۂ عینِ پیمبرم
شایستہ میوۂ دلِ زہرا و حیدرم
دریا چو ابر باد دگر آب شد زشرم
چون گشت روشنش کہ چہ پاکیزہ گوہرم
دُرّی پُر از عجائب دریا شود ز حکم
ہر قطرۂ کہ در صدفِ جان پرورم

طبعم چو آتش تر و ہر دم خلیل وار
ہر خوش گلے دگر دمد از آتشِ ترم

اس قصیدے میں سید حسن نے عموماً اپنے نسب اور شاعری پر فخر کیا ہے اور اس کے لئے بھی یہ بات کیا کم باعث فخر ہے کہ متعدد اکابر شعرا نے اس کی تقلید کی ہے۔

(الف) جمال الدین محمد عبدالرزاق (م ۵۸۸ھ۔ ۱۱۹۲ء) نے جس طرح "آتش" کی ردیف میں سید حسن کی تقلید کی ہے اسی طرح اس قصیدے پر بھی قصیدہ لکھا ہے:

ای طالعِ نکو ز تو تا کیَ قفا خورم
وی مرغِ نیلگون ز تو تا کیَ فرو پرم
روزی بہ خشم بشکنم این مُہرِ مہرِ تو
واین پردۂ کبود تو بر یک دگر درم
ازدور توچہ باک چو من قطب ثابتم
و ز نحس توچہ وہم چو من سعد اکبرم
چون عود بہرِ بوی نشانی بر آتشم
آتش جہ حاجت است کہ خود مشکِ اذ فرم

اس قصیدے میں سید حسن کی طرح نسب اور شاعری پر نہیں بلکہ عموماً اپنی ذات پر فخر کیا گیا ہے اور لطیف استعارات سے حسن پیدا کیا گیا ہے۔

(ب) مجیر بیلقانی (م ۵۹۴ھ۔ ۱۱۹۸ء) نے بھی اپنی قوت متخیلہ سے (منتخب اشعار متقدمین از صائب ورق ۶۴ الف حیدر آباد) بڑے پُر زور اشعار پیدا کئے ہیں۔ کچھ یہ ہیں:

ہر شب کہ سر بہ جیبِ تفکر فرو برم
سرِّ فلک بدرم و ازسدرہ بگذرم
غافل نیم ز عالم جان در بسیطِ خاک
مانندِ آفتاب ہمان جا ہم ایدرم

بس پُر بہاست عمر ولیکن شکستہ بہ
آن جام گوہری کہ از و خونِ خود خورم

(ج) اسی طرح کمال اسماعیل (م ۶۲۸ھ۔۱۲۳۱ء) نے بھی ۲۷ شعر کا قصیدہ (دیوان ۲۴۶ ورق ۷۹۔۸۱ آصفیہ) لکھا ہے۔ کچھ اشعار یہ ہیں:

روزی وطای کحلیِ شب در بر آورم
بگریزم از جہان کہ جہان نیست در خورم
پیوندِ عمر بایدم از دَورِ روزگار
تاسطری از معایبِ ایّام بشمرم
از ساحری عصای کلیم ولی چہ سود
چون ہر کجا کہ ہست گلیم ست رہ برم
از دل کہ راست خانہ چو تیرم چہ حاصل است
پشت مقوّس است چو ابروی دلبرم
طبعم خوش است و خلق خوش آری ازین قبیل
دستِ خوشِ زمانہ چو گوی معنبرم
زان غیرتی کہ سر نہ کنم راست بر فلک
چون چنگ زخمہای پیاپی ہمی خورم
پیچیدہ ام ز خویش بر انگشت تا چرا
نالندہ از کشایش رگہا چو مزہرم
سالم ز بیست گرچہ فزون ہست می شود
گردونِ پیراز پسِ سی و دو چاکرم (۱۴۷)
اینہا ہمہ بگفتم و دانم علی الحقیق
کاربابِ عقل ہیچ نہ دارند باورم

اجزای جوہرم شدہ مشتق ز عقلِ کل

کز صلبِ آن یگانۂ ماضی ست مصدرم

افسوس کآفتابِ ہنر رفت و من بہ عجز

افتادہ ہمچو سایہ برین صحن اغبرم

ان اشعار سے کمال کی اعلیٰ قابلیت اور کمال فن کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور اس کے دوسرے اشعار جو طوالت کے خیال سے محذوف کردیئے گئے ہیں اس کی وسعتِ نظر اور پروازِ فکر کے آئینہ دار ہیں۔

(د) قاضی نوراللہ کی مجالس المومنین (ق ۵۹چ۔۲۶۰ بانکی پور) میں شیخ آذری (م۸۶۶ھ۔۱۴۶۱ء) کے قصیدے میں ۶۴ (۱۴۸) شعر ہیں۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں:

منت خدای راکہ مطیعِ پیمبرم

فرمان برِ قضای خداوندِ اکبرم

حمد و سپاس کعبۂ ذرات راکہ من

از تابعان صاحب محراب و منبرم

تا مسندِ شریعتِ غراست مسکنم

تقوی است زینتِ من و زہدست زیورم

ز آنہانیم کہ حسن فروشم بہ مال و زر

قاضی القضاتِ محکمۂ ہفت کشورم

بگذشتہ ام ز دائرۂ ممکن الوجود

بر صدرِ کاینات بہ واجب مصدّرم

تایافت جانِ من خبر ازمبدۂ وجود

دانم کہ ازقبیلۂ اسماست مصدرم

توحید بحر و این تنِ من ہچو کشتی است
جان ناخدای کشتی (و) عقل است لنگرم
نسبت بہ خاندانِ علی و بہ آل او
زان کردہ ام درست کہ پاک است مادرم
آن راکہ ہست با علویان ارادتی
گر ازنژادِ ترک بود ہست داورم
و آن راکہ با ولایت او نیست نسبتی
خصم من است گر ہمہ باشد برادرم
با حُبِ خاندان چو بر آرم ز خاک سر
بر جملہ خلق فخر بود روز محشرم
ساقی کوثری تو و من آذری تو
برسان بہ آبِ کوثر و برہان ز آذرم

اس قصیدے میں آذری نے اپنی ذات پر اہل بیت کے تعلق کی بنا پر فخر کیا ہے۔ گریز میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی منقبت ہے۔ لیکن سید حسن کے قصیدے کا زور نہیں ہے کیونکہ وہ حقیقت میں ''صفیر الضمیر'' ہے اور اپنے نسب کے بیان کرنے میں اس کی لے پست نہیں ہے۔ آذری کے یہاں کمالی کا کمالِ فن اور اظہار علمیت بھی نہیں ہے جس کے قصیدے میں بڑی ضرورت سمجھی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے شعرا نے بھی اسی زمین میں فخریہ قصیدے لکھے ہیں۔ (۱۴۹)

(ر) سید حسن کا ''سوگند نامہ'' جو اوپر ایک جگہ مذکور و منقول ہوا ہے اس طرح شروع ہوتا ہے:

کشاد صورتِ دولت بہ شکر شاہ دہان
چو بست زیورِ اقبال بر عروسِ جہان

خدایگان سلاطینِ مشرق و مغرب
علاء دولت و دین خسروِ زمین و زمان
ابو المظفرِ بہرام شاہ بن مسعود
کہ ہست نامش بر نامۂ ظفر عنوان
ز طبعِ تست زمان را بہار گوہر بار
ز جودِ تست زمین را خزان درم افشان
قوی دلت کہ مبادا سبک! دریغ کہ شد
بہ ہر دروغ بہ این بندۂ ضعیف گران
بدان خدای کہ ہر ذرّہ بر خداوندیش
ہمی نماید چون آفتاب صد برہان

پھر رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیا علیہم السلام کی قسمیں ہیں۔ خلفائے راشدین کی قسموں کے بعد رستم، کیخسرو، حاتم اور نوشیروان کو نہیں چھوڑا۔ پھر بہرام شاہ کی دولت، نعمت یابی، گرز، ساغر، خنجر، کوس، چتر، تاج، تخت، نہمت، نوبت، خطبہ، ہمت، رحمت، عہد، عفو وغیرہ مختلف اوصاف کی الگ الگ قسمیں آئی ہیں۔ آخر میں عفو تقصیر اور پھر ممدوح کے لئے دعا ہے۔

ابو بکر بن محمد بن علی روحانی نے بھی اپنا "سوگندنامہ" اسی بحر و قافیہ میں لکھا ہے اور بہرام شاہ کے آخری وزیر حسین بن حسن بن احمد کی مدح میں ہے۔ تاریخ بہرام شاہی میں اس کے متعلق تفصیل دی جا چکی ہے۔ یہاں صرف چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں:

زہی بفکرتِ روشن ز چشمۂ حیوان
در آفرینش عالم دلت معمّا خوان
توئی توئی کہ اگر خوانمت عطارد ارض
درین سخن نہ بود خلق را مجال گمان

نجیبِ ملک حسینِ حسن برای خدا
بہ تیغ دولت انصافم از جہان بستان
بعزّ ملکِ خدای و بکامِ عالمِ امر
بنورِ جوہرِ عقل و بنطق گوہر جان
بہفت آئینۂ غیب و مبدِہ عالم
بچار تختۂ ترکیب و نقش بند جہان

پھر قرآن پاک کی مختلف سورتوں کی قسمیں کھائی ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم' خلفائے راشدین' امام ابو حنیفہ اور خلیفہ وقت کی قسموں کے بعد پھر بہرام شاہ اس کے بیٹے' اکابر سلطنت وغیرہ یاد کئے گئے ہیں۔ روحانی نے جیسا کہ ہم تاریخ بہرام شاہی میں لکھ چکے ہیں اپنا "سوگندنامہ" رشید الدین وطواط اور شہاب الدین ادیب صابر وغیرہ کے سوگندناموں کو بھی دیکھ کر لکھا تھا اس لئے اس کے یہاں خصوصاً سید حسن سے زیادہ تصنع پایا جاتا ہے (۱۵۰)۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ موخر الذکر ہی کا "سوگندنامہ" ایسا تھا جس کے قافیے پر لکھنے میں روحانی کو آسانی ہوئی ہو گی۔ اور اس نے اپنی قوت تخیل سے نئے نئے مضامین پیدا کرنے کی کوشش کی ہو گی۔ بعض اشعار ملاحظہ ہوں:

خدایگانی کاندر ہوای انصافش
چراغ ماہ بود چون رفو کنند کتان
دعای دولتِ او گوی ازانچہ بی کوشش
جہان بہ دولت او آن چنان شد آبادان
کہ بیخِ سوسنِ سیمین ہمی کشد خنجر
کہ شاخِ گلبنِ زرّین ہمی زند پیکان
زہی کہ قہقہہ خندد بہ عزت ابر دژم
زہی کہ نقش پذیرد بہ امرت آبِ روان

چهار عنصرِ کژ را چنان نهادی ر است

کہ تنگ دست چنار است و گوشہ گشتہ کمان

روحانی نے ایک قصیدے میں بھی سید حسن کی تقلید کی ہے سید حسن کا قصیدہ ہے:

آرامش و رامش ہمگان رابہ درِ ماست

بخشایش و بخشش رہِ جدّ و پدرِ ماست

گر در سہریم ازجہتِ خلق سزد آن

کین خفتنِ فتنہ ز فراوان سہرِ ماست

مارا دِل اگر ہست قوی نیست عجب زانک

خوش خوئی و شیرین سخنی گل شکرِ ماست

خورشید زند تیغ و شود منکسف از ماہ

آری چہ عجب' ماہ بہ شکلِ سپرِ ماست

در خواب فرستند سلاطینِ زمانہ

آن مال کی عشرِ صلۂ ماحضرِ ماست

سیم و زرِ عالم ہمہ داریم بہ خلقان

زان جاکہ سخاہای کفِ بی خطرِ ماست

وقت است کنون گرمہ و خورشید بخشیم

کان است چو سیم ماوین ہمچو زرِ ماست

زان نام بزرگ تو بہرام شہ آمد

کاندر کفِ بہرام حسامِ ظفرِ ماست

یارب بہ رعیت تو ارزانی ما دار

کآسایش ایشان بہ مبارک نظرِ ماست

اسی ردیف میں (گوکہ مختلف زمین میں) روحانی نے بھی بہرام شاہ کی مدح (لباب

ج۔۲، ص ۲۸۲) کی ہے اور حسن کی طرح خود بہرام شاہ کی زبان سے کہا ہے:

منّت خدای راکہ جہان در پناہِ ماست
سجدہ گہِ ملوک زمین بارگاہِ ماست
روزِ سپید راہمہ امیدِ روشنی
در سایۂ سعادتِ چترِ سیاہ ماست
امیدِ ہفت کشور و اقبالِ ہشت چرخ
اندر چہار گوشۂ ترکِ کلاہ ماست
ما روی عالمیم و بہ تائید کردگار
نصرت بہ روز معرکہ پشتِ سپاہِ ماست
اندیشہ چون ز عالمِ علوی گذر کند
آن جا رسد کہ پایۂ اوّل ز جاہ ماست
ما آفتابِ دولت و باران رحمتیم
صحرای ملک سبزہ و دولت گیاہِ ماست

سید حسن کے قصیدے میں حسن تعلیل اور لطیف استعارات کی فراوانی ہے لیکن روحانی کے یہاں زیادہ تر مبالغہ ہی ہے اور کوئی خاص ندرت نہیں ہے۔

(۳) پروفیسر حافظ محمود خان صاحب شیرانی نے کتاب "تنقید شعر العجم" (ص ۲۳۰) میں لکھا ہے۔ کہ "انوری کی شاعری غالباً ۵۴۰ھ سے چند سال پہلے شروع ہوتی ہے۔" اور اس کے لئے انھوں نے دلائل بہم پہنچائے ہیں۔ اس لئے صاف ظاہر ہے کہ ہمارا شاعر سید حسن جس کی شاعری کم از کم ۵۰۰ھ۔۱۱۶۰ء سے قائم تھی اس وقت بہت کہنہ مشق ہو چکا تھا، اسی لئے وہ اس عہد کے ایک ممدوح مجد الدین ابوالحسن عمرانی (جس کا ذکر اوپر آچکا ہے) کی مدح کیسی اچھی عاشقانہ تمہید کے ساتھ کرتا ہے:

ای کہ تن را دل و دل را جانی
از دل و جان چہ نکو تر؟ آنی
بی تو دل در تنِ من عاریتی
بی تو جان در دلِ من زندانی
گاہ در دل چو جہان پیدائی
گاہ در سینہ چو جان پنہانی
عاشقِ زار تو ام می بینی
بندۂ خاص تو ام می دانی
قصۂ آتشِ دل من چہ کنم
خود چو تو آب فرو می خوانی
زلفِ پُر فتنہ نشانی ہردم
فتنۂ زلف چرا ننشانی
بر دلِ من کہ تو داری مسکن
ہرچہ از جور و جفا بتوانی
عذرِ من از تو نہ خواہد روزی
مجدِ دین بو الحسنِ عمرانی

دیکھیے اس کا مطلع کتنازور دار ہے کلام میں کتنی ترطیب ہے۔ عاشقانہ جذبات و احساسات کا آئینہ دار ہے اور الفاظ کی تکرار' الٹ پھیر اور کبھی کبھی تضاد سے بڑا لطف پیدا کیا ہے۔اب انوری کے اشعار اسی ممدوح کے متعلق دیکھیے۔

دلم ای دوست تو داری دانی
جان ببر نیز اگر بتوانی

بہ دلی صحبت تو نیست گراں
چہ حدیث است بجان ارزانی
نہ گرم بوسہ دہی جانِ منی
کہ گرم جان ببریؑ ہم جانی
گاہم از عشوہ گری می خوانی
گاہم از طیرہ گری می رانی
با فلک یار مشو در بر من
گر بہر نیکوییی ارزانی
تا چو از حد ببری فاش کنم
قصہٴ درد زبی درمانی
تا ترا از سرِ من باز کند
مجدِ دین ، بو الحسنِ عمرانی

یہ دونوں مدحیں جنھیں غزلیں ہی کہنا چاہیے ایک ہی زمین میں ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ سید حسن اور انوری میں سے کس نے پہلے کہی ہے (۱۵۱)۔ لیکن انکار نہیں ہو سکتا کہ یہاں سید حسن ضرور انوری سے بڑھ گیا ہے یا یوں کہیے کہ اس کی کہنہ مشقی نے اسے بہت بلند کر دیا ہے۔ انوری کے یہاں عاشقانہ جذبات واحساسات کا مظاہرہ اس پر زور لہجے میں نہیں ہے جو سید حسن کے یہاں ہے اور وہ لطافت بھی نہیں ہے جو غزل میں زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے اگو ندرتِ خیال (دیکھیں شعر ۲'۵'۶) ضرور ہے۔

(۴) ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ "آتش" ردیف والے قصیدے میں خود جمال الدین محمد عبدالرزاق اصفہانی نے سید حسن کے اتباع کا اعتراف کیا ہے۔ سید حسن کے اوپر والے قصیدے (غزل) کی بھی اس نے تقلید کی ہے۔ دیکھئے اس زمین میں کس خوبی سے کہتا ہے:

ای که ازلطفِ جہان را جانی

فرّخ آن کس که تواش جانانی

عاشقان را ز طراوت روحی

صوفیان را ز لطافت جانی

دوراز روی تو رنجورم و سخت

رنجه شو یک ره اگر بتوانی

با تفضل کن و یک باره بکش

تا ازین درد سرم برہانی

چرخِ دین را چو مه و پروینی

باغِ جان راچو گل و ریحانی

به حقیقت همه روحِ محضی

نیست در تو صفتِ جسمانی

چرخ تا پایۂ قدرِ تو بدید

برنیاسود ز سر گردانی

در سخا بحرِ صدف پردازی

در سخن ابر گہر بارانی (۱۵۲)

دیکھئے سید حسن کی یہ زمین کتنی دلکش ہے کہ انوری اور جمال الدین جیسے اکابر نے بھی اختیار کی۔ جمال الدین کے یہاں بھی سید حسن کی طرح عاشقانہ جذبات پائے جاتے ہیں لیکن سید حسن کا مطلع سب پر فائق ہے۔ تاہم جمال الدین کی تشبیہات و استعارات بہت لطیف ہیں گو کہ انوری والی ندرت نہیں ہے۔

روحانی کی طرح جمال الدین نے بھی سید حسن کے ”سوگندنامے“ کے بحر قافیہ میں اپنا ”سوگندنامہ“ لکھا ہے جو اس طرح شروع ہوتا ہے:

زہی ز عدلِ تو اقلیم شرع آبادان

ز رشحِ کلک تو اجزای روزگار روان (۱۵۳)

اسی طرح جمال الدین کا اور بھی کلام ہے جو سید حسن ہی کی تقلید میں لکھا گیا ہو گا۔ (۱۵۴) ہم طوالت کے خوف سے اس پر بحث نہیں کرتے۔

(۵) سید حسن کی ایک زمین ہے:

رخش برمہ گلستان می نماید
بر آتش آبِ حیوان می نماید
چو گردان دل بسی دارد ولیکن
چو گردون جملہ گردان می نماید
چہ گردد آخر کارم نہ دانم
کز اوّل بس پریشاں می نماید
دلم دانی چرا شد در دو زلفش
پریشان در پریشان می نماید
نگارا ہر زمان گوئی بطرم (؟)
کہ بس بی معنی ہان می نماید
گلِ تر دامن از تو کیست جاری
کہ صد چاک از گریبان می نماید
نشانِ روی خوبت در دلِ من
میانِ درد درمان می نماید

معلوم ہو تا ہے کہ شرف الدین محمد یا (عبدالمومن یا فضل اللہ) شفروہ اصفہانی (وفاتش در حدود ۶۰۰ھ) نے سید حسن کی یہ زمین اختیار کی ہے (لباب ج ۱۔ ص ۲۷۱)

رخش ماہ از گریبان می نماید
بنفشہ از گلستان می نماید
زطرۂ مشک و عنبر می فشاند
ز چہرہ ماہِ تابان می نماید
مدارِ چرخ آبِ زندگانی
از آن چاہِ زنخدان می نماید
ز بلورین زنخدان گوی دارد
زپیچِ زلف چوگان می نماید
دھانش نقطۂ تنگ است و قد راست
ز خط بر نقطۂ برہان می نماید

شرف الدین کا مطلع کہتا ہے کہ سید حسن کے اتباع میں لکھا گیا ہوگا۔ سید حسن کی تشبیہات میں جو نازک خیالی ہے وہ شرف الدین کی سادہ اور عام تشبیہات میں نہیں ہے گو کہ یہ ضرور صحیح ہے کہ موخرالذکر کے یہاں زیادہ برجستگی اور روانی ہے۔ اسی طرح نجیب الدین جرباد قانی کا ایک قصیدہ (مخطوطہ علی گڑھ) اسی زمین میں مختلف قافیہ کے ساتھ ملتا ہے:

جہانِ پیر برنا می نماید
مثالِ خلد صحرا می نماید

(۶) ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ مجیر بیلقانی (م ۵۹۴ھ۔۱۱۹۸ء) نے سید حسن کی تقلید میں قصیدۂ فخریہ لکھا تھا۔ یہاں بھی اس کی تقلید دیکھئے۔ سید حسن کا ایک قصیدہ ہے:

وقت آن است کہ مستان طرب از سر گیرند (۱۵۵)
طرۂ شب ز رخِ روز ہمی بر گیرند
راویان ہر نفسی تہنیتی نو گویند
مطربان ہر کرتی پردۂ دیگر گیرند

بزم را تازہ تر از روضۂ رضوان دارند
بادہ را چاشنی از چشمۂ کوثر گیرند
ساقیانی و چگوئی و چگونہ یارب
کہ می گلگون از جام معنبر گیرند
زہرہ در ساغر شان رقص کند ہمچو حباب
گاہ عشرت چو بہ کف گوشۂ ساغر گیرند
بوسۂ از لب شان گر بمثل نقل کنی
بوسہ را در نمک و پستہ و شکّر گیرند
دوستان تیرِ حریفانہ در آیند بہ کار
وقت رایک دم بی مشغلہ در بر گیرند
رنگ در ساغر این بادۂ احمر دارند
سنگ در شیشۂ نہ قبۂ اخضر گیرند
گوی امید ز چوگانِ فلک بر بایند
توشۂ عمر ز دوران جہان بر گیرند(۱۵۶)

۔ اسی کے جواب میں جیسا کہ راحت الصدور (ص ۳۱۴-۳۱۹) میں ہے۔ مجیر کہتا ہے:

وقت آن است کہ مستان طرب از سر گیرند
تاجِ زرّینِ مہ از تارکِ شب بر گیرند
نیکوان پردہ بر انداختہ در رقص آیند
مطربان ہر نفسی پردۂ دیگر گیرند
زہرہ را تا بہ سوی مجلسِ عشاق کشند
گہ سرِ زلف و گہی گوشۂ چادر گیرند

ہندو آسا ہمہ ہنگام شکر خندۂ صبح

بالبِ یار کم طوطی و شکّر گیرند

سنگ در ساغرِ نیک و بد ایام زنند

و زکفِ سنگ دلان نصفی و ساغر گیرند

طوقِ گردن ز سرِ گیسوی مشکین سازند

صیدِ گردون بہ خمِ زلف معنبر گیرند

زیرِ سقفِ گہر آگینِ فلک چون دم صبح

خوش بخندند و جہان در زرو گوہر گیرند

سید حسن اور مجیر کے ان اشعار میں قوافی اور بعض الفاظ مشترک ہیں۔ اس لئے آسانی کے ساتھ دونوں کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ پہلے دونوں کے مطلع دیکھئے "مستان" کی رعایت سے سید حسن کے یہاں "طرہ" اور "رخ" کے الفاظ ضرور فطری ہیں لیکن مجیر کے یہاں "طرب از سر گیرند" کی رعایت سے "تاج" اور تارک کے الفاظ نہایت موزوں ہیں اس لئے اس کا مطلع زیادہ بلند معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے شعر میں مجیر نے سید حسن کی بالکل نقل اتار دی ہے۔ اور خصوصاً دوسرا مصرع بالکل ایک ہی ہے۔ گو کہ مجیر نے پہلے مصرع میں بڑی دلکشی پیدا کر دی ہے۔ لیکن ہم کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سید حسن نے اپنا قصیدہ محمود خان کی تخت نشینی کی تہنیت پر لکھا تھا اس لئے ع روایان ہر نفسی تہنیتی نو گویند سے زیادہ وہ کیا کہتا ؟ چوتھے شعر میں حسن نے "زہرہ" کے متعلق جو تشبیہ دی ہے اور اس "رقاصۂ فلک" کی رعایت سے جو "رقص کند ہمچوں حباب" کہا ہے وہ اسی کا حصہ تھا۔ مجیر نے گو کہ بقول راحت الصدور (ص ۳۱۴) "بہ امتحان در مجابات سید اشرف (حسن) این قصیدہ گفت" لیکن حقیقت ہے کہ اس مجابات کے باوجود مجیر نے اپنے تیسرے شعر میں "زہرہ" کے متعلق اور دیگر اشعار میں کوئی خاص اضافہ سید حسن کے کلام پر نہیں کیا۔ سید حسن کا آٹھواں شعر مجیر کے چھٹے شعر سے پھر بلند ہے۔ تاہم مجیر اپنے تخیّل اور ندرت مضمون کے

لحاظ سے سید حسن سے کم نہیں ہے۔ اور اس کے یہاں الفاظ کا انتخاب کبھی کبھی سید حسن سے زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے۔

(۷) عمادی شہریاری، المتوفی ۵۷۳ھ (؟) جورے کے ایک قریہ شہریار کا رہنے والا تھا اور جو بقول آتشکدۂ آذر، مختاری غزنوی کا لڑکا تھا ہمارے شاعر کی تقلید کرتا ہے، سید حسن نے ۵۴۵ھ میں حج کے راستے میں یہ قصیدہ لکھا تھا جیسا کہ ہم اوپر پڑھ چکے ہیں:

جان می برد بہ عشرتِ حورانِ گلشنم
دل می کشد بہ خدمت دیوانِ گلخنم

اس قصیدے کا آخری شعر یہ ہے:

از بعد پانصدو چہل و پنج گو بیا
در من نگر کہ معجزۂ جدِّ خود منم

اس قصیدے کو اشعار کا انتخاب خود شہ کرکے صائب کے منتخب اشعار متقدمین (۳۴۴۔ق ۶۲۔ آصفیہ) میں سے پیش کرتا ہوں۔

گاہی بسانِ چو طفلان خونی ہمی خورم
گاہی نگون چو پیران جانی ہمی کنم
تا لاجرم ہمی زند این طاسِ روزگار
در سینہ زخم ہای دمادم چو ہاونم
چشم سفید گشت چو گوی بلورِ من
زین اشکِ لعل ہمچون بلور ملوّنم
شاد از چہ ام؟ ازین کہ درین غم کدہ یکی ست
در مان و در د و نیک و بد و سو رو شیونم
از نفخِ صور ہم بنمیرد چراغِ من
کز زیتہا یضیء چکیدہ است روغنم

آن آتشی کہ باغِ ارم گشت بر خلیل
جست از دلی چو سنگ و زبانی چو آہنم

اس قصیدے کی تقلید میں عمادی شہریاری نے ملک طغان بن ملک مویدی آی ابہ (التوفی ۵۸۱ھ) کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا جیسا کہ علی گڑھ کے مخطوطے کے آخر شعر سے معلوم ہوتا ہے:

خسرو ملک طغان کہ ز بس لطف شاملش
از منّتِ عطای وے آسودہ شد تنم

لیکن علی گڑھ کے دیوان میں سے انتخاب پیش کرنے کے بجائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پھر اسی مذکورہ بالا مجموعہ (ایضاً۔ق ۶۵۔الف) میں انتخاب صائب پیش کیا جائے:

زان گہ کہ در تصرفِ این سبز گلشنم
در کامِ اژدہای نیاز ست مسکنم
محتاجِ نان و آب نیم از برای آنک
غم جای نان و آب گرفتہ ست در تنم
از بہرِ آسمان کمرِ لعل کردمی
گر زادۂ دو دیدہ براندی بہ دامنم
بہتر ز من چراغ نیفروخت روزگار
خورشید رشک برد بپالود روغنم
گفتی مگوی ہر چہ توان گفت زینہار
بجرم شگفت نیست اگر موج می زنم

ان اشعار (۱۵۷) کا مقابلہ سید حسن کے اشعار سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دونوں نے تشبیہات واستعارات سے کام لیا ہے لیکن عمادی نے بعد میں کہنے کے باوجود وہ جدت پیدا نہیں کی جو سید حسن کے یہاں ہے۔ اگر قوافی سے اندازہ نہ لگایا جاسکے تو اس طرح بھی

دیکھا جاسکتا ہے کہ سید حسن کا شعر تھا:

بر پای عقلبند گران ست این سرم
در حبسِ چرخ گوی روان ست این تنم

اور عمادی کا شعر ہے:

محتاجِ نان و آب نیم ز برای آنک
غم جای نان و آب گرفتہ است در تنم

عمادی کے مقابلے میں سید حسن کے یہاں ضرور جدّت پائی جاتی ہے گو کہ یہ صحیح ہے کہ عمادی کے یہاں سلاست کے ساتھ کچھ لطافت بھی ہے۔ اس طرح ان دونوں کے یہاں ''روغنم'' کے قوافی پر غور فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ سید حسن بہت بلند ہے۔ عمادی کے ''مسکنم'' اور ''دامنم'' والے قوافی کے سلسلے میں سید حسن کے کچھ اور اشعار دیکھئے:

این حرمتم مبین کہ چو خورشید سرورم
این خدمتم نگر کہ چو سایہ فروتنم
ہستم چہار میخ درین خانۂ دو در
پرہا زنم چو باز کشایند روزنم
تازین سکون و زان حرکت ہم نہ بگذرم
ناید پدید کنگرۂ قصر مسکنم
یک روز می گذشتم دامن کشان ز چرخ
آلودہ شد بہ چشمۂ خورشید دامنم
ہم با کمندِ عقلم و ہم بالگام شرع
تا کرۂ سپہر نہ گوید کہ توسنم
سنگ سخن بلند بر اندا ختم ازانک
تا آبگینہ خانۂ افلاک بشکنم

دیکھئے سید حسن نے اپنے قوت متخیلہ سے کیسے نئے نئے مضامین پیدا کئے ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ عمادی کے یہاں بھی کسی حد تک ضرور لطافت پائی جاتی ہے۔

سید حسن کا ایک قصیدہ بہرام شاہ کی مدح میں ہے:

چشم چو برسرِ گل و گلزار می رود
اندیشہ درپئ دل و دلدار می رود
در وقتِ نو بہار سوی جلوہ گاہِ گل
ازخار کمترست کہ بی یار می رود
در گلستان ہر آن کہ رود بی جمالِ یار
واللہ کہ بہرِ سرزنشش خار می رود
جانا بیار بادہ کہ مرغانِ باغ را
بی جام بر سماع تہی بار می رود
باجامۂ دریدۂ پرخون گل از درخت
نزدیک خلق شاہ بزنہار می رود
ہر روز لشکرِ گلِ رعنا ہمی رسد
ہر شب سپاہِ نرگسِ عیّار می رسد
رخسارِ گل بہ رنگ حکایت ہمی کند
آن ظلمہا کزان گلِ رخسار می رود

پورے قصیدے میں بڑی لطافت اور رنگینی ہے اور اس کی بہاریہ تمہید کسی اور عہد کی ایسی ہی تمہید کے مقابلے میں رکھی جاسکتی ہے اب ہم عمادی کے اشعار علی گڑھ کے مخطوطے میں سے نقل کر کے آگے بڑھتے ہیں۔

در عالمی کہ عشق ترا کار می رود
اندیشہ را معاملہ بسیار می رود

در ہر دلی کہ پرتوِ خورشید عشقِ تست
خورشیدِ عقل بر سرِ دیوار می رود
در حلقہء ز زلف خم اندر خم ترا
دو کوکبہء دو صد دل افگار می رود
در وصفِ عشق با رخِ شنگرف رنگ تو
شمشیرِ صبر ختہء زنگار می رود
در موضعِ قبول چلیپای زلف تو
سجادہ در مقابل زنّار می رود
آن کس کہ یار و دوست ترا داندا ز جہان
بی دوست می نشیند و بی یار می رود (۱۵۸)

عمادی کے یہاں بھی بڑی لطیف تشبیہات و استعارات ہیں اور اکثر جگہ وہ سید حسن سے بلند نظر آرہا ہے لیکن سید حسن بھی اپنی طبیعت کی قوتِ اختراع کی وجہ سے کم نہیں ہے اور الفضل للمتقدم کا سہرا اسی کے سر ہے۔ سید حسن کا ایک اور قصیدہ یہ ہے۔

دلی کہ بال و پر از عشق آن پسر یابد
چو جان نشیمنِ خود عالمی دگر یابد

اغلب ہے کہ اسی کی تقلید میں عمادی شہریاری نے (مخطوطہ علی گڑھ) یہ قصیدہ لکھا ہوگا۔

ترا چناں کہ توئی دیدہ ورنمی یابد
بصر ز نور تو بر تو ظفر نمی یابد

اور لباب (ج ا۔ ص ۹۹) میں ہے کہ یوسف بن نصر الکاتب نے یہ قصیدہ عمادی کے جواب میں لکھا تھا:

دہان تنگ تراوہم در نمی یابد
بصد فسون۔ سخن ز و گذر نمی یابد

سید حسن اور پروفیسر عبدالغنی

پروفیسر عبدالغنی صاحب نے اپنی کتاب The Pre-Mughal Persian in Hindustan میں جو کچھ لکھا ہے اس پر مفصل تبصرہ پروفیسر شیرانی صاحب رسالہ "اردو" (بابت جنوری ۱۹۴۳ء ص ۱۔ ۱۰۳) میں کر چکے ہیں۔ لیکن میں یہاں کچھ ان باتوں پر زیادہ تفصیل سے بحث کرنا چاہتا ہوں جو سید حسن کے متعلق ہیں۔ انہوں نے صفحہ ۲۵۰ پر اس شاعر کے متعلق لکھا ہے۔

Sayyid Hasan, a learned divine and a preacher by profession .... better known as a sufi than as poet

سید حسن کو پیر اور پیشہ ور واعظ کہہ کر شاعر سے زیادہ صوفی سمجھنے اور سمجھانے کی وجہ ذاتی طور پر میرے نزدیک کچھ ہی ہو سکتی ہے لیکن اتنا ضرور کہنے کی جرات کروں گا کہ پروفیسر عبدالغنی صاحب نے صحیح نتیجہ نکالنے کی کوشش نہیں فرمائی۔ حالانکہ انہوں نے آتشکدۂ آذر تذکرہ دولت شاہ، مجمع الفصحا اور لباب الالباب وغیرہ تذکرے جو شعرا کے متعلق ہیں ضرور حوالے کے لئے گنائے ہیں اور انہوں نے طبقاتِ ناصری کے حوالے سے یہ ضرور لکھا ہے (ص ۲۵۰۔ ۲۵۲) کہ سید حسن نے بہرام شاہ کی تخت نشینی (۱۵۹) پر ایک قصیدہ تہنیت میں لکھا تھا جس کا مطلع یہ ہے۔

منادی بر آمد ز ہفت آسمان

کہ بہرام شاہ ست شاہ جہان

لیکن اگر وہ طبقاتِ ناصری کا ترجمہ (راورٹی۔ ص ۱۱۰، ج ۱) بھی ملاحظہ فرماتے تو معلوم ہوتا کہ یہی شعر (مضمون) بہرام شاہ کے سکّوں کی پشت پر کندہ تھا۔ بہر حال اگر وہ قصیدے کا مطلع ہے تو نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ اس وقت وہ کم از کم قصیدہ تو لکھ ہی لیتا تھا یعنی صوفی کے

بجائے اس وقت شاعر کا پیشہ ضرور اختیار کر چکا تھا۔ اور بہرام شاہ کی تخت نشینی اور سنجر کی موجودگی میں کوئی معمولی شاعر دربار میں آکر قصیدہ پیش کرنے کی جرات نہ کر سکتا تھا۔

"آتشکدہ" میں سے پروفیسر صاحب نے سید حسن کے حالات "تصوف" نقل کرنے کے بعد پھر (صفحہ ۲۵۱ حاشیہ) لکھا ہے۔

While so much is said about his lineage, piety and Sermon, his poetic talent is judged in one Simple phrase as following :

والحق در فن نظم کمال مہارت داشتہ

یعنی "آتشکدہ" کے یہ الفاظ جو "کمال مہارت" کے متعلق ہیں سید حسن کو شاعر سمجھنے کے لئے کافی نہیں ہیں اور شاید وہ اس وقت بھی "صوفی" زیادہ تر کہلائے جانے کا مستحق ہے جبکہ خود پروفیسر صاحب تذکرۂ دولت شاہ میں دیکھتے ہیں اور لکھتے ہیں (ص ۲۵۱۔ح) کہ اس کی تقلید میں مجیر بیلقانی، کمال الدین اسماعیل، اور شیخ آذری جیسے بڑے شعرا نے قصیدے لکھے ہیں۔ آگے چل کر پھر (۲۵۲۔ح) فرماتے ہیں۔

His poetry consists cheifly of قصائد رباعیات and قطعات and is limited in its character, scope and bulk. He has to credits a small diwan containing about 5,000 verses, all told ... He does not seem to have attemped غزل and مثنوی of which no specimen verses are preserved in any of the biograhiead workes under reference.

اور یہ الفاظ انھوں نے لباب، مجموعۂ تذکار اور مجمع الفصحا دیکھ کر لکھے ہیں۔ انھوں نے تین باتوں کا دعوی کیا ہے۔

۱۔ اس کی "شاعری" قصائد، رباعیات اور قطعات تک محدود ہے اور وہ اپنی نوعیت اور وقعت کے لحاظ سے بھی محدود ہے۔

۲۔ اس کا دیوان اتنا مختصر ہے کہ صرف پانچ ہزار اشعار ہوں گے۔

۳۔ چونکہ تذکروں میں اس کی "غزل" اور "مثنوی" کے نمونے نہیں ملتے تو

ایک "محقق" یہ کہنے پر مجبور ہے کہ اس نے ان اصناف سخن پر طبع آزمائی نہیں کی۔

پہلے دعوی کے متعلق عرض ہے کہ فی الحال اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ایک شاعر نے صرف قصائد، رباعیات اور قطعات لکھے تھے تو وہ کیوں کر "چھوٹا" شاعر کہلائے گا؟ میرا خیال ہے کہ اگر ایک شخص ان تین اصناف کے بجائے صرف ایک ہی صنف پر طبع آزمائی کرے تو اس وقت بھی وہ شاعر کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ خیام نے اگر صرف رباعیاں ہی لکھی تھیں تو اسے آپ "شعرا" کی صف سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ غالب نے اردو میں اگر غزلیں ہی لکھیں تو اسے آپ "استاذان سخن" میں شمار کرنا نہیں چھوڑ سکتے۔ کسی شاعر کا چھوٹا اور بڑا ہونا اس کے کلام کی کمی بیشی پر مبنی نہیں ہے اور کلام جب تک نظر سے نہ گزرا ہو اس وقت تک تو فتویٰ صادر کرنا بھی مناسب نہیں ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ پروفیسر صاحب نے تو محولہ تذکرے بھی بغور ملاحظہ نہیں فرمائے۔ انھوں نے لباب کا حوالہ ضرور دیا ہے لیکن اگر وہ اسے ملاحظہ فرماتے تو انھیں یہ عبارت (ج ۲۔ ص ۲۷۰ پر) نظر آتی۔

"آں حسن نام عالی کلام کہ نتیجۂ ناصر بود و عالم فصاحت را یکی از عناصر بلاغت طبع ذکی او را در ایام کودکی گردن دادہ و فصاحت سر بر خط بیان او نہادہ، جہان پیر جوانی چنو نہ دیدہ و مادر زبان فرزندی مثل او نا پروریدہ، تا خازن زبان در خزانۂ بیان او بر کشاد دامن و کنار فضلا پُر دُرِ غرر نقود لطائف نہ شد و تا کاتب ادیب وار فلک اشعار تر آبدار او را براوراق اطباق جہان تحریر کرد آب را در لطافت آبی نہ ماند و اور ایک قصیدۂ مفاخرت با چندان معانی بکر و نبات فکر تمام است و عاقل باید کہ این قصیدہ را بہ تامل بخواند و در معانی او تفکر بلیغ کند تا بر کمال تبرز او درین شیوہ واقف گردد............"

تذکرہ نویسوں کی رائے نقل کر دینا کسی شاعر کے اوصاف شاعری بیان کر دینے کے لئے کافی نہیں ہے۔ لیکن یہاں لباب کا بیان محض اس لئے نقل کیا گیا ہے کہ پروفیسر صاحب نے اس کا حوالہ (ص ۲۵۲۔ ح) دیا ہے گو کہ اس کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ وہ شروع میں یہ نہ لکھتے کہ وہ زیادہ تر "صوفی" ہی ہے۔ اگر وہ لباب ہی کو بغور ملاحظہ فرماتے تو اس میں حسن کی

بدیہہ گوئی کا تذکرہ بھی ملتا۔ دوسرے دعویٰ میں یہ بیان ہے کہ (بقول صاحب مجمع الفصحا ج ا۔ ص ۱۹۲) اس کے دیوان میں پانچ ہزار اشعار ہیں۔ اس لئے مختصر ہے۔ یہ بھی خوب رہی۔ یعنی پانچ ہزار اشعار کی تعداد کم ہوتی ہے۔ عنصری ابوالفرج رونی اور عثمان مختاری وغیرہ شعرا جن کا کلام اس تعداد سے بہت کم ہے اور جن کا تذکرہ ان کی کتاب میں موجود ہے شاید ''سہواً'' ''شاعر'' مان لئے گئے ہیں۔ کلام کی ''کمیت'' کو اس کی ''کیفیت'' کے لئے ضروری قرار دینا کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے؟ اور معلوم نہیں ''کمیت'' والا اصول کہاں چلا جاتا ہے جب کہ پروفیسر صاحب نے چند اشعار کی بنا پر متعدد لوگوں کو اپنی کتاب میں شاعر قرار دیا ہے۔

اب تیسرے دعوے کی حقیقت دیکھئے۔ کیا ایک ''محقق'' کا فرض اتنا ہی ہے کہ شاعر کا حال کسی تذکرے میں دیکھ کر یہ کہہ دے کہ چونکہ تذکروں میں فلاں فلاں صنف شاعری کے نمونے نہیں ملتے اس لئے شاعر نے ان پر طبع آزمائی ہی کی نہیں ہوگی؟ ''مثنوی'' تو ضرور سید حسن کے یہاں نہیں لیکن ''غزلیں'' بیسوں ہی ہیں اور ایسی ہیں کہ اس کی معاصرین کے یہاں بھی (سوائے سنائی (۱۶۰) کے) کم دیکھنے میں آئیں گی۔ اس کے متعلق بحث آگے آئے گی اس لئے یہاں کچھ لکھنا بے کار ہے۔

پھر صفحہ ۲۵۳ پر فرماتے ہیں کہ سید حسن نے مکہ معظمہ سے ایک قصیدہ سلطان ابراہیم (غزنوی) کے پاس لاہور بھیجا۔ یعنی سید حسن جس نے ۵۴۵ھ میں حج کیا تھا (جیسا کہ ہم اوپر ثابت کر چکے ہیں) اس نے ۴۹۲ھ میں مرے ہوئے بادشاہ کے پاس یعنی حج کرنے سے تقریباً ساٹھ سال پہلے مکہ معظمہ سے وہ قصیدہ بھیجا تھا۔ اور اگر ''ابراہیم'' کو سہو قلم مان لیا جائے کیونکہ بہرام شاہ کا نام ایک شعر میں موجود ہے تو یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ وہ قصیدہ مکہ معظمہ سے بھیجا تھا۔ گو کہ (راحت الصدور ص ۱۹۲ میں بھی یہی لکھا ہے) وہ قصیدہ دراصل اس نے مدینہ طیبہ کی بھی زیارت کے بعد بھیجا تھا جیسا کہ ہم اوپر ثابت کر چکے ہیں۔ آخر میں یہ عرض کروں گا کہ پروفیسر صاحب نے سید حسن کے ساتھ بڑی بے التفاتی فرمائی۔ اگر وہ راحت الصدور ہی ملاحظہ فرما لیتے تو شاید انھیں اپنی رائے بدلنی پڑتی۔

کلام حسن کا جائزہ

قصیدہ

قصیدے کی ابتدا کے متعلق کوئی یقینی ثبوت مہیا نہیں کیا جاسکتا۔ عباس مروزی کے بعض اشعار جو قصیدے سے تعلق رکھتے ہیں اور جو عوفی نے لباب (ج ۱۔ ص ۲۱) میں نقل کئے ہیں وہ ۱۹۳ھ / ۸۰۹ء میں مامون بن ہارون الرشید کی مرو میں آمد کے وقت لکھے گئے تھے۔ پروفیسر براؤن (ج ۱۔ ص ۱۳) اور مرزا قزوینی (بست مقالہ۔ ص ۵۰) متشکک نظر سے دیکھتے ہیں اور حافظ شیرانی صاحب کتاب "تنقید شعر العجم" (۳۹) میں مرزا موصوف کی طرح ان کے متعلق لکھتے ہیں۔

"عباس مروزی کے اشعار میں عربی الفاظ کی کثرت اس بنا پر ہے کہ متاخرین نے ان کو اصلاح دے کر اپنے رنگ میں رنگ دیا ہے...... عوفی کے عہد سے پیشتر کا نسخہ اگر دستیاب ہو جائے تو ہم معلوم کر سکیں گے کہ ان میں اور ان میں بہت تفاوت ہو گا۔ بلکہ وزن بھی مختلف ہو گا کیونکہ عباس کے عہد میں فارسی زبان میں رمل مثمن میں اشعار لکھے جانے قرین قیاس نہیں......" (۱۶۱) اور آگے چل کر یعنی مروزی کے بہت بعد اور دقیقی طوسی (۳۴۱ھ / ۹۵۲ء) کے سلسلے میں حافظ صاحب (ص ۴۳) فرماتے ہیں کہ "......ایرانی شعرائے متقدم قصیدے کے میدان میں 'بر خلاف مثنوی کے' قافیہ یا شکوہ الفاظ کی غرض سے عربی الفاظ مستعار لیتے رہے ہیں۔" بہر حال ان اقتباسات سے یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ مروزی کے اشعار اصل نہیں ہیں اگر صلی ہوتے تو عربی الفاظ کی کثرت نہ ہوتی کیونکہ یہ کثرت دراصل بعد والوں نے (شاید شعرائے عہد سامانی نے) اختیار کی ہے۔ غرض کہ حافظ صاحب نے (ص ۳۱) رودکی (۳۲۹ھ / ۹۵۱ء) کو قصیدہ نگاری کا مبتدع قرار دیا ہے اس کا ایک قصیدہ ملک الشعرا بہار کی مرتبہ تاریخِ سیستان (۳۱۷/۳۲۳) میں ملتا ہے جس میں ۹۴ شعر ہیں۔ نمونے کے لئے کچھ نقل کئے جاتے ہیں۔

مادرمی را بکرد باید قربان
بچهٔ او را گرفت و کرد بزندان
بچهٔ او را ازو گرفت ندانی
تاش نکوبی نخست وزو نکشی جان
جز که نباشد حلال دور بکردن
بچهٔ کوچک ز شیر مادر و پستان
تانخورد شیر هفت مه بتمامی
از سرِ اردی بهشت تا بن آبان
آنگه شاید ز روی دین و رهِ داد
بچه بزنداں تنگ و مادر قربان
چون بسپاری ، بحبس بچه او را
هفت شبانروز خیره ماندو حیران
باز چوں آید بهوش و حال ببیند
جوش بر آرد بنالد ازدل سوزان
گاه زبر زیر گردد از غم و گه باز
زیر ز زبر همچنان ز اندهِ جوشان
و آنک بشادی یکی قدح بخورد زوی
رنج نبیند از آن فراز ونه احزان
انده ده ساله رابه طنجه نه ماند
شادی نورا ز رے بیارد و عمان
بامی چونین که سال خورده بودد چند
جامه بکرده فرا ز پنجهٔ حلقان

مجلس باید بساخته ملکانه
از گل و از یاسمین و خیری الوان
نعمت فردوس گستریده زهر سو
ساخته کاری که کس نسازد چونان
جامه زرین و فرشهای نو آئین
شهره ریاحین و تختهای فراوان
خسرو بر تخت پیش گاه نشسته
شاه ملوک جهان امیر خراسان
ترک هزاران بپای پیش صف اندر
هر یک چون ماه بر دو هفته درفشان
هر یک برسر بساک مورد نهاده
روش می سرخ و زلف و جعدش ریحان
باده دهنده بتی بدیع ز خوبان
بچهٔ خاتونِ ترک و بچهٔ خاقان
زان می خوش بوی ساغری بستاند
یاد کند روی شهر یار سجستان
خود بخورد نوش و اولیاش همیدون
گوید هر یک چو می بگیرد شادان
شادی بو جعفر احمد بن محمد
آن مه آزادگان و مفخر ایران
مدح رسول است عذر من برساند
تا بشناسد درست میر سخن دان

عذر رہی خویش ناتوانی و پیری
کو بتن خویش از آن نیامد مہمان
دولت میرم ہمیشہ باد بر افزون
دولت اعدای او ہمیشہ بنقصان

اتنے اشعار نقل کرنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ ہم کو فارسی کے سب سے پہلے (مستقل) قصیدے کا پورا نمونہ ذہن نشین ہو جائے اور معلوم ہو سکے کہ رودکی نے قصیدے کو کس طرح اور کن اجزا سے مرکب کیا تھا اس قصیدے پر نظر کرنے سے پہلے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ایک دن نصر بن احمد شراب کی محفل گرم کئے ہوئے تھا کہ اس نے امیر ابو جعفر احمد بن محمد کو بہت یاد کیا اور اس نے اسی وقت اس کے لئے شراب 'غلام 'لونڈی' گھوڑے اور مختلف قسم کے انعام و اکرام روانہ کئے ان باتوں کو ذہن میں رکھ کر وہ قصیدے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ رودکی نے محض حقیقت نگاری کی ہے۔ تشبیہات و استعارات سے ضرور اپنے اشعار کو زینت دی ہے لیکن خیالات سادہ ہیں۔ تکلف اور تصنع بہت کم ہے اور اصل واقعات کو من و عن بیان کر دیا ہے۔ ابو جعفر کی مدح کے اشعار گو کہ ہم نے نقل نہیں کئے لیکن وہ بھی سادہ خیالات اور سلیس زبان میں ادا کئے گئے ہیں۔ آخر میں رودکی پھر حقیقت نگاری کرتا ہے اور اپنی ضعیفی کا عذر پیش کرتا ہے۔ اور پھر دعائیہ اشعار لکھتا ہے۔ ممکن ہے کہ بعد والے قصیدے کو شعرا نے عربی سے نہیں تو یہیں سے تشبیب کا نمونہ دیکھ کر اسے خود بھی رسماً اختیار کر لیا ہو گو کہ رودکی کے یہاں شراب اور عشق و سرود کی محفل کا ذکر حقیقت پر مبنی تھا۔

رودکی کے ہم عصر دقیقی طوسی (۳۴۱ھ / ۹۵۲ء) نے قصیدے (۱۶۲) لکھے تھے لیکن ہم تک پورے پورے نہیں پہنچے۔ اس کے قطعات سے ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے بھی عربی شعرا کی تقلید میں اس عہد کی ہر صنف نظم کی طرح قطعات میں بھی تسلسل قائم رکھا تھا۔ لیکن یہ بات اس صنف نظم کے لئے کوئی غیر معمولی نہیں ہے۔ اس کے قطعات جو

ممکن ہے کہ اس کے قصیدوں سے تعلق رکھتے ہوں اپنی لطیف تشبیہات واستعارات کے علاوہ کسی حد تک عربی الفاظ سے بھی پر ہیں اور یہ بات اس عہد کی خصوصیات میں سے ہے گو کہ یہ دعوی نہیں کیا جاسکتا کہ زیادہ تر الفاظ (خصوصاً قوافی میں) عربی کے ہیں۔

لباب (ج ۲۔ ص ۱۳، ۱۵، ۱۶، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۲، ۲۷ وغیرہ) میں عہدِ سامانی کے متعدد شعرا کے قصائد کے اشعار ملتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اچھی اچھی تشبیہات و استعارات کا رواج ہونے لگا تھا۔ لیکن خیالات پھر بھی سادہ ہیں۔ اور کوئی بات ایسی نہیں ہے کہ کچھ دیر سوچنے کی ضرورت ہو۔ تکلف اور تصنع کا رواج اس زمانے میں تو ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ ابھی قصیدہ گوئی تو کیا، خود شاعری ابتدائی منازل میں تھی۔ زبان میں تکلف اور خیال میں ترفع نہیں تھا۔ شعرا جو کچھ دیکھتے تھے بلا تکلف ادا کر دیتے تھے۔ گو کہ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایران کی بہار اور رنگین ماحول نے نئی نئی تشبیہات واستعارات کا ذخیرہ مہیا کرنا شروع کر دیا تھا۔

اب ہم عہد آل سبکتگین میں آتے ہیں اور یہی عہد دراصل ہماری بحث کا مدعا ہے۔ محمود غزنوی وغیرہ کی شعر نوازی نے متعدد بڑے بڑے شعرا پیدا کر دیئے تھے۔ عنصری عسجدی، منوچہری، فرخی، ان میں خاص شہرت کے مالک ہیں۔ چنانچہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے دو ایک کا تذکرہ کیا جائے فرخی کے متعلق جناب شادان بلگرامی نے اورینٹل کالج میگزین (اگست، نومبر ۱۹۳۶ء فروری۔ مئی، اگست ۱۹۳۷ء) میں تفصیل سے بحث کی ہے اس لئے ہم انہی کے خیالات کا خلاصہ یہاں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

فرخی (۴۲۹ھ / م ۱۰۳۸ء) گو کہ ایسے عہد سے تعلق رکھتا ہے جبکہ دور از کار تشبیہات اور تکلف سے کام لیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے یہاں فصاحت، سلاست اور روانی ایسی ہے کہ کہیں تعقید اور آورد نظر نہیں آتی۔ صنائع و بدائع کا برمحل استعمال مناظرِ قدرت کی دلکش تصویر، مدح ممدوح کی طرف نازک تخلص مبالغہ اور لطیف تشبیہات کا لطف سب کچھ موجود ہے۔ واقعہ نگاری کو اس نے اپنا خاص فن بنالیا تھا۔ محمودی فتوحات کے حالات کو بے

کم و کاست بڑی دلکشی کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ بلکہ بعض واقعی چیزوں کی بھی تصویر کھینچنے میں ماہر ہے۔ اس پر واقعہ نگاری اس قدر غالب ہے کہ تشبیب میں بھی جو کہ دراصل غزل ہوتی ہے اپنے اس انداز کو قائم رکھتا ہے اس کے ایک مشہور قصیدے کے چند اشعار بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

چون پرندِ نیلگون بر روی پوشد مرغزار
پرنیانِ ہفت رنگ اندر سر آرد کوہسار
خاک را چون نافِ آہو مشک زاید بی قیاس
بید را چون پر طوطی برگ روید بی شمار
دوش وقتِ نیم شب بوی بہار آورد باد
حبّذا بادِ شمال و خرّما بوی بہار
باد گوی مشک سودہ دارد اندر آستین
باغ گوئی لعبتان جلوہ دارد در کنار
نسترن لولوی بیضا دارد اندر مرسلہ
ارغوان لعلِ بدخشان دارد اندر گوشوار
تا برآمد جامہای سرخ گل بر شاخِ گل
پنجہ ہای دست مردم سر فرو کرد از چنار
باغ بو قلمون لباس و شاخ بو قلمون نمای
آب مروارید گون و ابر مروارید بار
راست پنداری کہ خلقت ہای رنگین یافتہ
باغہای پُر نگار از داغ گاہِ شہریار
داغ گاہِ شہریار اکنوں چنان خرّم بود
کاندرو از خرّمی خیرہ بماند روزگار

یہ قصیدہ محمودی دربار میں پہنچنے کے قبل صرف ایک رات میں لکھا گیا تھا تاہم اس کی دلکش تشبیہات، فصاحت، روانی اور برجستگی ایسی ہے کہ اس وقت کے بہت کم قصیدوں میں نظر آئے گی۔ واقعہ نگاری جو اس قصیدے میں آخر تک پائی جاتی ہے ایسے دلفریب انداز میں ہے کہ دوسرے شعرا کے یہاں شاذونادر ہی ملے گی۔

اب اسی دور کے دوسرے شاعر یعنی عنصری کے شاگرد منوچہری (م ۱۰۴۱ء) کا تذکرہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس کے متعلق صوفی ضیاء الحق صاحب نے ایک طویل مضمون اورینٹل کالج میگزین (مئی نومبر ۳۷ء۔ فروری ۳۸ء) میں شائع کرایا تھا اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ اس کے بہت سے قصیدے بلحاظ موضوع و زبان زمانۂ جاہلیت کے عربی قصیدوں کا اعلا نمونہ ہیں۔ تشبیب، تخلص، مدح اور مقطع وغیرہ سب میں عربی قصیدوں کے لوازم پائے جاتے ہیں۔ بلکہ عربی مصرعے اور الفاظ بکثرت ہیں۔ بعض قصیدوں میں لغز اور چیستان بھی ہے۔ اور صنائع و بدائع بھی دیگر شعرائے فارسی سے کم نہیں ہیں۔ غیر جاندار چیزوں اور مناظر قدرت کے بیان کرنے میں غیر معمولی قدرت رکھتا ہے۔ اس کے استعارات و تشبیہات میں خصوصیت کے ساتھ زچگی، حمل، دایہ وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے اور یہ اس کا محبوب ترین موضوع ہے۔ اس کے ایک مشہور قصیدے کے کچھ اشعار نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں:

الا یا خیمگی خیمہ فرو ہل
کہ پیش آہنگ بیرون شد ز منزل
تبیرہ زن زدہ طبل نخستین
شتر باتان ہمی بندند محمل
نماز شام نزدیک است امشب
مہ و خورشید را بینم مقابل

ولیکن ماه دارد قصدِ بالا
فرو شد آفتاب از کوهِ بابل
چنان دو کفه سیمین ترازو
که اینِ کفه شود زان کفه مائل
نه دانستم من ای سیمین صنوبر
که گردد روز چونین زود زائل
من و تو غافلیم و ماه و خورشید
برین گردون گردان نیست غافل
نگارینِ منا ! بر گرد و مگری
که کارِ عاشقان را نیست حاصل
زمانه حامل هجر است و لابد
نهد یک روز بارِ خویش حامل
نگارِ من چو حالِ من چنین دید
بیارید از مژه باران وابل
مرا گفت ای ستمگار بجانم
بکام حاسدم گردی تو عاذل
ترا کامل همی دیدم به هرکار
ولیکن نیستی در عشق کامل
نگار خویش را گفتم نگارا
نیم من در فنون عشق جاهل
ولیکن اتفاق آسمانی
کند تدبیر های مردُ باطل

غریب از ماه والا تر نه باشد
کہ روز و شب همی برد منازل
چو برگشت از منَ آن معشوقِ ممشوق
نہادم صابری را سنگ بر دل
نگہ کردم بگردِ کاروان گاہ
بجاے خیمہ وجای رواحل
نہ وحشی دیدم آن جا و نہ انسی
نہ راکب دیدم آن جا و نہ راجل
نجیب خویش را دیدم بہ یک سوی
چو دیوی دست و پا اندر سلاسل

غرض کہ بڑی طول، طویل تشبیب ہے۔ پھر گریز، مدح، حسن طلب، مقطع (دعائیہ) وغیرہ سب پر عربی عنصر غالب نظر آتا ہے۔

ان کے بعد ابو الفرج رونی کا نمبر آتا ہے اس کی شاعرانہ شخصیت کا اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے انوری جیسا باکمال قصیدہ گو بھی اس کا مقلد ہے اور اس کے کمالات کا معترف (کلیات انوری ص ۶۷، ۱۷۵، ۱۷۲ وغیرہ) ہے۔ چونکہ انوری کے قصائد کے متعلق یہاں بحث کرنا غیر ضروری ہے اس لئے ہم صرف ابو الفرج کے ایک قصیدے کا نمونہ دے کر آگے بڑھتے ہیں۔

بدیع نیست بہ شب دیدنِ ستارہ در آب
بہ روز بین کہ سپہری ست پر ستارہ بر آب
زمین چو آینہ صورت نمای گشت مگر
ز گل نماند میانِ ہوا و آب حجاب

گل غنودہ بہ بوی از بہشت یافتہ بہر
چو نیک بختان بر خاست بانشاط از خواب
تو گوی اورا بلبل گہ غنودن او
نمودہ بود بتلقین خواب راہ صواب
تو این طراوت و این خرّمی بہ دشت و بہ باغ
ز سعیِ میغ مدان و ز یمن شاہ بیاب
کہ میغہای دژم را بخشک سال اندر
یمین شاہ معونت کند بہ فتح الباب
امیرِ عادل محمود سیفِ دولت و دین
کہ پیش کار دل و دست اوست بحر سحاب
خدایگانا فرمانِ تو براند و بداشت
زمان بدستِ عنان و زمین بپای رکاب
توی کہ سہم تو برباید از حوادثِ جنگ
توی کہ چشمِ تو بستاند از نوایب ناب
ہمیشہ تا بہ نموز و بدی بکار شود
لباس توزی و کتان و قاقم و سنجاب
جہان توجوی، و ولایت توگیر، و گنج تو بخش
سپہ توران، و بزرگی تودار، و کام تویاب (۱۶۳)

دیکھئے اس کی تشبیب بھی کتنی اچھی ہے۔ کیسے اچھے اچھے مضامین پیدا کئے ہیں۔ پھر گریز، اصل مدح اور دعائیہ کے اشعار سب عربی تقلید میں ہیں لیکن رونی کے قصائد صرف ان اجزا سے مرکب نہیں ہیں۔ بلکہ عنصری اور فرخی کی طرح اس کے یہاں ممدوحین کے سفر، رزم، بزم، اوصاف، اخلاق، فتوحات، واقعات اور مختلف کیفیات کا بھی تذکرہ ملتا ہے

جن سے اس عہد کی تاریخ میں بڑی مدد ملتی ہے۔ یہی بات آپ سید حسن کے قصائد میں بھی پائیں گے جس کی بنا پر ہم نے تاریخ بہرام شاہی مرتب کی ہے۔اب سید حسن کے قصائد کی طرف آیئے جو تعداد میں ۹۵ ہیں اور ان کے اشعار کی تعداد کم و بیش پونے تین ہزار ہے۔ اس کے یہاں پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ واقعات اور حالات کے متعلق مختلف اہم اشارات ملتے ہیں۔ جن سے ایک طرف اگر اس عہد کی تاریخ میں مدد ملتی ہے تو دوسری طرف خود شاعر کی قدر دانی کا حال معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ عمر بھر بھٹئی یا خوشامد کرنے کا پیشہ کون اختیار کرتا ہے؟ سید حسن نے دس بیس نہیں بلکہ ۵۰۰ھ سے ۵۵۶ھ تک یعنی کم از کم ۵۵ سال مدح سرائی کی ہے۔ متعدد وزرا' امرا' اور سلاطین کے نام کو زندہ کیا ہے اس طرح اس عہد کی تاریخ کو مرتب کیا ہے۔ ان ممدوحین کے دربار میں رسائی حاصل کر کے مسلسل مشق کے ساتھ ساتھ ادب میں اضافہ بھی کیا ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ جو شخص تقریباً نصف صدی تک مدح سرائی کرے گا وہ شاعری کی ایک ہی ڈگر پر نہ چلے گا بلکہ اپنی طبیعت کو اپج اور اختراع کے لئے آمادہ کرے گا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے شروع کے قصائد تو ضرور سادہ تمہید کے ساتھ ہیں۔ مثلاً ۵۰۰ھ میں وہ ایک قصیدہ لکھتا ہے:

نسیم عدل ہمی آید از ہوای جہاں
شعاع بخت ہمی تابد از لقای جہان
خرد کہ جائے نہ دارد نہ داند این کہ کرد
خدا یگان جہان از کرم بجای جہان
خرد کہ دولت و دین ہر دو تہنیت گویند
خدا یگان جہان را بہ کد خدای جہان

لیجئے دو تین شعر میں تمہید ختم ہو گئی اور کوئی خاص خیال بندی یا لطافت نہیں ہے۔ ۵۱۰ھ میں ایک قصیدہ یہ لکھا تھا۔

مرا بہ وقت سحر دوش مژدہ داد نسیم
کہ شہریارِ جہان بادشاہِ ہفت اقلیم
خزا نہای ممالک ہمہ مفوض کرد
برای آنکہ بحق یافت در جہان تقدیم
نظامِ ملک و قوامِ جہان خداوندی
کہ کرد جانب او را خدایگان تعظیم

لیکن اسی سال یہ قصیدہ بہاریہ تمہید کے ساتھ لکھا تھا۔ نئ نئ تشبیہات واستعارات کا نگار خانہ سجایا ہے۔ اور قدما کی طرح (شعر العجم ج ۵۔ ص ۲۔ ۱۹۱۸ء) ہم وزن الفاظ کا التزام بھی ہے۔ بہرام شاہ غزنوی کی مدح میں ہے۔

بادِ آتش بار چون از روی دریا بر شود
خاکِ پژ مردہ ز آبِ زندگانی تر شود
گہ چو یوسف شاہدی از چاہ بر تختی رود
گہ چو آدم صورتی از خاک جان آور شود
یک قدم روید گیاہی را و با صد جان بود
یک بدن باشد نہالی را و با صد سر شود
روی بستانِ بنفشہ زلفِ لالہ رخ نمود
پر ز چشم نرگس و ابروی سیمین بر شود
چون شبِ زنگی لقا از خوابِ خوش برخستہ شد
روز روی چہرہ را چہرہ کشادہ تر شود
آب دست آویز کردہ از شعاع آفتاب
چون رسن بازی بسوی چرخ چون چنبر شود

تا زداید رنگِ شب ز آینہ روزِ آفتاب
ہر سپیدہ دم ز زخمِ تیغ روشنگر شود
ہر زمان تا لعبتانِ باغ در خندہ شوند
برقِ آتش بار اندر آبگون چادر شود

غرض کہ اس قسم کے متعدد اشعار تمہید میں ملتے ہیں اور یہ عجیب بات ہے کہ خراسانی ممدوح کے متعلق جو دو قصیدے اوپر مذکور ہوئے ہیں ان میں نہ تو ایسی طویل تمہید ہے اور نہ ایسی لطیف تشبیہات و استعارات ہیں بلکہ کچھ اور قصیدے بھی خراسان میں لکھے ہوئے اسی قبیل کے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس جو قصیدے سید حسن نے غزنوی دربار میں لکھے ہیں وہ انھیں تصنعات سے پر ہیں' ایک قصیدہ تو ابھی مذکور ہوا ایک اور اسی زمانے سے متعلق دیکھئے۔

خاک را چاک زد ای دوست گیاہ
عمر برباد مدہ بادہ بخواہ
بی نظر چشمِ شگوفہ ست سپید
بی گناہی دلِ لالہ ست سیاہ
در چمن عود ہمی سوزد یار
بر فلک رنگ ہمی ریزد ماہ
شود آئینۂ گردون تاریک
ہرزمانی کہ کند دریا آہ
نیک و بد می کند آن روز بروز
تانیفتد ز طرب گاہ بہ گاہ
می بہ دست آر چہ خیزد ز خرد
گل شفیع ست چہ ترسی ز گناہ

همه بر صورت دیده نرگس

همه بر شکل زبان است گیاه

تا ببینند بر آن صنع خدای

تا بگویند بدین مدحت شاه

شاه بہرام کہ گیرد عالم

همه تاریک دو مہ انشاء اللہ

کہنے کو تو یہ شعر غزلیات میں شامل ہیں لیکن اس کی دلکش اور لطیف تمہید' صنائع لفظی و معنوی سے پُر ہے اور غزنوی ممدوح سے تعلق رکھتی ہے جس سے ظاہر ہے کہ اس قسم کے اشعار غزنوی دربار میں پسندیدہ سمجھے جاتے تھے اور وہاں کا ادبی و علمی ذوق خراسان سے بلند تھا گو کہ اس میں شک نہیں کہ خراسان کی زبان (تنقید شعر العجم ص ۲۲۹) اس زمانے میں ٹکسالی سمجھی جاتی تھی۔

کبھی مسعود سعد سلمان (ص ۶۱۱۔ دیوان طبع ۱۳۱۸) کی طرح سید حسن نے بھی ممدوح کی زبان سے مدح سرائی کی ہے:

آرامش و رامش همگان را بدرِ ماست

بخشایش و بخشش رہ جدّو و پدر ماست

اور چونکہ غزنوی (بہرام) کی مدح میں ہے اس لئے وہی تصنعات موجود ہیں (جن کو ہم طوالت کے خیال سے چھوڑتے ہیں) لیکن پھر خراسانی ممدوح کی تعریف میں معمول کے مطابق بغیر تمہید کے خطابیہ قصیدہ لکھا ہے:

زہی ز روی زمین بر گزیدہ شاہ ترا

بر آسمانِ شرف دادہ پا یگاہ ترا

امیرِ عادل تغری طغانِ دریا دل

کہ جان سپارد از دل همه سپاہ ترا

اس کے کچھ عرصے کے بعد سید حسن کے یہاں ایک نئی تمہید ملتی ہے جو بعد میں انوری کے یہاں (تنقید شعر العجم ص ۲۷۰ بعد) ترقی پاتی ہے۔ اور جو دراصل عربی کی تقلید میں (شعر العجم ج ۴۔ ص ۱۲۰، ۱۲۱۔ ۱۹۱۸ء) ہے یعنی میں نے امید پر سفر کیا کہ میرا معاملہ بہتر ہو جائے گا۔ لیکن بڑی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی پریشانی میں ایک حسنین آیا اور مجھے سمجھانے لگا وغیرہ وغیرہ اس قصیدے کے کچھ اشعار یہ ہیں:

چو عزم کردم سوی سفر برای صواب
بریده گشت امیدم ز دیدنِ احباب
بر آن امید که بهتر شود دگر کارم
همی رسید هزاران هزار رنج و عذاب
گهی چو مور بکوشیدم از پیِ اخوان
گهی چو مار به پیچیدم از غمِ اصحاب
درین تفکر بودم که آن بتِ سرکش
برِ من آمد بی التماس من به شتاب
همی فروخت رخش چون بر آسمان عیسی
همی طپید دلش چون بر آینه سیماب
گهی فگندی مشک از دو سنبلِ پرُ چین
گهی فشاندی در از دُو نرگس سیراب
بشد ز شرم همی گفت کآخرای بد عهد
مکن چنین و دلم را به وصل اندریاب
مگر بخواب دری زان همی نمی دانی
که بیش اگرچه بکوشی نه بینیم در خواب

چہ کردہ ام کہ چنین بر گرفتی از من دل
چہ شد گہ خانۂ مہرم ہمی کنی تو خراب
مگر کہ عہدِ مرا پاک دادۂ برباد
مگر کہ نامِ مرا نقش کردۂ بر آب
اگرچہ ہست خطا رفتنِ من از پیشت
شدن بہ پیش خداوند خویش ہست صواب

اور چند سال کے بعد یعنی ۵۳۵ھ کے قریب ایک قصیدے کی تمہید میں شام کا منظر (جو انوری کے یہاں بھی ہے تنقید شعر العجم ص ۲۷۰) وہ اس طرح کھینچتا ہے۔

چون شمع روز روشن از ایوانِ آسمان
ناگہ در اوفتاد بہ دریای قیروان
دوشِ زمین و فرقِ ہوا را ز قیر و مشک
بیم سپہر ، کور ردا کردو طیلسان
آورد پایِ مہر چو در دامنِ زمین
بگرفت دستِ ماہ گریبانِ آسمان
بر طارمِ فلک چومہ زنگ شد مکین
در خاک تیرہ شد ملک روم را مکان
گردون چو تاجِ کسری بر معجزات حسن
از دُرّ و لعل چترِ سکندر برو نشان
یاہمچو شکل چرخِ زمرّد بہ پیشِ جم
بر روی او فشاند ہمی گنجِ شایگان
زہرہ چو گوی سیمین بر چرخ دوربین
دنبالِ برجِ عقرب مانند صولجان

بہرام تافت ازفلکِ پنجمین ہمی
چندان کہ دید چرخ کند سدرہ ہر زمان
برجیس چون شامۂ کافور پُر عبیر
کیوان چو در بنفشہ ستان برگِ ارغوان
پروین بہ وقت آں کہ گران ترکنی رکاب
جوزا چوگاہ حملہ سبک ترکنی عنان
گردان بناتِ نعش چو مرغی کہ سرنگون
ناگہ بہ سوی آب خور آید ز آشیان
دیو از شہاب گشتہ گریزاں بر آن مثال
چون خصم منہزم ز سنانِ خدایگان
اندر شبی چنین کہ غضنفر شدی ذلیل
اندر شبی چنین کہ دلاولے (کذا) شدی جہان
من روی سوی راہ نہادہ بفالِ نیک
امیدِ خود بریدہ ز پیوند خانمان
راہی چنان کہ آیدازو جسم را خلل
راہی چنان کہ آید ازو روح را زیان
ریگش چو نیش کژدم و سنگش چو پشت مار
زین طبع را عفونت و زان عقل را فغان
در آب اوسمک نہ رود جز بہ سلسلہ
بر کوہ او فلک نہ رود جز بہ نردبان
ہرچند ریگ و سنگ وکہ و غار او نمود
رنجِ دل و بلای تن و آفت روان

ز و در دلم نہ بود خطر زان کہ ہمچو حور

راندم ہمی ثنای خداوند بر زبان

دیکھیں اس سے پہلے قصیدے میں سید حسن نے تمہید میں ایک سفر کا حال بیان کیا تھا لیکن اس قصیدے میں (چند سال کے بعد) رات اور سفر کے سماں کو کس لطافت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ تصنع و تکلف کے باوجود دلکشی اور دلآویزی بدرجہ اتم موجود ہے۔ اور بلا شبہ یہ قصیدہ متقدمین کے بہترین قصائد کے ساتھ رکھا جاسکتا ہے۔ اس قصیدے کے تخلص (گریز) کی برجستگی بھی قابل داد ہے۔ اور مختلف رعایات بھی لائق ستائش ہیں۔

چند سال کے بعد یعنی ۵۴۱ھ کے قریب کا ایک قصیدہ "فتاد" کی ردیف میں ہے۔ اور جس طرح قاآنی (شعرالعجم ج۵ ۔ ص۱۹) ایک قصیدے میں "افتد" ردیف سے کئی پہلو نکالتا ہے سید حسن نے اس سے سات سو سال پہلے "فتادہ" کے مختلف پہلوؤں میں پیش کیا ہے اور گو کہ وہ قصیدہ غزنوی وزیر کی مدح میں ہے اور بغیر کسی خاص تمہید کے شروع ہوتا ہے تاہم قوافی کی بندش قابل تحسین و آفرین ہے۔

یارب چہ سوز بود کہ اندر جہان فتاد

سودِ حسود صدرِ جہان را زیان فتاد

صدرِ جہانیان حسنِ احمدِ حسین

کش دست و دل بہ جود سوی بحر و کان فتاد

خاک درش کہ آب حیات مراد ہاست

از جان دل خرید کہ بس رایگان فتاد

زین سہمگین سراب کہ ہرگز مباد آن

آتش نگر کہ در دلِ پیر و جوان فتاد

از وہم آن خیال فلک در فلک شکست

وز سہم این محال جہان در جہان فتاد

دشمن دو روئی کہ نمودہ ست ہمچو گل
از دل چو لالہ آتشش اندر دہان فتاد
مہ نورمی فشاند و سگ بانگ می زند
مہ راچہ جرم خاصیتِ سگ چنان فتاد

غرض کہ اس طرح کے ۲۰۔۲۱ شعر اپنی ردیف سے نئے نئے معنی پیدا کرتے ہیں اور شاعر کی قوتِ متخیّلہ سے نئے نئے مضامین پیش کرتے ہیں۔

اس کے بعد شاعر کا قصیدہ فخریہ آتا ہے جس کا وہ مبتدع ہے اور جس کی تفصیل ہم اوپر دیکھ چکے ہیں۔ایک اور قصیدہ اسی قبیل کا اور دیکھئے:

من نہ آن طوطیِ شکر شکنم
کہ صدف بود حقۂ دہنم
گنبدِ عقل طاقِ دستارم
گلشنِ جان رواقِ پیرہنم
صنم بر سریرِ فضل و ادب
تاج بخشانِ بحر و بر شمنم
فلکی کردہ گردشِ فلکم
زمنی کردہ جنبشِ زمنم
مجمرِ عود سوخت چون عودم
چنبرِ ماہ تافت چون رسنم
نم کشیدہ چو برگِ نسترنم
خم گرفتہ چو شاخِ نار و نم
توشۂ نہ کہ آن بود قوتم
گوشہ نہ کہ آں بود سکنم

هر چه آورد روز روزی ام
هر کجا در رسید شب و طنم
تاج سر داشت جبرائیل مرا
این زمان خاک پای اہرمنم
نیستم زنده پس اگر ہستم
بوفا و کرم کہ من نہ منم
گاہ تنگ آیدم ہمی کہ شوم
از کہ واللہ کہ ہم ز خویشتنم
ہم ز محنت چو کوہ شد جانم
ہم زکاہش چو کاہ گشت تنم
درد بی منتہاست در مانم
مرگ ہر ساعت است زیستنم
تن زند درمیان رہ صدر بار
تا ز خاطر بہ لب رسد سخنم
باری باری کہ سخت رنجورم
رحمتی رحمتی کہ ممتحنم

چھوٹی بحر ہے لیکن کتنی روانی ہے؟ کیسی اچھی اچھی تشبیہات و استعارات ہیں۔ شروع سے آخر تک اپنے فضل و کمال کے متعلق تعلی ہے یا پھر خستہ حالی بیان کی ہے۔ کل ۳۲ شعر ہیں اور گریز اکتیسویں شعر میں ہے اور اس خوبی اور برجستگی سے گریز آتا ہے کہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ یہ قصیدہ کسی کی مدح میں ہوگا آخر کے شعر ملاحظہ ہوں۔

چون خرندم کہ کفۂ مہ و مہر
بگسلد از گرانیِ ثمنم

سازِ خلق جہان و سوزِ خودم
تابدانی کہ شمعِ انجمنم
ہمہ تیز از من اندو من کندم
راست گوئی صحیفۂ فسنم
جمع در جسم و تفرقہ در ذات
بحقیقت ستارۂ پرنم
یارب آن نقشِ دولتم بنمای
کہ خلاصی دہد ازین محنم
گویدم ہیں بیار مژدہ کہ من
صورتِ صاحب اجل حسنم
بر زمین این چنیں ز من دانند
کہ نہ در صدر خواجہ زمنم

پھر ۵۴۸ھ کے قریب ایک نئی تمہید کا قصیدہ دیکھئے اور اس کے مضمون کے داد دیجئے۔

دیدم بہ خواب دوش براقی زنورِ جان
میدانش نہ ولیکن جولانش بی کران
بالای او وجود و ہم او ظاہر از وجود
پہنای او مکان و ہم او فارغ از مکان
مریخ روز سرو گاو زحل رکاب
خورشید روی و زہرہ نشاط و قمر عنان
از حلقۂ رکابش زینی سبک دلی
از کوکب مجرّہ برو ساختی گران

افتادہ ہمچو سنگی در راہ او زمین
برخاستہ چو گردی از نعلِ او زمان
وان گہ یکی فرشتہ بدیدم بران براق
کایزد برای رحمتش آورد در جہان
باز عقاب قدرت و طاؤس پر و بال
مرغ ہمای سایہ و سیمرغ آشیان
بالش ہزار و جملہ چو خورشید نوربخش
پر صد ہزار و بر ہمہ چون ابر دُرفشان
گفتم کہ این براق چہ و این فرشتہ کیست
دولت چہ گفت؟ گفت کہ آگہ شو و بدان
واللہ کہ آن براق فلک و آن فرشتہ ہست
خوارزم شاہ، اتسزِ شاہِ جہان ستان

اور ۵۵۲ھ کے قریب پھر ایک نئے مضمون کی تمہید لکھتا ہے اور اس طرح دعوی کرتا ہے:

مرا بگفت چہ حاجت کہ خود ہمی گوید
ہمیں قصیدہ کہ اعجوبہ ایست تا محشر
خدای داند اگر کس رسد درین ہرگز
یکی نکوست کہ توایدری و من ایدر

اب اصل قصیدے کی طرف توجہ فرمائیں:

خدای عزو جل داد بندہ را در سر
دو دیدبان کہ گرامی تر اندیک ز دگر

مطیع باشند شان سر چنان که سر را تن
عزیز دارد شان دل چنان که دل را بر
به شکل پیکان باشند و در نظر چون تیر
صفای خنجر دارند و پیشِ جان چو تبر
روند همچو دو پیکر یکی شوند به عزم
روند همچو دو فرقد یکی کنند نظر
چو عقل خامش در ظاهر و امیر سخن
چو چرخ ساکن در رویت و اسیر سفر
چو خاک نقش پذیر و چو آب عکس نما
چو نار تیز رو و همچو باد تیز خبر
همی روند چو آب و چو آب شان بی پای
همی پرند چو باد و چو بادشان بی پر
دو خرد لیکن دانا تر از هزار بزرگ
دو جزع لیکن زیبا تر از هزار گهر
چو آفتاب فروشد، فروشدن گیرند
که دیده نرگس کور است خوی نیلوفر
قمر به چرخ بود، نور بر زمین و چو عکس
مکان شان به زمین است نور شان به قمر
صفای آینه دارند هر دو و مژه ها
به پیش هر یک همچون دو شانه زیر و زبر
دو رهبر اند جهان بین و خویشتن بین نه
خود آنکه نیست چنین رهبر است و بی رهبر

سیہ سپید چو روز و شب اند و ہر یک را
عجب کہ از سیہی تابد آفتاب بصر
دو پیکر است در ایشان نشستہ چون دو فلک
کہ شان زخوبِ تخت ست و ز خیال افسر
تو خود نگہ کن آن گہ کہ نزد شان چو ملوک
ہر آن کہ قربت او بیش او معظم تر
ہزار منت حق را کہ داشت ارزانی
چنین نفیس دو گوہر بصدرِ حق پرور
قوام دولت و دین بو محمد طاہر
کہ دین و دولت از و یافتند زینت و فر

واقعی یہ تمہید "عجوبہ" ہے۔ سید حسن سے پہلے کسی نے اس قسم کا کوئی قصیدہ نہیں لکھا اور بعد میں بھی بہت کم شعرا کے ہاں ایسے نادر مضمون کی مثالیں مل سکیں گی مختلف لطیف تشبیہات و استعارات سے یہ قصیدہ بنایا گیا ہے۔ اور اتنا شگفتہ اور دل آویز ہے کہ کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ قصیدے کی شان و شوکت اور متانت کے ساتھ روانی' برجستگی' لطافت اور ندرت پوری طرح پائی جاتی ہے۔ اور اس لحاظ سے یہ قصیدہ کسی دور کے کسی قصیدے سے کم نہیں ہے:

اس کے بعد پھر خراسانی ممدوح یعنی سلیمان سلجوقی کی تخت نشینی ۵۵۵ھ میں ہمارا شاعر قصیدہ لکھتا ہے تو وہی۔ سادگی اختیار کرتا ہے جو عموماً اس کے یہاں خراسانی ممدوحین کے لئے مخصوص ہے:

شاہِ شاہانِ جہان بر تختِ سلطانی نشست
مردمِ چشمِ سلاطین در جہان بانی نشست

منت ایزد را کہ از نامش نشان خسروی
بر طرازِ جامہ رفت و در زر کانی نشست
منت ایزد را کہ در صدرِ خراساں و عراق
ہم خداوند عراق ہم خراسانی نشست
منت ایزد را جہان چون روضۂ فردوس گشت
وین ملک قدر و فلک قدرت بہ رضوانی نشست
مردم و دیو پری اکنون بہ خدمت ایستند
چون سلیمان شاہ بر تختِ سلیمانی نشست

سید حسن کا تاریخی قصیدہ اس کے بعد کوئی نہیں ملتا اور وہ آئندہ سال یعنی ۵۵۶ھ میں انتقال کر جاتا ہے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں شمس الدین محمد بن قیس الرازی کی کتاب المعجم فی معاییر اشعار العجم کا ذکر بھی کر دیا جائے۔ یہ کتاب اوائل قرن ہفتم ہجری کی تالیف ہے اور اس میں سید حسن کا ذکر کئی جگہ آیا ہے۔ اور چونکہ قصائد کی ابیات کے سلسلے میں ہمارا شاعر مذکور ہے اس لئے یہی مقام زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ صفحہ ۱۶۱ میں "التزام ما قبل تاہ تانیث" کے سلسلے میں اس کے قصیدے کے یہ اشعار ملتے ہیں:

چو دولت رفت بر تختِ امارت
مہ تاجش پذیرفت استدارت
وزیری جست چست و راد و مقبل
کہ باشد در ہمہ کارش مہارت

اور صفحہ ۱۷۲ میں "مختلف معنی" میں "سینی آس و دستاس و خراس" جیسے لفظوں کے ساتھ آنے کا جواز بتایا گیا ہے۔ اور مثال میں سید حسن کے یہ شعر نقل کئے ہیں:

بخواہ جام کہ سر چرب کرد خصم ترا
بشیشۂ تہی این آبگینہ رنگ خراس

موافقان را باست نہ مالدو چہ عجب
در آسیای فلک سنبلہ نہ گردد آس

صفحہ ۳۰۰ میں "حسن مطلع" کے سلسلے میں سید حسن کے "الفاظ عذب" والا ایک مطلع نقل کیا ہے:

ہر نسیمی کہ بہ من بوی خراسان آرد
چون دم عیسی در کالبدم جان آرد

اور صفحہ ۳۲۶۔۳۳۴ میں ہمارے شاعر کے دو قصیدوں کے اچھے اچھے اشعار بھی نقل کئے ہیں۔ لیکن ہم کو دراصل صفحہ ۲۴۱۔۲۴۳ کے ان اشعار سے غرض ہے جن میں تخلص (گریز) پر بحث کی گئی ہے۔ سید حسن کے گریز کا یہ شعر ہے:

زحد ببردم نی نی ہنوز سر مست است
ز جامِ جود و سخا طبعِ شادمان کرم

اور انوری کے تخلص والا یہ شعر نقل کیا گیا ہے:

بہ خشم گفت کہ چندین بہ رسم بی ادبان
مگوی مرثیۂ جود در برابر جود

پھر مولف نے رضی نیشاپوری کا حوالہ دیا ہے لیکن اس کے گریز کو "رکیک" کہا ہے۔ اور بعد میں ان شعرا کے متعلق ہے:

"...... وازین جہت تخلص انوری بہتر از تخلص سید حسن است کہ انوری خود را غافل ساختہ است از جودِ ممدوح تا قایلی او را آگہی می دہد کہ (مگوی مرثیۂ جود در برابر جود) و سید حسن گفتہ است نی نی۔ ہنوز شمہ ای از کرم ماندہ است وازین نیز قصور ممدوح درین خصلۂ شریفہ لازم آید......"

لیکن ایک آدھ جگہ اس قسم کے تخلص سے سید حسن کی استادی میں فرق نہیں آسکتا اس کی مہارت اور بزرگی کا مظاہرہ دوسرے مقامات سے ہو سکتا ہے۔ مثلاً

ایک جگہ معشوق کی زبان سے کہتا ہے:

اگرچہ هست خطا رفتنِ من از پیشت
شدن به پیشِ خداوندِ خویش هست صواب

ایک جگہ معشوق سے کہتا ہے:

دریاب دل کسی که آن کس
مداح امینِ شهر یارست

ایک اور جگہ کہتا ہے:

دست از جفا مدار که در آب غرقه شد
چشمِ حسن که خاکِ درِ شاهِ صفدر است

کچھ اور مثالوں کی سادگی اور برجستگی دیکھئے:

با عطارد شده ام هم قلم و این شرمم
از پیِ مدحتِ خورشیدِ زمین و زمن ست
حسن تو ز دولت خداوند ست
با ذکر حسن که جاودان ماند
وای آن خسته که دل را به چنان ماه برد
بخ بخ آن بنده که دل را به چنین شاه دهد
بسا طوطی که از بیضه تر و تازه برون آمد
جهان را همچو باز چتر سلطان زیر پر دارد
از شبِ زلف تو گمره نه مانم که مرا
روز اقبال امیر ست نکو راه بری

قصیدہ گو شعرا کے یہاں مطلع 'تشبیب' تخلص اور مقطع کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور ہمارا شاعر اپنے معاصرین مسعود سعد سلمان 'معزی' عمادی غزنوی 'ادیب صابر' عثمان

مختاری وغیرہ کے مقابلے میں کافی ممتاز ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس کی تمہیدوں میں ندرت وجدت، رنگینی ولطافت، اوصاف نگاری اور تشبیہات واستعارات کی فراوانی ہے۔ تخلص میں بھی کتنی برجستگی ہے لیکن دعائیہ اشعار میں کوئی گدایانہ استدعایا خوشامد نظر نہیں آتی اس کی وجہ کچھ تو یہ ہوگی کہ شاعر کو اکثر وبیشتر نوازا گیا ہوگا۔ کیونکہ اس کے یہاں بہت کم ممدوح کی بے التفاتی کا ذکر ملتا ہے اور دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ شاعر کو اپنے فضل وکمال کا احساس ہے اور وہ بارہا کسی حد تک صحیح معنی میں تسلی کر چکا ہے اس لئے خودی کا بھی پاس ہے بہر حال اس کا ایک پورا قصیدہ بھی یہاں نقل کر دیا جاتا ہے تاکہ اس کی قصیدہ گوئی کے تمام اوصاف کا ایک ہی جگہ اندازہ ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ وہ کس حد تک اس صنف میں کمال رکھتا ہے اس قصیدے کو بھی انوری نے اپنے ایک قصیدے کے لئے پیش نظر رکھا ہوگا:

مژده عالم را کہ شاہِ گنبدِ نیلو فری
آمد از ایوانِ کیوان سوی قصرِ مشتری
تا پدید آرد ز شاخِ بید خطِ مشک نو
تا برویاند ز خارِ خشک گلبرگ تری
گہ زر افشاند رخش از گنبدِ سیماب گون
گہ ز رعد افتد صدا در گنبدِ نیلو فری
سبزه نشکیبد زمانی بی سحابِ زرفشان
لالہ نکشاید لب از لب بی نسیم عنبری
گہ ز ذکرِ تاج در جلوه شود طاؤس تر
گہ ز فرِ طوق در خنده شود کبک دری
از ریاحین چون عروس باغ طبعش چون تتار
از شگوفہ پر ز پروین شاخ خلقش مشتری

سغبهٔ بلبل شوی هرگه که صوتش بشنوی
بستهٔ گلبن شوی چندان که دروی بنگری
از گل و بلبل چمن برگ و نوا یابد چنانک
از شهنشه خلق و نام نیک و زرّ جعفری
روی ملک و پشتِ دین بهرامشه شاهی که یافت
مشتری از طالع مسعود او نیک اختری
ای امل باکف در بارش چو دریا قادری
وی اجل با تیغِ خون خوارش چو حلقه بردری
صورتِ تائید بخت و جان و دین و دولتش
زینتِ چتر و کلاه و فخرِ تخت و منبری
هم سکندر دولتی بی حسرت آبِ حیات
هم سلیمان ملکتی بی منّتِ انگشتری
تا نیدیشد دلی کز تخت گشتی بختیار
تا نپندارد عدو کز تاج داری سروری
از جوان بختی که هستی تخت را پیرایهٔ
وز سرافرازی که هستی تاج را چون دربری
چرخ اگر گردد برایت پس عجب نبود که خود
گر بخواهی ایستد پیشت به رسمِ چاکری
سرِ این حرف ست کاید حلقه در گوش هلال
بر مبارک گردنت هر ماه چرخِ چنبری
از تو و خلق تو هرگز جان و دل فتنه نه بست
دیر برناید که زو هم دل شود هم جان بری

خود پری بر بوی خوش عاشق به بوی خلق نیست
دیو مردم باشد آن کو نکته آید از پری
ای که چون برجیس در مجلس پیاپی رحمتی
وی که چون مریخ در هیجا سراسر خنجری
جای مهرِ تست اگر نه فارغم از جان و دل
عزِّ مدح تست گر نه من کیم در شاعری
از جهان داری یدِ بیضاست چون موسی ترا
ورنه اندر مدح تو بنمایمی صد ساحری
تو خداوندی و من هستم یکی از بندگان
منت ایزد راکه مخصوصی به بنده پروری
تا بگویند آن چه یوسف دید و موسی در جهان
این به مکر آن برادر و آن به زرقِ سامری
همچو یوسف بادیا تا زرق هر ده بشکنی
همچو موسی بادیا تا بر عدو زخم آوری
هم به حق کشورکشائی هم به رادی زردهی
هم به عشرت باده نوشی هم زراحت پر خوری

ترجیع بند اور ترکیب بند

سید حسن کے یہاں سولہ ترجیع بند اور دو ترکیب بند ملتے ہیں۔ اور ان سولہ (ترجیع بند) میں سے دو ایسے بھی ہیں کہ گرہ والے شعر میں ہر بند کے اختتام پر صرف ایک لفظ تبدیل ہوتا ہے۔ مثلاً..........ایک بند کے آخر میں :

آن مہر کیست مہرِ حسین حسن کہ ہست

از جام جودِ او دل و جانِ امید ہست

اور "مہر" کی جگہ "مالک۔ "اصل" ۔ "مدح" وغیرہ الفاظ گرہ والے اشعار میں دوسری جگہ ملتے ہیں بہر حال مختلف ترجیع بند اور ترکیب بند میں ہر بند ہمیشہ سات شعر کا ہے۔ اور بندوں کی تعداد تین سے لے کر نو تک ہے۔ اس طرح مجموعی اشعار ۲۴۷ ہوتے ہیں۔

ان اصناف سخن کی ابتدا بھی غزنوی دور (فرخی) سے معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس کے پہلے ان کے نمونے دستیاب نہیں ہوتے لیکن شاید سب سے پہلا نعتیہ ترجیع بند سید حسن ہی نے لکھا تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ۵۴۶ھ کے اوائل میں جب وہ مدینہ طیبہ پہنچا ہے تو سات بند کا ایک ترجیع بند پڑھتا ہے جو اس طرح شروع ہوتا ہے۔

یا رب این ماییم و این صدرِ رفیعِ مصطفاست

یا رب این ماییم و این فرقِ عزیزِ مجتباست

یا رب این ماییم و این روی زمینِ یثرب است

کاسمان را ہفت پشت از رشک یک رویش دوتاست

خواب گاہِ مصطفیٰ و کعبہ مان از پیش و پس

بارگاہ منبرِ حنانہ مان از چپ و راست

یا رب این راحت کہ ما دیدیم در دنیا کہ دید

یا رب این دولت کہ ما داریم در عالم کراست

یارب این روضہ ست واین گلہای رنگین زان اوست

یا رب این مائیم و این دلہای سنگین زان ماست

در دلِ سنگ آب و آتش زین طرب رقاص گشت

ای دل ارسنگی پس آخر آتش و آبت کجاست

سرفراز ای مردم دیدہ کزین ہر ذرّہ

سرمۂ خاکِ کفِ پای نبی الا نبیاست

سلموا یا قوم بل صلواعلی الصدر الامین

مصطفٰی ماجآء الاّ رحمۃ للعالمین

یہ ترجیع اسی جوش عقیدت اور والہانہ انداز کے ساتھ شروع سے آخر تک ہے ایک اور بند دیکھئے :

ای کہ ہرگز ہیچ ملّت چون تو پیغمبر نہ یافت

ہیچ دین در دوگر عالم چون تو دین پرور نہ یافت

جبرئیل آن پیکِ حضرت با ہزاران پر ز نور

سایۂ گرد براقت رابہ وہم اندر نہ یافت

آسمان کو بردر رحمت معلق حلقہ ایست

ہمچو کرسی عرش را جز حلقۂ بردر نہ یافت

ہر کہ از خاک کف پای تو تاج سر نہ ساخت

دست چون بر کرد تا دستار جوید سر نہ یافت

خصمت از بہرِ جراحت پای ہفت اندامِ خویش

گرچہ اندر ہفت دوزخ جست خاکستر نہ یافت

جانِ شیرین دادو ز تلخیِ جان کندن نہ رست

شور بختی کز نمک دان لبت شکّر نہ یافت

هر کہ تخم حاجتی در کشتِ امیدی فگند

بی درو دت ہیچ ندرود وز کشتہ برنہ یافت

سلموا یا قوم بل صلوا علی الصدر الامین

مصطفیٰ ماجآء الآ رحمۃ للعالمین

یہ بند اس لئے بھی نقل کیا گیا ہے کہ نعتیہ کلام میں متوسطین اور متاخرین کے یہاں جو ظاہری شمایل کی تعریف و تحسین ملتی ہے اس کے نمونے متقدمین کے یہاں بھی موجود ہیں جیسا کہ اس بند کے چھٹے شعر میں "نمک دان لبت" کی ترکیب ہے۔ لیکن ایسی ایک آدھ ہی مثال ملتی ہے ورنہ بڑی پرزور نعت لکھی ہے۔ دو چار شعر اور دیکھئے :

ای دلِ پرُ دردِ تو مہمان سرای جبرئیل

جز چنان دل کی تو اند بود جای جبرئیل

آشیانِ طوطیِ جانت برونِ آسمان

گلستانِ بلبلِ نطقت ورای جبرئیل

گرچہ طاؤسِ ملائک جبرئیل آمد و لیک

ہست دیدار ہمایونت ہمای جبرئیل

خوب نبود پای طاؤس و ز خاک درگہت

چون سرہدہد متوج گشت پای جبرئیل

غرض کہ اسی طرح کا والہانہ انداز ہے اور نعت میں صرف یہی ایک ترجیع بند ملتا ہے۔

بقیہ پندرہ ترجیع بندوں میں سے صرف دو ۵۱۵ھ کے ہیں جو ابو طاہر سعد بن علی بن عیسی القمی کی مدح میں ہے۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ یہ سنجر کا وزیر تھا۔ ان کے علاوہ دو اور ترجیع بند ایسے ہیں جن کا تعلق سلجوقی سلاطین سے ہے یعنی ایک مسعود بن محمد بن ملک شاہ (التوفی۔ ۵۴۷ھ) کی وفات اور ملک شاہ بن محمود بن محمد کی تخت نشینی پر ہے جو راحت الصدور (ص ۲۴۶) میں بھی مذکور ہے اور دوسرا موخر الذکر کی مدح (راحت الصدور

ص۔۲۵۱) میں ہے۔ایک اور ترجیع بند موخر الذکر ہی کے کسی امیر معین الدین کی وفات پر ہے۔ لیکن بقیہ دس ترجیع بند اور دو ترکیب بند غزنوی دربار سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ سب کے سب ۵۴۰ھ کے بعد ہوں گے کیونکہ ان میں جتنے ممدوح مذکور ہیں (یعنی دولت شاہ بن بہرام شاہ' ابو نصر محمد بن احمد حسین بن احمد وغیرہ) وہ سب اس سال کے بعد مشہور ہوئے ہیں ان سب کے بند عموماً عاشقانہ انداز میں ہیں اور اگر ایک ایک بند علیحدہ کر دیا جائے تو وہ غزل معلوم ہو گی یا کسی بہاریہ قصیدے کی تشبیب سے کسی طرح کم نہ ہو گا مثلاً

جانا ز مشک سلسلہ بر گل فگندۂ
بر گوشِ لالہ حلقہ ز سنبل فگندۂ
گویا کہ طوقِ غالیہ گون را بہ امتحان
در حلقِ گل ز گردنِ بلبل فگندۂ
نی نی دلِ، معنبرِ لالہ ببردۂ
پس حلقہ حلقہ کردہ آن بر گل فگندۂ
خورشیدِ گل فروش و مہِ لالہ پوش را
در بندِ مشک و دامِ قرنفل فگندۂ
مشک کلہ بر آتش و شمشاد خط برآب
آیا بہ سحر یا بہ توکل فگندۂ
زلف چو چنگ باز بران' روی چون تذرو
بہرِ شکار این دل پرُ مُل فگندۂ
ای باز جرہ بس کہ پراز مہر صاحب است
این دل کہ در کشاکش چنگل فگندۂ
آن مہر کیست مہرِ حسینِ حسن کہ ہست
از جام جودِ او دل و جانِ امید ہست

شروع سے آخر تک اسی طرح عاشقانہ انداز ہے اصل مدح کم ہے اور وہ بھی معمول کے مطابق مختلف تشبیہات واستعارات سے پُر ہے۔ایک دوسری جگہ یہ بند دیکھئے :

ای دادہ عارض چو گلت رنگ لالہ را
با گل فتادہ از رخِ تو جنگ لالہ را
ہمچو قدح پر آب شدہ ز آتش ہوس
از آرزوی آن ذہن تنگ لالہ را
تا آئینہ جمالِ تو در روی لالہ داشت
در دل ز رشک می نہ خورد رنگ لالہ را
در دہ گلاب لعل کہ عودیست مشک فام
اندر میانِ مجمرِ گل رنگ لالہ را
بیداد بین کہ تاشب و تا روزمی کند
بالعل مشک بارِ تو ہمسنگ لالہ را
آورد ترک و دیلم گردون ز روم و زنگ
تا داد روی روم و دل زنگ لالہ را
خود لالہ را چہ سنگ ولیکن شگفتہ باد
بختی کہ برد ماند از سنگ لالہ را
آن بخت کیست بخت خداوند تاج وگاہ
سلطان یمین دولت بہرام شاہ شاہ

اسی ترجیع بند میں سے ہر بند کا مطلع بھی نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ کس حد تک شاعر کا عاشقانہ انداز ہے۔اور اصل مدح اور دعائیہ کی نوعیت کیا ہے۔بقیہ چھ مطلع یہ ہیں۔

خیزای ربودہ مہر تو آرامِ یاسمین
تا عشرتی کینم بہ ہنگامِ یاسمین
ای چہرۂ منقّشِ تو ماہتاب گل
در سایۂ تو خیمہ زدہ آفتاب گل
ای جاہِ تو بہ ماہِ تو پیوستہ تاج را
از نورِ مہر سلسلۂ بستہ تاج را
ای لفظ دُر فشانِ تو پیرایہ دار تخت
از روزِ تو خجستہ شدہ روزگار تخت
ای جفت آسمان ز جلال تو طاق چتر
نگذشت و نگذرد ز تو در اتفاق چتر
شاہا ز صفۂ فلکت بارگاہ باد
افزون ترت ز ذرہ و انجم سپاہ باد

ایک اور بند دیکھیے :

دستِ دل پای یار می گیرد
دامنِ آن نگار می گیرد
زار زارش چو می پرسد غم
تنگ تنگش کنار می گیرد
تاچہ گل ۔ رد این کہ جانِ مرا
ہر دم آن خار خار می گیرد
بہ دہ انگشت اگر چراغ کنم
خود کی در شمار می گیرد

سنگ هر ساعتی زبی سنگی
در منِ خاکسار می گیرد
شد قرارِ من و ہنوز اکنون
ملک چینش قرار می گیرد
در دلِ من چو خواجہ اندر ملک
مرکزی استوار می گیرد
خاصۂ شاہ و خواجہ زادِ من
گلِ باغِ ہنر حسینِ حسن

کبھی کبھی تمہید میں قصیدے کی طرح مضمون پیدا کیا ہے۔ ایک ترکیب بند اس طرح شروع ہوتا ہے۔

امروز یکی خوش سخنی نزدِ من آمد
کز آمدنش جانِ دگر در بدن آمد
شیرین سخنی بود چنان چست کہ گوئی
خائندہ چو طوطی شکری در دہن آمد
چشمِ بد ازان دور کہ چون آن سخنِ او
در گوشِ منِ شیفتۂ ممتحن آمد
چون گل بشگفتہ ز طرب گرچہ ازین پیش
چون لالہ ہمی خونِ دلم در دہن آمد
گفتم کہ ازین پس من و مدح و غزلی را
بلبل بسراید کہ گل اندر چمن آمد
اول سخن آن بود کہ آن یارِ دلآ رام
بس تاختہ و باختہ از باختن آمد

گر خواہم معشوق خود این جاست دلآ رام
ور جویم ممدوح خداوند من آمد
ممدوح و خداوندِ من و آنِ ہمہ خلق
کز دیدن او گشت حرم جانِ ہمہ خلق

ترجیع بند کے آخر بند میں گرہ کا کسی نسخے میں نہ ملنا تو خیر کاتب کی بے اعتنائی سے ہو سکتا ہے لیکن جو ترکیب بند ہیں ان کے آخر میں بھی گرہ نہیں ہے۔ اور مختلف نسخے جو ہمارے پاس ہیں ان میں کسی میں نہیں ہے۔ اگر واقعی شاعر نے آخر کی گرہ کو نہیں لکھا تو ایک نئی بات قرار پائے گی۔

قطعات

سید حسن کے یہاں قطعات بھی متعدد ملتے ہیں۔ جن کے اشعار کم از کم ساڑھے تین سو ہوں گے ان میں مختلف ممدوحین کی مدح اور مختلف واقعات کا حال ملتا ہے لیکن چونکہ ایسے تاریخی یا تفریحی قطعات کا کچھ ذکر اوپر آچکا ہے اس لئے یہاں صرف ان قطعات کا ذکر کیا جاتا ہے جن سے شاعر کے خیالات کا اندازہ ہو سکے۔ وہ دنیا والوں سے بیزار نظر آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے فضل و کمال کی وجہ لوگ اس کے دشمن اور حاسد تھے ایک رباعی میں بھی کہتا ہے۔

دارم ملکا چو ریگ و باران دشمن
بر من شدہ جملہ دوستداران دشمن
در خانہ تو بزینہار آمدہ ام
یک دوست توئی و صد ہزاران دشمن

اپنے دوستوں کی حالت کو اس طرح ایک قطعہ میں بیان کرتا ہے۔

دوستان را من زرہ پنداشتم بودند ہم
لیک بہرِ دشمنانِ جاہلِ بی دینِ من

گفت ہر کس کہ نکو عہدان دلی دارند پاک
پاک بود آری ولیک از مہر نی از کینِ من

اس لئے ایک قطعے میں کہتا ہے:

کریمی کو کہ در عالم زبون نیست
اسیر و عاجز این چرخِ دون نیست
عروسِ بخت را گر زیوری ہست
درین نہُ حقۂ آئینہ گون نیست
اگر انیست ہستیہا کہ دیدم
درین کان ہیچ نقدی چون جنون نیست
حسن بگذار دنیا راہمان گیر
کہ از کنجِ دلِ تنگت برون نیست
فلک گر نافۂ گردد پرُ از مشک
بدین نیکی، بدین گوہر درون نیست

ایک جگہ اور کہتا ہے:

کین می کشد زمانہ زمن آری از ملوک
خصمان چو دست یا بند از بیم کین کشند
لیکن نہ دائم ار لکدی بر فلک زنم
روزی کہ پر دلان قدم اندر زمین کشند
او تیغ می زند کہ لئیمان چنین کنند
من صبری کنم کہ کریمان چنین کنند

دنیا سے بے نیازی اس طرح ظاہر ہے:

همای عافیت آن روز ازین قفس بپرید
که در دمادمِ یک استخوانش صد سگ دید
مشو زنیک و بدِ چرخ نیک و بد ز نہار
که نیک او ز بد و سر ز پای نیست پدید
کز آسمان و زمین ہمچون صبح و گل ہرگز
که خنده ز دکه نه در حالِ خنده جامه درید
ز دامِ آز حذر کن که صد ہزاران مرغ
در اوفتاد که یک دانۂ امید نه چید
مباش طالبِ مال وجمال کس کاین جا
ز خون کنند عروس و ز آب مروارید
خیال مردن در خواب ہم نمی بینی
اگرچه صبحِ قیامت ز عارضت بدمید
ہزار جانش فدا کاندرین عدم خانه
چو عنکبوت کفن ہم به دست خویش تنید
کشاده دار دلت پیش از آن که بسته شود
در آن دہان چو قفلت زبان ہمچو کلید
میان ببند چو گردون و گوشۂ بگزین
که قطب گشت ہر آن کو که گوشۂ بگزید
چرا یگانۂ عالم شد آفتاب چنانک؟
ز خود علایقِ انجم به تیغ تیز برید

دینوی علایق سے اس طرح علیحدگی اور بے نیازی ظاہر کرتا ہے۔

گہ بنالی کہ وای نان باید
گہ برنجی کہ آہ جان برود
اندہِ نان و جان مخور بنشین
کین بیاید بہ وقت و آن برود

ایک اور جگہ اپنی زندگی کو اس طرح سنوارنا چاہتا ہے۔

چو چنان زی کہ از شمایل تو
گر بودیک لطیفہ صد گردد
نہ چنان کہ برای ناسازیت
آن کہ نیک است باتو بد گردد

غرض کہ اسی قسم کے مضامین نظر آتے ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کی زندگی مدح سرائی کے باوجود بے جا حرص و آز سے پاک تھی اور دنیوی مکروہات سے بے نیازی تھی۔ اس کو دوستوں سے اذیت بھی پہنچی لیکن وہ زمانے کے معمول کے خلاف ہجو نگاری سے پرہیز کرتا تھا۔ اس نے کسی شخص کی ذاتی مذمت نہیں کی۔ وہ سادہ دل، نیک نفس صابر و قانع تھا۔ اس کی نیک طبیعت کو حج و زیارت سے جلا حاصل ہوئی تھی اسی نے اس کو اپنے عہد میں خراسان میں بھی مشہور کیا جیسا کہ ہم اوپر پڑھ چکے ہیں اور وہ اپنے تقدس کی وجہ سے اب بھی افغانستان میں مشہور ہے۔

غزل

جہاں تک غزل کے اصل موضوع یعنی داستانِ حسن و عشق کا تعلق ہے وہ ہم کو فارسی کے قدیم ترین اشعار میں بھی نظر آجاتا ہے لیکن ایسے تمام اشعار کو ہم غزل کے نام سے تعبیر نہیں کر سکتے کیونکہ جیسا کہ فضلی صاحب نے اپنے مضمون ''فارسی غزل'' (اردو اپریل ۱۹۳۸ء ص ۳۸۱) میں ثابت کیا ہے کہ قصیدوں کی تشبیب کو بھی پہلے غزل کہا جاتا

تھا لیکن مشکل تو یہ ہے کہ اگر غزل اور تشبیب دونوں اپنے معنی اور موضوع کے لحاظ سے ایک ہی سمجھی جائیں تو ان کے درمیان امتیاز پیدا ہونے کا زمانہ کب سے قائم کیا جائے۔ اس کا جواب ہمارے قدیم سرمایہ کی کمی کی وجہ سے آسان نہیں ہے۔ موصوف نے (ص ۳۸۳) لکھا ہے کہ "...... ممکن ہے کہ شروع شروع میں مفرد خیالات' مفرد اشعار میں نظم کئے گئے ہوں۔ اگر یہ خیالات تھوڑے عرصے کے اندر پیدا ہوتے تو انہیں قافیے کی فراوانی اور اس کے موسیقی اثر کی وجہ سے ہم قافیہ الفاظ اور ایک ہی بحر میں نظم کیا گیا ہو۔ اس کا نتیجہ ایک ایسی نظم ہوتی ہوگی جس میں چند اشعار بحر و قافیہ کی یکسانی کے رشتے میں پروئے ہوئے ہوں گے اور اس کی صورت...... غزل کی اس پرانی شکل کی رہی ہوگی جس میں مطلع اور مقطع نہ ہوتا ہوگا۔ بعد میں قصیدے کے اثر سے مطلع کا اضافہ کردیا گیا ہو اور اس کے کچھ عرصے کے بعد مقطع......" بہر حال تحقیق سے نہیں کہا جاسکتا کہ غزل نے اپنی جداگانہ حیثیت کب سے قائم کی۔

موضوع کے لحاظ سے خظلہ بادغیسی (م۔ ۳۱۹ھ) کے یہ اشعار لباب ج ۲۔ ص ۲۰) سب سے قدیم معلوم ہوتے ہیں۔

یارم سپند اگرچہ بر آتش ہمی فگند
از بہرِ چشم تا نہ رسد مرد را گزند
او را سپند و آتش ناید ہمی بہ کار
با روی ہمچو آتش و باخال چون سپند

ابو حفص ابن احوص سمرقندی جو ۳۰۰ھ میں گزرا ہے اس کا ایک شعر مجمع الفصحا (ج ۱۔ ص ۶۵) میں یہ ملتا ہے:

آہوی کوہی در دشت چگونہ دو دا
او نہ دارد یار بی یار چگونہ بود

پھر ابو سالک گورگانی (لباب ۲۔ ۳) اور ابوالحسن شہید ابن الحسین بلخی (لباب ۲۔ ۴)

کے اشعار بھی اسی موضوع سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے بعد رودکی (۳۱۹ھ۔۹۴۱ء) کا نمبر آتا ہے۔ فاضل یلمعی حافظ محمود شیرانی نے تنقید شعر العجم (ص۱۹) میں رودکی کی ایک خمریہ غزل بھی نقل کی ہے:

می آرد شرف آدمی پدید
آزادہ تراز درم خرید
می آزادہ پدید آزد از بد اصل
فراوان ہنر است اندرین نبیذ
ہر آن گہ کہ خوری می خوش آن گہ است
خاصہ چو گل و یاسمین دمید

اس غزل میں تسلسل (۱۶۴) اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ طرز بیان اور خیالات سادہ ہیں۔ بعد والوں کی خیالی دنیا اس کے یہاں سجائی نہیں گئی۔ اب دقیقی طوسی (م ۳۴۱ھ۔۹۵۲ء) کی ایک غزل (لباب ۲۔۱۲) بھی دیکھئے:

کاشکی اندر جہان شب نیستی
یا مرا ہجرانِ آن لب نیستی
زخم عقرب نیستی بر جان حق
گرو را زلفِ معقرب نیستی
ورنہ بودی کوکبش در زیرِ لب
مونسم تا روز کوکب نیستی
ور مرکب نیستی از نیکوئی
جانم از عشقش مرکب نیستی
ور مرا بی یار باید زیستن
زندگانی کاش یا رب نیستی

غزل کی لطافت دیکھ کر پورے اشعار نقل کرنے کو جی چاہا۔ دیکھئے مضمون کا تسلسل اس میں بھی پایا جاتا ہے۔ استعارات سادہ ہیں۔ کوئی خاص تصنع نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی اس میں جذبات کا اظہار زیادہ ہے اور اندازِ بیان لطیف ہے۔

اب یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غزنوی عہد کی بعض غزلوں کے نمونے دیئے جائیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ سید حسن غزنوی (جو اسی عہد کے آخر میں تھا) اس کے پہلے غزل کی حالات کیا تھی۔

حافظ شیرانی صاحب نے کتاب "تنقید شعر العجم" (ص ۵۹) میں خود سلطان محمود غزنوی کی ایک غزل "بزم آرا" کے حوالے سے نقل کی ہے:

من گرد دل خویش ہوای تو تنیذم
با مہرِ تو پیوستم و از خویش بریذم
دیگر ز بتاں چون تو نہ دیدم ز پیِ آنک
بت نیست بہ جای کہ من آن جا برسیذم
بامن نچخیذ آن کہ چو اوکس نہ گرفتم
نگرفت سرِ زلف تو ہر چند چخیذم
چون زلف شدم دست و چو بت خانہ شدم روی
چون زلفِ تو کاویذم و چون روی تو دیذم
گفتم کہ یکی بندہ خریدم بہ درم من
نی نی غلط است این کہ خداوند خریذم

خصوصاً دوسرے اور پانچویں شعر میں محمودی اوصاف پائے جاتے ہیں۔ تشبیہات و استعارات میں لطافت ہے لیکن جذبات کی فراوانی ایک شاہانہ "عاشق" کے یہاں کیونکر ہو گی؟

اسی عہد کے دوسرے شاعر عنصری (م ۴۳۲ھ۔۱۰۴۰ء) کی بھی ایک غزل ("اردو" ۔ایضاً ص ۴۰۷) دیکھئے:

سر زلفِ مشکین جانانِ من
مرا کشت و پیچید برجانِ من
بیا ترک سیمین تن و سنگ دل
ہویدا بہ تو رازِ پنہانِ من
بہ فرمانِ من باش تا بر خوری
ترا بد نہ آید ز فرمانِ من
نہ گردم ز پیمانِ تو من بہ دل
مگردان تو دل را ز پیمانِ من

فضلی صاحب ان اشعار کے متعلق (بحوالۂ مذکورہ) فرماتے ہیں:

"......عاشق کی معشوق نوازی اور معشوق کو تابع فرمان سمجھ کر اس سے تعمیل ارشاد کی امید رکھنی، جو اس عہد کی شاعری میں اکثر پائی جاتی ہے، اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ یہ شاعری بہ مقابلہ زمانۂ مابعد کی شاعری کے حقیقت سے قریب تر ہے......" غرض یہ ہے کہ اس دور کے شعرا جو کچھ خود محسوس کرتے ہیں اسے من و عن بیان کر دیتے ہیں۔ اوپر کے نمونے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مضامین میں اب بھی تسلسل ہے اور سید حسن کے ایک معمر معاصر مسعود سعد سلمان (۵۱۵ھ۔م ۱۱۲۱ء) کے یہاں پھر تسلسل دیکھئے۔ وہ کہتا ہے (دیوان ص ۶۷۲ تہران ۱۳۱۸)

مرا در غم فرقت ای پسر
دو دیدہ چو ابر ست و دامن شمر
وزین دل بر افروختہ ست آتشی
کش از درد و رنج ست دو دو شرر
دو چشم بماندہ بہ ہنجار راہ
دو گوشم بماندہ بہ آواز در

امیدِ وصال ار نہ بودی مرا
کہ روزی در آئی ز در ای پسر
پر از گرد جعد و بر آشفتہ زلف
کشادہ خوی از روی و بستہ کمر
بر آورد می جان شیرین زتن
بیالود می چشم روشن زسر

دیکھئے یہ شاعر جو سید حسن کے ابتدائی عہد میں وفات پاتا ہے ہنوز قدیم طرز کی غزل لکھتا ہے۔ یعنی تسلسل اور ہم آہنگی کے علاوہ اس کے یہاں وہی سیدھے سادے خیالات ہیں جن میں تکلف اور تصنع نہیں ہے (۱۶۵) لیکن سید حسن کے مشہور ہم عصر سنائی (م ۵۴۵ھ۔ ۱۱۵۰ء) کے یہاں غزل ایک نئی کروٹ لیتی ہے۔ ان کے اشعار نقل کرنے کے بجائے بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حافظ شیرانی صاحب کی رائے نقل کردی جائے۔ وہ کتاب تنقید شعرالعجم (ص ۱۶۷) میں کہتے ہیں۔

"حکیم سنائی زیادہ تر زہدیات اور کم تر تصوف کے مضامین کی اس میں اشاعت دیتے ہیں۔ مجاز کے پردے میں حقیقت کے اسرار کی ترجمانی ان سے شروع ہو جاتی ہے۔ انوری کے یہاں سوز و گداز و عشق محض ہے یہ عطار ہیں جو غزل کو میخانہ کا راستہ بتاتے ہیں۔ رندوں کی صحبت میں جگہ دیتے ہیں اور حقیقت و مجاز کی دو عملی میں ان کا نشیمن آباد کرتے ہیں۔ مولانا روم اور عراقی بادۂ تند کے ساغر پلا پلا کر اسے مستِ سرمدی بنا دیتے ہیں' حقیقت و مجاز ایک دوسرے سے ایسے گھل مل جاتے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے امتیاز کرنے میں دقت پیش آتی ہے......" اس عبارت میں شیرانی صاحب نے سنائی کو زہدیات کا مخترع کہا ہے اور عطار کو خمریات کا۔ لیکن آگے چل کر (ص ۱۷۴) انھوں نے "خرابات کا راستہ بتانے والا" سنائی ہی کو کہا ہے۔ اور یہی صحیح ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں "...... سنائی کے عہد سے پیشتر غزل کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں لیکن اس صنف سخن نے ان کے یہاں مستقل شان پیدا

کرلی ہے۔ بہ لحاظ زبان ان کی غزل' قطعہ اور قصیدے کا رواج' غزل کے مقطع میں سب سے پیشتر انہیں کے یہاں پایا جاتا ہے۔ واردات حقیقت کو مجاز کی زبان میں ادا کرنا انھیں سے شروع ہوتا ہے۔ اگرچہ مذاق میں زہدیت غالب ہے تاہم تغزل کو خرابات کا راستہ بتانے والے حکیم سنائی ہیں۔ عرفان اور رندی کی آمیزش کے قدیم ترین نمونے ان کے کلام میں ملتے ہیں۔ عطار ار مولانا روم انھیں کی بنیادوں پر قصر وایوان تعمیر کرتے ہیں۔ قصہ مختصر سنائی کے یہاں شاعری بہ لحاظ غزل ایک نئی کروٹ لیتی ہے۔ زہد خشک کا خاتمہ ہوتا ہے۔ رندی اور مستی کی داغ بیل ڈالی جاتی ہے۔ صومعہ چھوڑا جاتا ہے' میخانہ آباد کیا جاتا ہے۔ زہد سے اعتزال ہوتا ہے اور خرابات نشینی اختیار کی جاتی ہے۔"

ان بیانات کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ سنائی نے خمریات کی ابتدا کی لیکن ان کے ہم عصر سید حسن کے یہاں بھی خمریات اور مستی کے مضامین ملتے ہیں۔ چنانچہ یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ ان دونوں میں پہلے کس نے ابتدا کی۔ لیکن اس بحث پر آنے سے پہلے مناسب ہے کہ سید حسن کی غزل پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے۔

سید حسن نے اپنے الفاظ و بحور کا انتخاب اس صنف سخن کے لئے اس طرح کیا ہے کہ اس سے اس کی مہارت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ خود کہتا ہے:

ہر کہ شعرِ بلندِ من خواند
آن یکی از فلک سواریہا ست
گر بزرگی کنی مناز از آنک
زیرِ ہر حرف خردہ کاریہا ست

اس کے یہاں ۷۰۔۷۵ غزلیں ہیں جن میں قریب قریب سات سو اشعار ہیں۔ اور وہ سب کے سب اس کے قلبی واردات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اگر غزل سے حقیقی اور ذاتی جذبات ہی کا تعلق ہونا چاہئے اور وہ قصیدے کے تصنعات سے آزاد ہے تو ہم کو یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ سید حسن نے تقریباً ۵۰ سال کی مدح سرائی کے باوجود غزل اپنے لئے لکھی

اور اپنے دلی جذبات ہی کے لئے اسے وقف کیا ورنہ اس طرح صاف صاف نہ کہتا:

عشق بازی صدم افزون افتاد
لیک زین سان نہ کہ اکنون افتاد
دوست پر طرفہ و دل خواہ آمد
یار بس چابک و موزون افتاد
من کم از ہیجم و قسم ز غمش
طرفہ آن کز ہمہ افزون افتاد
بر خیال رخ او کرد گذر
اشک من زان ہمہ گلگون افتاد
چہ کنم ای دل پرخون خوردہ
کہ ازین دل جگرم خون افتاد
یارب آن زلف خم اندر خم او
راستا راست بہ من چون افتاد
حسن از دوست چہ نالی چندین
کان چہ افتاد زگردون افتاد

۱۔ ہم اس شاعر کے قصائد میں تشبیہات واستعارات اور دوسرے صنائع کی فراوانی دیکھتے ہیں لیکن غزل میں حقیقت نگاری ہے۔ اس لئے سادگی اور سلاست پائی جاتی ہے۔ تصنعات ہیں بھی تو بہت کم ہیں۔ اس کے علاوہ غزل میں مضمون کا تسلسل جو سعدی کے یہاں عام ہے وہ سید حسن کے یہاں پہلے سے موجود ہے دیکھئے کس قدر ربط اور تسلسل اس غزل میں ہے:

منم در عشقِ تو جانا و جانی
کشیدہ پوستے بر استخوانی

نہ جز گریہ مرا پشت و پناہی
نہ جز نالہ مرا نام و نشانی
تنی ماندہ چہ تن محنت سرائی
دلی رفتہ چہ دل درد آشیانی
نہ داری باک از خون غریبی
نیاری رحم بر جانِ جوانی
سبک بر بایدم موری دگر باز
کنی یادم نہ خوانی جز گرانی
سرا پای جہان گشتم، نہ دیدم
چو تو اندک وفا، بسیار دانی
زبانِ تلخ داری ای پسر لیک
چو گفتارِ حسن شیرین دہانی
درین شیرین دہان از بخت سودم
عجب نبود بدان تلخی زبانی
زمانی پیش من فارغ نیائی
کہ تا فارغ شوی از من زمانی

چند اشعار اس قبیل کے اور دیکھیے:

عمری بہ امید می گذارم
کاری بہ گزاف می سپارم
نی زہرۂ آن کہ دل بجویم
نی طاقتِ آن کہ دم بر آرم

یک بار ز من کسی نہ پرسید
تا برچہ امید و در چہ کارم
ای نورِ دو دیدہ بیم آنست
کین نورِ دو دیدہ رابارم
ترسان ترسان ز آب و آتش
بر چشم و دلت ہمی نگارم

۲۔ اس کے یہاں حقیقی جذبات اور دلی واردات جو غزل کی جان ہیں جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا بدرجہ اتم موجود ہیں۔ لیکن سادگی و سلاست کے ساتھ ساتھ وہ فطری طور پر بھی مذکور ہیں۔ دیکھئے اس طرز بیان پر سینکڑوں تصنعات قربان ہیں:

تن در بد و نیکِ یار دادیم
دل در غمِ، آن نگار دادیم
تاجی بر عمر ز خاکِ پایش
بر تختِ وفاش بار دادیم
ہم رنگِ تو سوی گل نشاندیم
ہم پای بہ دستِ خار دادیم
فرمود کہ بی قرار می باش
ما نیز بدان قرار دادیم

ایک اور غزل دیکھئے:

ہمہ شب دوش من بیدار بودم
ندیمِ حسرت و تیمار بودم
ز وصلِ یارِ دلبر بر نہ خوردم
ز ہجرِ دوست بر خوردار بودم

چو محنت دیدگان اندر تحیر
بمانده روی در دیوار بودم
همی جان کندم اندر فرقتِ یار
مبر آن ظن که من بی کار بودم
ز سودا و ز صفرا و طپیدن
بسانِ مرد نا ہشیار بودم
مرا گویند چون بودی، چه گویم
مگر بهتر شوم بیمار بودم

۳۔ تیسری چیز سید حسن کی رندی اور مستی ہے جس کے متعلق صحیح فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ وہی اس کا مخترع ہے یا اس کا ہم عصر سنائی اس کا بانی ہے۔ سید حسن کے اشعار دیکھئے:

ساقیا وقت ست اگر مارا شرابی در دہی
مجلس ما را ز بادہ رونقِ دیگر دہی
روح قدسی را بہ آبِ زندگانی خوش کنی
عقلِ پرُ دل را بہ باد لاابالی بر دہی
از قدح بندِگران برپای سرمستان نہی
و ز طرب راہی سبک بر لفظِ رامش گر دہی
دستِ ماگہ گہ بدان شمشاد وش سنبل بری
نقل ما نو نو از آن یاقوت گون شکر دہی
ماچو از بوی خوشِ تو در گلیم و در گلاب
سخت خرم باشد از گلگون گلابی در دہی
ور ز مستی در شمارِ بوسہ ہا افتد غلط
آن کہ آخر دادۂ این بارہا از سر دہی

ایک اور غزل کے چند اشعار دیکھئے:

ہین در دہید بادہ کہ ہنگامِ بی غمیست
زان بادۂ کہ مشرق خورشید خرمیست
باروی چون دو پیکرِ در روی او کشم
زیر اکہ مان چو پروین وقتِ فراہمیست
آن پستۂ شکر گر او از چہ کوچک ست
آن سنبل زرہ ور او راچہ در ہمیست
آن جزع بین کہ در کف موسیش ساحریست
وان لعل بین کہ بر لب عیسیش ہمدمیست
آزادی از غمش سببِ طوقِ بندگیست
محرومی از لبش اثرِ بارِ محرمیست

۴۔ چوتھی چیز اس کے یہاں تصوّف کی چاشنی ہے اور جس طرح سعدی کے یہاں ع "ہر ورقی دفتریست معرفت کردگار" اسی طرح یہ بھی ہر چیز کو معشوق ازلی سے متعلق دیکھتا ہے:

قمری اندر بہار یارِ من ست
مونس نالہ ہای زارِ من ست
فاختہ طوقِ عشق بر گردن
در غم دوست غمگسارِ من ست
بلبل از شاخِ گل کشادہ زبان
بابتِ حال روزگارِ من ست
ساقیا بی قرارم از میِ عشق
دوسہ من داروی قرارِ من ست

می خورم در بہار با رخِ یار
کان بہارِ تو این بہارِ من ست
گرنہ باشد بہار بی ابری
ابر او چشم آبدار من ست
گلِ سوری شگفتہ اندر باغ
راست چون گل رخی نگارِ من ست
لالہ در سبزہ زار پنداری
روی معشوق بر کنارِ من ست
گوئی از دور نرگسِ مخمور
چشمِ دلبر در انتظارِ من ست
در بنفشہ نگہ کنم گویم
زلفِ او یا تنِ نزارِ من ست
ہر شبی زان بہ مہ نظارہ کنم
کو ز معشوق یادگارِ من ست
در چنین وقت بی می و معشوق
بیہدہ زیستن نہ کارِ من ست

اس قبیل کی کئی غزلیں ہیں جن میں شاعر "ہمہ اوست" کا دم بھرتا ہے اور ہر جگہ اپنے معشوق ہی کا جلوہ دیکھتا ہے۔

۵۔ سید حسن کے یہاں غزل میں سادگی و سلاست ضرور ہے لیکن ساتھ ہی قوت متخیلہ کے ایسے بلند نمونے بھی ملتے ہیں جو اس کے معاصرین میں بہت کم ہیں۔ دیکھئے اس کے خیال پردازی سے زبان و بیان میں کیسی دلکشی پیدا ہو گئی ہے:

ای کہ گل جامہ ز رنگِ رخِ تو چاک زدہ ست
جان بوی تو نواہای طرب ناک زدہ ست
نرگس از چشمِ تو مخمور چرا گشت کہ گل
جامِ یاقوتِ من از لعلِ تو در خاک زدہ ست
اے برانگیختہ از آئینۂ دریا گرد
خاکِ ہجرانِ تو در دیدۂ افلاک زدہ ست
گرچہ بر اسپِ جفا تنگ سواری تو مناز
کہ دلم چنگ در آن گوشۂ فتراک زدہ ست
خونِ مشکین شدہ از ناوکِ چشمت دلِ من
این چہ زخم ست کہ آن غمزۂ چالاک زدہ ست
گرنہ وصلِ تو ندیم ست مرا طعنہ مزن
کہ مرا خود غمِ ہجران تو خاشاک زدہ ست

اسی طرح کی ایک غزل اور دیکھیے:

گر شمعِ تو بی زحمتِ پروانہ بماند
خورشید چو سایہ ز تو در خانہ بماند
از بادۂ لب ہای تو گر دل نہ شود مست
در سلسلۂ زلفِ تو دیوانہ بماند
خون گشتہ دلی را ز خود آویختہ دارد
ہر تار کہ از زلفِ تو در شانہ بماند
ای گنجِ روان در دلِ ویران کنمت جای
تا بو کہ مگر گنج بہ ویرانہ بماند

افسانۂ عشقِ تو شدم آہ دریغا
ترسم کہ نہ مانم من و افسانہ بماند
آن گاہ حسن جانِ گرامی بہ تو بخشد
واللہ کہ صد جان برو شکرانہ بماند

اس کے علاوہ رواج کے مطابق اس کی غزلوں میں بادشاہ کا نام بھی آجاتا ہے۔ لیکن یہ چیز کسی نمونے کی محتاج نہیں ہے۔ کیونکہ یہ خصوصیت اس کی نہیں ہے بلکہ بہت بعد تک بھی قائم رہی۔ اب چند غزلیں اور دیکھ لیجئے کہ جن میں وارداتِ قلبی، درد و حسرت اور حقیقی تغزل ہر جگہ موجود ہے:

دلِ من نیست شد و سوزِ تو از سینہ نہ رفت
اشکِ من موج زد و نقشِ تو از دیدہ نہ شست
زشت نقشی بود ار نقشِ تو نشنانم خوب
سخت کاری بود ار کارِ تو بگذارم ست
گرچہ در دیدۂ من نقشِ خیالِ تو نماند
ورچہ در سینۂ من عکسِ جمال تو برست
بیش در دیدہ و در سینہ نمی جویم ازانک
دوست در آتش و در آب نمی یارم جست
سرِ آن سرو بگردم کہ چو تو باشد راست
پیش آن ماہ بمیرم کہ بتو ماند چست
آمدم کاستہ و سوختہ اندر برِ تو
کہ مرا روی چوبستان و چو قبلہ سوی تست
ای مرا کاستہ چون ماہ بیفزای اوّل
وی مرا سوختہ چون شمع بیفروز نخست

ایک اور غزل دیکھئے جس پر متاخرین کی غزلیں بھی قربان ہیں:

ای آرزوی دیدۂ بینا چگونۂ
وی یار و مونسِ دلِ تنہا چگونۂ
از ناز و نازکی اگر این جا نہ آمدی
باری یکی بگوی کہ آن جا چگونۂ
دستِ ترا کہ صورتِ دریاست چشمِ من
ای دُرِّ دور ماندہ ز دریا چگونۂ
از وصل تو کہ نیست دریغا در آتشم
در ہجرِ من کہ ہست مبادا چگونۂ
ما خود جہان گرفتیم از پیش عاشقی
در سلسلہ توِ ای دلِ شیدا چگونۂ
ای نور چشم مہر و گلِ بوستانِ حسن
ما بی تو در غمیم تو بے ما چگونۂ

ہم اوپر ایک جگہ لکھ چکے ہیں کہ یہ زمین پہلے مسعود سعد سلمان نے اس طرح اختیار کی تھی:

ای لاہور ویحکِ بے من چگونہ
بے آفتاب روشن روشن چگونہ

لیکن سید حسن کے بعد اس رنگ کو اختیار کرنے کی کئی شاعروں نے کوشش کی۔

عبدالرحمٰن جامی نے اپنے لڑکے کا ماتم اس طرح شروع کیا:

زیر گلِ تنگ دل ای غنچۂ رعنا چونی
بے تو ما غرقہ بخونیم تو بے ما چونی

فیضی نے بھی اپنے لڑکے کا ماتم کیا تھا:

ای روشنیِ دیدۂ روشن چگونۂ
من بی تو تیرہ روز تو بی من چگونۂ

جامی اور فیضی کے دوسرے مصرعوں کے ساتھ سید حسن کی مذکورہ بالا غزل کا آخری مصرع پڑھئے۔ پھر غالب کا دوسرا مصرع بھی دیکھئے۔

ای رہ نوردِ عالمِ بالا چگونہ
ما بی تو درہمیم تو بی ما چگونہ

دیکھئے، غالب کے یہاں توارد ہو گیا ہے۔ لیکن الفضل للمتقدم کے اصول سے سید حسن کو فضیلت حاصل ہے۔ نظیری نے بھی ایک بند لکھا ہے:

ای شاہِ مصر دور ز کنعان چگونۂ
ای یوسف از جدائیِ اخوان چگونۂ

غرض کہ متعدد شاعروں نے یہ زمین اختیار کی لیکن مسعود سعد سلمان نے لاہور کے فراق میں لکھ کر وہ دلکشی پیدا نہیں کی تھی جو سید حسن نے اپنے محبوب سے متعلق غزل میں پیدا کی ہے اور یہ فخر سید حسن کے لئے کیا کم ہے کئی قصیدوں اور غزلوں میں اس کے متعدد مقلدین نظر آتے ہیں۔

ایک اور غزل دیکھئے جس میں حافظ کا دھوکا ہوتا ہے:

ای بادِ روح پرور زنہار اگر توانی
امشب لطافتی کن آن جا گذر کہ دانی
در شو چوں مہربانی در تیر گی زمانی
یابی مگر نشانی زان آبِ زندگانی
چون نزد او رسیدی خاکِ درش بدیدی
آنچہ از حسن شنیدی شاید کہ باز رانی

اور اگوی کای مہ مارا پرس گہ گہ
پر جانم اللہ اللہ رحمت کن ار توانی
رہ رہ گذر بکولیش، دم دم نگر بہ رولیش
خوش خوش مگر زمولیش بوی بہ ما رسانی
حقا کہ سخت زارم و ز خود خبر نہ دارم
بی تو ہمی گذارم عمری چنان کہ دانی
لطفی بکن نگارا دامی بنہ وفا را
کای یار باتو مارا لطفی فتاد جانی

دیکھئے، بلا کا تغزل ہے۔ بڑا سوز اور بڑا ساز ہے۔ یہ غزل انگریزی Lyric poctry والے Lyric یا ساز کا ساتھ دے سکتی ہے اور روحانی غذا کا کتنا لطیف دستر خوان مہیا کر سکتی ہے۔

غزل میں سنائی کی جو اوّلیات ہیں وہ سید حسن کے یہاں بھی ہیں۔ اس لئے فیصلہ مشکل ہے کہ ان دونوں میں کون مخترع ہے۔ تاہم سنائی سے ایک معاملے میں سید حسن کم ہے۔ یعنی سنائی کا تخلص عموماً ان کی غزلوں (کے مقطع) میں ہوتا ہے لیکن سید حسن کے یہاں بہت کم آتا ہے۔ اس حقیقت سے ایک دوسری حقیقت ذہن میں یہ آتی ہے کہ جب دونوں کے یہاں سوائے مقطع کے سب خصوصیات مشترک ہیں تو ظاہر ہے کہ بعد والے نے کوئی ترقی کی ہوگی یا اپنچ سے کام لیا ہوگا۔ چنانچہ اس لحاظ سے کہنا پڑتا ہے کہ سنائی کی مسلمہ اوّلیات میں سید حسن، شریک غالب ہے، گو کہ (بعد میں) مقطع کو سنائی کی اختراع کہنا پڑے گا۔

رباعی

کتاب تنقید شعر العجم (ص ۸۔۱۱) میں شیرانی نے رباعی کی ابتدا کے متعلق جو بیانات

دیئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔

رباعی دراصل کوئی شخصی ایجاد نہیں ہے بلکہ چہار بیتی کا ارتقائی نتیجہ ہے۔ قدیم الایّام میں ایران میں ایک خاص قسم کی نظم جس کو چہار بیتی کہا جاتا تھا' رائج تھی۔ اس کے اوزان عربی اوزان سے غالبًا متخرج نہیں' بلکہ ایران زا اور مقامی معلوم ہوتے ہیں۔ قدما ہزج کے مربعات میں ان کا شمار کرتے تھے۔ تعداد میں وہ چار شعر ہوتے تھے اور چاروں شعروں میں قافیہ لانا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ متاخرین نے اس میں یہ ترمیم کی کہ اس کے وزن مربع کو مثمن قرار دیا۔ جس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ ان چار ابیات کی تعداد دو شعروں میں محدود ہو گئی اور چار قافیوں کے بجائے صرف تین قافیے ضروری سمجھے گئے اور تیسرا مصرع بغیر قافیے کے رکھا گیا۔ ایسی چہار بیتی جس کے چاروں شعر ہزج اخرب یا اخرم میں ہوں اور آخر میں قافیہ ہو' جب قدما سے متاخرین کے دور میں آئی تو انھوں نے ان چاروں شعروں کو چار مصرعے شمار کیا اور اسی لئے اس چہار بیتی کا نام دو بیتی رکھ لیا گیا۔

چہار بیتی کا سب سے قدیم نمونہ بقول شیرانی مرحوم کے ابو شکور کے یہاں ملتا ہے یہ وہی ابو شکور ہے جس کی ایک مثنوی ''آفرین نامہ (۱۶۶) بقول عوفی ۳۳۶ھ میں پوری ہوئی تھی اس شاعر کی چہار بیتی موجودہ رباعی کی شکل میں اس طرح ہو گی۔

ای گشتہ من از غم فراوانِ تو پست
شد قامت من ز درد ہجرانِ تو شست
ای شستہ من از فریب و دستانِ تو دست
خود ہیچ کسے بسیرت و شانِ تو ہست

لیکن ڈاکٹر محمد اقبال صاحب نے خیّام کی رباعیات کی تعین (۱۶۷) کے سلسلے میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس بڑودہ میں جو مقالہ پڑھا تھا اس میں انھوں نے شروع میں چہار بیتی' دو بیتی اور رباعی کا فرق بتا کر یہ فرمایا تھا کہ غالبًا پانچویں صدی ہجری سے چہار بیتی کا نام دو بیتی ہو گیا۔ سلجوقیوں کے عہد میں وہ برابر اسی نام سے پکاری جاتی رہی اور جب تک اس کا یہ نام رہا اس

کے چاروں مصرعوں میں قافیہ لانا ضروری تھا۔ لفظ "رباعی" کا اطلاق اس پر چھٹی ہجری کے آخر نصف سے ہونا شروع ہوا۔ یعنی جبکہ تیسرے مصرع میں قافیہ نہ لایا جاتا تھا۔ پھر ڈاکٹر صاحب موصوف نے تیسری صدی ہجری سے شروع کر کے ساتویں صدی کے آخر تک کے نمونے پیش کر کے ثابت کیا ہے کہ خیّام کے زمانے تک صرف دوبیتی رائج تھی یعنی جس کے مصرعے ہم قافیہ تھے۔ یہاں ایسی "رباعی" اور "دوبیتی" کے نمونے دینے کی ضرورت اس لئے محسوس نہیں ہوتی کہ دیگر اصناف سخن کی طرح یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس میں سید حسن غزنوی سے پہلے اس کی نوعیت اور نفس مضمون کے اعتبار سے کوئی خاص امتیاز رہا ہو۔ سید حسن کے یہاں رباعی بھی (یعنی جس کا تیسرا مصرع ہم قافیہ نہ ہو) ملتی ہے اور دوبیتی (چاروں مصرعے ہم قافیہ) بھی پائی جاتی ہے۔

سیف الدین سوری جو کہ ۵۴۴ھ۔۱۱۴۹ء میں بہرام شاہ غزنوی کے ہاتھوں دار پر کھینچا گیا تھا اس کے متعلق سید حسن نے ایک "رباعی" بھی کہی تھی:

خوشنود ز بہرام روانِ محمود
می نازد ازو بہ خلد جانِ محمود
گر گشت فگار حلقِ سوری چہ عجب
شوم ست خلافِ خاندانِ محمود

اسی طرح ایک رباعی میں اس کا تخلّص بھی ہے اس لئے ضرور ہے کہ اسی کی ہونی چاہئے:

چون خواست حسن مدحِ شہنشاہی گفت
سوسن نہ چنین از سرِ آگاہی گفت
من آزادم بہ دہ زبان خاموشم
تو بندۂ بہ یک زبان ثنا خواہی گفت

دیکھئے سید حسن نے حسن تعلیل سے کتنا لطیف مضمون پیدا کیا ہے۔ تخئیل کی فراوانی اور وہ بھی بڑی لطافت کے ساتھ ہر جگہ موجود ہے۔ تاریخ جیسے خشک مضامین سے

لے کر مدحیہ مضامین ''رباعی'' میں ملتے ہیں۔ بہرام شاہ کے متعلق متعدد ''رباعیات'' ہیں مثلاً

سلطان بہرام تا جہان می گیرد
چون ست مرادِ او چنان می گیرد
زین پیش گرفت یک جہان در دو زبان
اکنون دو جہان بہ یک زبان می گیرد

ایک جگہ پھر ''سوری'' (شوری) کی تلمیح دیکھئے:

گر تو بخلاف دولت سلطانی
در کنج عدم نہان شدن بتوانی
اینک بنگر کہ شورلیش کردہ خلاف
جان داد و نمی رہد زسر گردانی

یہ ''رباعیاں'' سب کی سب شاعر کے آخر عہد کی معلوم ہوتی ہیں یعنی چھٹی صدی ہجری کے قریباً نصف آخر سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن ایک آدھ جگہ اس عہد میں بھی ''دوبیتی'' مل جاتی ہے۔ مثلاً بہرام شاہ کے وزیر منتخب الملک حسن کے متعلق ایک دوبیتی ہے اور وہ وزیر اسی عہد سے تعلق رکھتا ہے:

زین عالمِ دون منتخب الملک حسن
آراستہ شد ز دولتش روے زمن
اے صدرِ زمانہ از دل و دیدہ و تن
بنہاد چو روزگارِ دولت گردن

دولت شاہ ابن بہرام شاہ (المتوفی ۵۴۵ھ۔۱۱۵۱ء) کی مدح میں بھی ایک ''دوبیتی'' ہے

چون نام مبارک تو اے دولت شاہ
خورشید بہ زر نوشت بر صفحۂ ماہ

اقبال چہ گفت؟ گفت سبحان اللہ

اے دولتِ دولتی کہ دارد چو تو شاہ

لیکن ایسی ایک دو "بیتیوں" سے ڈاکٹر محمد اقبال صاحب کے اس نظریئے کی تردید نہیں ہوتی کہ رباعی کا اطلاق چھٹی صدی ہجری کے آخری نصف سے ہونا شروع ہوا۔ بلکہ ان کے قول کی مزید صداقت اس طرح ہو جاتی ہے کہ ۵۴۴ھ۔۱۱۴۹ء کی لکھی ہوئی (جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے) ایک رباعی ہمارے شاعر کی یوں ہے:

آئی کہ فلک بہ پیشِ تیغت ناید

بخشش بجز از کف چو میغت ناید

زخمِ تو کہ پیل کوہ پیکر نہ کشد

بر پشّہ ہمی زنی دریغت ناید

اور ابتدائی عہد میں وہ دوبیتی ہی لکھا کرتا ہے۔ مثلاً ہم لکھ چکے ہیں کہ بہرام شاہ کی تخت نشینی پر (۵۱۰ھ۔۱۱۱۶ء) اس نے لکھا ہے:

شاہا بر تخت بہ نشینی باید

چون شاہ نشست آفرینی باید

بر تختِ فلک ہمیں یمینی باید

بر جای چنان شاہ چنینی باید

یہ دوبیتی بھی ابتدائی عہد کی معلوم ہوتی ہے:

اے گشتہ ز طالعت دلِ گردوں شاد

باز چترت ز طایرِ میمون زاد

چون زہرہ بدستت قدح گلگون باد

قد خم شد مشتری کہ جان افزون داد

بہر حال یہ تو اس کی تاریخی "دوبیتیاں" تھیں۔ اب اس کی چند مدحیہ دوبیتیاں بھی دیکھئے:

شاہا فلکی کہ روی ازہر دارد
در خدمت تو پشت چو احمر دارد
خورشید کہ زہرۂ تخت او بردارد
ہم نامِ ترا چو تاج برسر دارد

ہم نام (بہرام) کی رعایت بہرام شاہ کے متعلق ایک جگہ اور ہے:

مریخ ز خنجر تو پرسد فتویٰ
ناہید بہ ساغر تو جوید ماویٰ
زانست کہ می کند بہ عیدِاضحیٰ
از بہر ترا این حمل آن ثور فدیٰ

دیکھئے آخری مصرعوں میں پھر حسن تعلیل سے اپنے کلام کو زینت دی ہے۔ یہی خصوصیت ایک "رباعی" میں ہے۔

گل رنگ گہر ز تاجِ شاہی بگرفت
لالہ بہ دل از چتر سیاہی بگرفت
چون سوسن بہ سیمیں کمری قانع شد
نرگس سرِ خود زیرِ کلاہی بگرفت (۱۶۸)

یہاں تک تو مدحیہ یا تاریخی رباعیوں کا ذکر تھا۔ اب تغزل والی رباعیات دیکھئے:

اے در طلب لطف تو دریا تشنہ
زین آبِ حیاتت گل رعنا تشنہ
چون مردمِ چشم خویش تاکی باشم
آب از سرِ ما گذشتہ و ما تشنہ

دیکھئے آخری مصرعوں میں کیسی اچھی مناسبت ہے اور کیسے لطیف جذبات ہیں۔ ایک اور رباعی ہے۔

نہ باد سحر بہ آہِ سردم ماند
نہ چہرۂ زر بہ روے زردم ماند
در ہر چہ نگہ کنم ازو زار ترم
ہم دردِ منِ خستہ دردم ماند

آخری مصرع میں حسرت ویاس کی انتہا کردی ہے۔ کم از کم اس دور کی ایسی رباعی نہیں گذری۔ ایک اور رباعی ملاحظہ فرمائیں:

دل در خورِ صحبت دل افروز نہ بود
زان برمنِ دل سوختہ دل سوز نہ بود
زان روز کہ رفت' گفت خوش بادشبت
ہرگز شب تیرہ مرا روز نہ بود

لفظ ''دل'' کا مختلف استعمال اور، ''دل سوختہ'' کی رعایت سے ''دل سوز'' کی ترکیب کتنی لطیف ہے۔ پھر آخری مصرعوں میں ''روزوشب'' کی الٹ پھیر سے ندرت پیدا کی ہے۔ ''عشق بازی'' کی کیفیت ایک رباعی میں سنئے:

گہ بر رخِ آن مہر کیا بازم عشق
گہ بر سرآں زلف دو تا بازم عشق
سر تا پایش زیک دگر خوب ترست
حیران شدہ ام کہ بر کجا بازم عشق

کیا نظیری نے اسی رباعی سے اپنی اس مشہور شعر کے لئے مضمون اخذ کیا ہوگا؟

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا این جاست

اب کچھ عشقیہ ''دوبیتیاں'' اور دیکھ لیجئے:

دل خیمہ میانِ سنبل و سوسن زد
خاریم نہاد و تکیہ بر گلشن زد
این رای سفر بین کہ برای من زد
جانہا بمیان نہاد و دل را تن زد

کیسے اچھے استعارات ہیں اور کیسی ندرت ہے، دیکھئے اپنی تخئیل سے سید حسن نے ایک دوسری دوبیتی میں کیسی جدت اور ندرت پیدا کی ہے:

ہر بوی کہ از مشک و قرنفل شنوی
از دولتِ آن زلف چو سنبل شنوی
چون نغمۂ بلبل زپیِ گل شنوی
گل گفتہ بود ہرچہ ز بلبل شنوی

"گل و بلبل" کے تعلق کا ایسا مضمون بمشکل دیکھنے میں آئے گا۔ شاعر نے اپنی دقّتِ نظر سے کمال پیدا کر دیا ہے۔ اب بھی کوئی شخص سید حسن کے شاعرانہ کمال کا معترف نہ ہو تو اس کی شاعری کا کیا قصور ہے؟ شاعر اپنے اشتیاق کو ایک جگہ اس طرح بیان کرتا ہے۔

اے باغ رخت گریز گاہ نظرم
گر باشد صد ہزار جان دگرم
صد دیدہ ز ہر کسے بجائے بخرم
تادر تو بصد ہزار دیدہ نگرم

پھر اس طرح اپنے دل کو تسلی دیتا ہے:

زین یک مہ بی مایہ میازار ای دل
گرمی نخرندت نشوی خار ای دل
ہر چیز کہ شد بہالیش بسیار ای دل
اندک گردد بدو خریدار ای دل

اور آخر میں بیزار ہو جاتا ہے:

آن رفت کہ کردمی نظر سوی تو من
خوش دل شدمی بدیدن روی تو من
رو رو کہ چو آگہ شدم از خوی تو من
گر مشک شوی ہم نکنم بوی تو من

یہ چونکہ دو بیتاں ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ شاعر کی جوانی کے ایام سے متعلق ہوں گی۔ پھر اس شاعر کی رباعیوں میں جو قرن ششم کے آخر نصف سے تعلق رکھتی ہوں گی۔ تصوف کی جھلک پائی جاتی ہے:

اے آن کہ بہ تو دیدۂ ظاہر نہ رسد
و آن جا کہ غمت رسید خاطر نہ رسد
ہر چند غم ہجر تو بی پایان ست
آخر نہ ہمانا کہ بہ آخر نہ رسد

یہ بھی اسی قبیل کی ہے:

یارم رہ و رسم عشق نیکو داند
ہر خردہ کہ شرط ست ازان بو داند
بگذاشتہ ام مصلحت کار بدو
گر بکشد وگر زندہ کند او داند

غرض کہ یہ ۲۳۴ رباعیاں اور دوبیتیاں ہیں جن میں مختلف اقسام کے مضامین ہیں اور جو مختلف طبائع کو محفوظ کر سکتے ہیں۔

شاعر کی خود اپنے متعلق رائے

یہاں تک شاعر کے کلام پر مختصر تبصرہ کیا گیا۔ اس سے اندازہ ہوا ہو گا کہ وہ کتنا بڑا

استادِ فن تھا۔ اس نے دوسروں کی تقلید کرنے میں اپنی ترقی دیکھی اور پھر خود اس کی تقلید بڑے بڑے شعراء نے کی جو اس کی استادی کی بیّن دلیل ہے۔ تاہم یہاں اس کی اپنی رائے اس کے متعلق پیش کی جاتی ہے:

مولف راحت الصدور (ص ۵۷۔۵۸) اپنی کتاب کے سبب تالیف کے سلسلے میں لکھتا ہے:

دو شهور سنه ثمانین و خمس مائة خداوند عالم رکن الدنیا والدین طغرل بن ارسلان را هوای مجموعۂ بود از اشعار، خال دعاگوی زین الدین می نوشت و جمال نقّاش اصفهانی آن را صورت می کرد، در آن حال امیر الشعرا وسفیر الکبرا شمس الدین احمد بن منوچهر شصت کله که قصیده تتماج گفته است حکایت کرد که سید اشرف (حسن غزنوی) به همدان رسید در مکتبها می گردید و می دید تا کرا طبع شعر ست، مصراعی بمن داد تا بر آن وزن دو سه بیت گفتم، بسمع رضا اصغا فرمود و مرا بدان بستور و حث و تحریض واجب داشت و گفت از اشعار متاخران چون عمادی (شهریاری۔ م ۵۸۲ھ) و انوری (م ۵۸۷ھ) و سید اشرف (حسن غزنوی م ۵۵۶ھ) و بلفرج رونی (م بعد از ۴۹۷ھ) و امثال عرب و اشعار تازی و حکم شاه نامه آنچ طبع تو بدان میل کند قدر دویست بیت از هر جا اختیار کن و یاد گیر و بر خواندن شاه نامه مواظبت نمای تا شعر بغایت رسد و از شعر سنائی (م ۵۴۵ھ) و عنصری (م ۴۳۱ھ و معزی۔ م ۵۴۲ھ) اجتناب کن هرگز نشونی و نخوانی که آن طبعهای بلند است، طبع تو ببندد و از مقصود باز دارد، شمس الدین شصت کله گفت، من و چند کس دیگر این وصیت را بجای آوردیم، بمقصود رسیدیم، بیت این است:

صبح بی روی تو نفس نه زند
نفسِ عشق بی تو کس نه زند
وصلِ تو نگذرد بکوی امید
تا درِ خانۂ هوس نه زند

بندہ گر باتو یک نفس بنشست
جزبر آن یار یک نفس نہ زند

اس اقتباس سے یہ باتیں معلوم ہوتی ہیں

(۱) شاعر نے کوئی مصرع (غزل کا) شمس الدین شصت کلہ کو دیا تھا جو ضرور ان مذکورہ اشعار کی زمین میں رہا ہوگا۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ اس کے موجودہ کلیات میں نہیں ملتا۔ اگر وہ مصرع غزل ہی کا تھا تو اس سے ظاہر ہے کہ ہمارا شاعر ہمدان کے سفر کی تاریخ تک (یعنی ۵۵۵ھ تک) غزل سے ضرور تعلق رکھتا تھا اور چونکہ اس نے شمس الدین شصت کلہ کے اشعار کو پسند کیا اس لئے ظاہر ہوتا ہے کہ اس عمر میں بھی اس کو غزل کا وہ رنگ پسند تھا جو ان اشعار میں پایا جاتا ہے۔

(۲) اس نے متقدمین میں سے رودکی اور عنصری سے اور معاصرین میں سنائی اور معزی کے اجتناب کرنے کا مشورہ دیا ہے کہ "آن طبعهای بلند است" لیکن اس نے خود انوری کو، عمادی، بلفرج رونی اور فردوسی کی صف میں رکھا ہے۔ کیونکہ اس کے خیال کے مطابق یہ شعرا ایسی بلند طبیعت والے نہیں تھے۔

(۳) اس نے شمس الدین شصت کلہ کو مختلف شعرا کا کلام یاد کرنے کا مشورہ دیا ہے کہ "شعر بہ غایت رسد" یہی شعر ہم کو نظامی عروضی (مقالہ دوم) سے بھی ملتا ہے جو اس کا ہم عصر ہے چنانچہ اس کے ان مشوروں سے صاف ظاہر ہے کہ وہ خود بھی ان چیزوں کا عامل رہا ہوگا۔ غالباً اسی لئے کہتا ہے۔

پاسبانانِ گنجِ فضلِ من اند
بر فلک دیدہ های بیداران
مشک پر مایگی ز خلقم داد
کیسہ داری کند بہ عطاران
چون رسیدم بہ جای بی مایان
نہ کنم پیش کار بی کاران

حواشی

۱۔ دولت شاہ (براؤن ص ۱۰۵) نے لکھا ہے کہ شاعر کو مرگِ مفاجات سے دوچار ہونا پڑا گو کہ ایسا تو نہیں ہوا تاہم ایسی موت ضرور ایک قسم کی شہادت ہے۔ ملاحظہ ہو مشکواۃ حدیث ۳۶۵۹۔ کتاب الجہاد؛

۲۔ مخطوطہ انڈیا آفس نمبر ۱۹۳۱ ق ۱۰۵ ب؛

۳۔ ایضاً ق ۶۔ الف؛

۴۔ دیوان جمال الدین آصفیہ۔ حیدر آباد ۱۲۳۷؛

۵۔ تاریخ بیہق۔ ص ۲۔ طہران ۱۳۱۷۔ دولت شاہ نے مختاری کے حال میں سید حسن کو سید عزالدین حسن لکھا ہے:

۶۔ دیوان سنائی۔ ق ۱۳ ب تا ۱۴ الف (بانکی پور) یہ قصیدہ سنائی نے غالباً اسی محمد بن ناصر علوی کے ایک قصیدے کی تقلید میں لکھا ہوگا۔ اس کا قصیدہ لباب الالباب (ج ۲۔ ص ۲۶۷) میں اس طرح شروع ہوتا ہے۔

چو خاک و باد کند نور و نم در آتش و آب
شکوہ آن عرضے باد جوہر آتش و آب

مسعود سعد (ص ۲۳۔ طہران ۱۳۱۸) کا بھی اسی ردیف میں ایک قصیدہ ہے:

نشستہ ام ز قدم تا سر اندر آتش و آب
توان نشستنِ ساکن چنین در آتش و آب

اسی میں کمالی کے قصیدے کا ذکر کرتا ہے:

شنیدہ ام کہ کمالی قصیدۂ گفتہ ست
ہمہ بناء ردیفش چنین در آتش و آب

لیکن شاید رونی کے یہاں یہ زمین سب سے پہلے ملتی ہے ۔

قبول یافت ز ہر ہفت اختر آتش و آب
وجیہ گشت بہ ہر ہفت کشور آتش و آب

۷۔ دیوانِ مسعود سعد (ایضاً) ص۵۹۹؛

۸۔ دیوانِ مسعودِ سعد ص ۶۲۔ ۶۳۔ بہت ممکن ہے کہ یہی سید حسن "عمید" بھی رہا ہو۔ مسعود سعد نے (ص ۵۹۔۶۱) دو قصیدے اس کی مدح میں لکھے تھے جن کے مطلع یہ ہیں:

ہیچ کس راغمِ ولایت نیست
کارِ اسلام را رعایت نیست
امروز ہیچ خلق چو من نیست
جز رنج ازین نحیف بدن نیست

مسعود سعد (ص ۳۳۷) کے یہاں عمید حسن کا ایک قطعہ ملتا ہے جس کے آخر میں صاف ظاہر ہے کہ وہ مسعود سعد کے پہلے قصیدے کا جواب ہے:

این قصیدہ جواب آں شعر ست
ہیچ کس را غمِ ولایت نیست

۹۔ یہ سید محمد بھی مسعود سعد کی زندگی میں وفات پا چکا تھا وہ (ص ۶۰۴) کہتا ہے:
بر وفاتِ محمد علوی۔ خواستم زد بہ شعر یک دو نفس.........

۱۰۔ مخطوطہ انڈیا آفس نمبر ۹۳۱۔ ق ۱۳۴ب تا ۱۳۵ الف۔ اس کے متعلق تفصیل آگے آئے گی؛

۱۱۔ تاریخ بیہق (ص ۷۶) کے مولف نے لکھا ہے۔ قتلِ فخر الملک در عاشورا بود سنہ خمس مائتہ (سہ شنبہ ۱۱ ستمبر ' ۱۱۰۶ء) و من آن یاد دارم و در عہد کودکی در دبیرستان معلم بودم بہ نیشاپور۔ مولف کا سال ولادت اسی کتاب کے مقدمے (یب) کے حاشیے میں ۴۹۳ بتایا گیا ہے۔

۱۲۔ سید حسن کے استاد کا نام و القاب یہ ہیں۔ الحکیم ظہیر الحق محمد بن مسعود الادیب بن الزکی الغزنوی مخدومی پرنسپل محمد شفیع صاحب نے تمتہ صوان الحکمہ (عربی ۱۹۳۵ء ص ۲۰۷۔۲۰۹) سے ان کے نام و القاب کی تفصیل دی ہے۔ اسی سے (ص ۲۰۸۔ ص ۴) یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کم از کم ۵۴۲ھ تک ضرور زندہ تھے۔

۱۳۔ پروفیسر شیرانی مرحوم نے کتاب تنقید شعر العجم (ص ۵۲۸) میں کمال کا سال وفات یہی ارجح قرار دیا ہے۔ یہاں یہ بھی عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ عموماً اس کو جمال الدین محمد عبدالرزاق کا بیٹا کہا جاتا ہے لیکن علامہ ابن الفوطی نے (اورینٹل کالج میگزین مئی ۱۹۳۵ء ص ۲۱) کمال بن عبداللہ بن جمال الدین عبدالرزاق کہا ہے؛

۱۴۔ لباب۔ جلد ۱۔ ص ۳۵۶۔ تعلیقات)؛

۱۵۔ مخطوطہ انڈیا آفس نمبر ۹۳۱۔ ق ۲۲۵ب؛

۱۶۔ ایضاً۔ ق۔ ۱۲۶۔ الف؛

۱۷۔ مجمع الفصحا وغیرہ میں عمادِ زوزنی کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ "بعضے گویند مداحِ طغان شاہ بود" یہ ممدوح غالباً طغان شاہ ابن موید آسی اوبہ (۵۶۹ھ / ۱۱۷۴ء تا ۵۸۱ھ / ۱۱۸۵ء) ہے۔ روضۃ الصفا (ج ۴۔ ص ۱۳۰) سے معلوم ہوتا ہے کہ تکش خان خوارزم شاہ (م ۵۹۶ھ۔ ۱۲۰۰ء) کی تخت نشینی پر عمادِ زوزنی نے یہ اشعار لکھے تھے:

بحمد اللہ از شرق تا غربِ عالم
بشمشیرِ شاہِ جہان شد مسلّم
سپہدارِ اعظم شہنشاہِ دنیا
نگین بخشِ شاہان، خداوندِ عالم
تکش خان بنِ ارسلان ابنِ اتسز
پدر بر پدر پادشہ تا بہ آدم

خرامید بر تختِ فیروز بختی
چو خورشید بر تختِ فیروزہ طارم

۱۸۔ معزّی کا سال وفات ۵۴۲ھ کے کچھ پہلے معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم معارف (اگست ۱۹۴۲ء) میں بحث کر چکے ہیں۔ اسی کے ساتھ ہم نے اس کے والد برہانی کی تاریخ وفات پر بھی بحث کی ہے۔ کہ وہ ۴۷۰ھ۔ ۱۰۷۷ء تک انتقال کر چکا ہوگا۔

۱۹۔ سنائی اور عمادی غزنوی کی وفات کے متعلق ہم نے معارف (ستمبر ۱۹۴۲ء ص ۱۹۹۔ ۲۰۰) میں ایک نئے ماخذ کو پیش کیا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ابو العلا گنجوی نے ان کے متعلق یہ اشعار لکھے تھے:

سخنوران بمن امروز اقتدا آرند
روا بود کہ منم قدوۂ ہمہ شعرا
چو رفت جانِ عمادی بمن گزاشت عماد
چو شد روانِ سنائی بمن گزاشت سنا
تبارک اللہ پنجاہ و پنج بشمر دم
بہ شست باشد پشتم چو شست گشتہ دوتا
بعقد ستین گشتہ ست پنجۂ عمرم
گہہ وداعِ رحیل ست ازین فناءِ فنا
سرِ ملوک منوچہر مہر چہر کزو
شدہ ست زندہ و فرخندہ خاندانِ نیا

ان اشعار سے یہ باتیں معلوم ہوتی ہیں ۔ (۱) دوسرے شعر سے ظاہر ہے کہ عمادی (غزنوی) اور سنائی اس وقت تک انتقال کر چکے تھے۔ (۲) تیسرے اور چوتھے شعر سے صاف ظاہر ہے کہ ابو العلا گنجوی کی عمر اس وقت ۵۵ سال کی ہو چکی تھی اور چھٹی دہائی میں تھی (۳) منوچہر خاقان شروان اس وقت زندہ تھا۔ موسیو خانیکوف (Khanikof)

نے تذکرہ خاقانی (اورینٹل کالج میگزین اگست ۱۹۳۶ء۔ ص ۵۲) میں ابو العلا گنجوی کی مفروضہ تاریخ پیدائش ۴۸۵ھ۔ ۱۰۹۲ اور ۴۹۰ھ۔ ۱۰۹۷) کے درمیان بتائی ہے۔ اس حساب سے وہ اشعار شاعر کی ۵۵ سالہ عمر میں یعنی ۵۴۰ھ۔ ۱۱۴۵ء اور ۵۴۵ھ۔ ۱۱۵۰ کے درمیان لکھے گئے ہوں گے۔ یعنی جبکہ عمادی اور سنائی قضا کر چکے تھے۔ لیکن سنائی نے ۵۴۲ھ۔ ۱۱۴۷ء) میں معزی کا مرثیہ لکھا تھا۔ اس لیے وہ اشعار یقیناً ۵۴۶ھ کے بعد کے ہوں گے۔ اب دوسری طرف آیئے تو معلوم ہوگا کہ منوچہر جس کی وفات Zambour (Manual de genealogie ص ۱۸۲) کے قول کے مطابق ۵۵۰ھ۔ ۱۱۵۵ء ہے' ان اشعار میں ممدوح ہے۔ اس طرح ثابت ہوا کہ وہ اشعار ۵۵۰ھ کے پہلے اور ۵۴۲ھ کے بعد کسی وقت لکھے گئے۔ اور بہت ممکن ہے کہ وہ زمانہ ۵۴۵ھ ہی کا ہو' جبکہ سنائی کی وفات (محققین کے نزدیک) ہوئی تھی۔ اور اگر واقعی یہی سال تھا تو پھر ابو العلا گنجوی کی پیدائش بھی (۵۵ سال پہلے) ۴۹۰ھ میں مانی جائے گی۔ بعد میں استاذی ڈاکٹر ہادی حسن صاحب کی کتاب فلکی شیروانی (ص ۹۵) دیکھی۔ اس میں بھی یہی اشعار ہیں۔ لیکن سلسلے کے اشعار نہیں ہیں۔ انہوں نے ۵۴۴ھ کے بھی پہلے ان شعرا کا سالِ وفات ارجح قرار دیا ہے۔

عمادی کے لئے ہمارا مضمون معارف (مارچ ۱۹۴۷ء) میں ملاحظہ فرمائیں۔

۲۰۔ فہرست انڈیا آفس (ج ۲۔ ص ۶۳۸) میں عثمان مختاری کا سالِ وفات ۵۴۴ھ یا ۵۵۴ھ ہے۔

۲۱۔ ادیب صابر کے متعلق ہمارا مضمون معارف (ستمبر ۱۹۴۲ء) میں ملاحظہ فرمائیں۔

۲۲۔ سوزنی کے متعلق ہمارا مضمون معارف (مارچ ۱۹۴۵ء) میں ملاحظہ فرمائیں۔

۲۳۔ اس نظام الملک کے والد فخر الملک کی تعریف میں آذری کے بیس اشعار آثار الوزرا (ق ۱۶۲۔ الف۔ ب) میں ملتے ہیں۔ جن میں سے کچھ یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

فخرِ سنجر کہ بود فخر الملک
بود بحر وزارتش را فلک

در زمانِ ولایت و تمکین
فتح کرد او ممالکِ غزنین
لعل از مخزن شہِ کشور
آوریدند در کمالِ کبر
کرد آن گاہ اتفاق وزیر
کہ کند ساغرے ازان تدبیر
کاسۂ زان بہ فکر بتراشید
کہ چو آن کس بہ ہیچ قرن نہ دید
مجلسے ساخت بہرِ عیشِ وزیر
پرُ ز اشرافِ جملہ شاہ و امیر
بود آن روزِ ساعتِ نوروز
کرد بزمے بہ طالعے فیروز
چون گرفت آن وزیر جام بہ کف
بنظارہ ملوک صف در صف؛
ناگہان جام اوفگند از دست
از ہوا بر زمین زود شکست
جملہ گفتند ترا چہ حال افتاد
و آن چہ کردی چگونہ ات دل داد
داد پاسخ وزیر با تدبیر
کین ندامت بد از پئِ تقصیر
کین چنین جوہرے بہ آلتِ لہو
صرف کردم بسے خطا بد و سہو

بود جوہر مناسبِ قندیل
کہ کنند از برائے کعبہ سبیل
چون بشد آن ہدایت از دستم
زدمش بر زمین و بشکستم

دوسرے شعر کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ چونکہ غزنین کی فتح میں فخر الملک کی بجائے اس کا بیٹا نظم الملک محمد تھا' اس لئے اسی کے متعلق یہ قصہ ہوگا۔ اور نوروز (۲۱مارچ ۱۱۱۷ء) کا زمانہ بھی غزنین میں گزرا ہوگا۔

۲۴۔ اس قصیدے کا ذکر سب سے پہلے غالباً روضۃ الصفا (ج ۴۔ ص ۵۰۔ ۱۹۱۵ء لکھنو) میں آیا ہے۔ لیکن وہ دیوان کے کسی نسخے میں نہیں ملتا۔ تاہم شبہے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ شاعر کا کچھ اور کلام ایسا بھی ہے جو تذکروں یا تاریخوں میں تو ہے لیکن دیوان میں نہیں ہے۔ طبقات ناصری (راورٹی ص ۱۱۰۔ ج ۱) سے ایک اہم بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ بہرام شاہ کے ایک سکّے کا مضمون جس کا انگریزی ترجمہ راورٹی نے دیا ہے بالکل اسی شعر کے ہم معنی ہے۔ اگر یہی شعر اس کے سکّے پر کندہ تھا تو اس سے زیادہ کامیابی کسی شاعر کو کیا نصیب ہو سکتی تھی۔ دولت شاہ (براؤن ایڈیشن۔ ص ۷۴) سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانے میں جبلی نے غزنین میں سنجر کی مدح میں ایک قصیدہ پڑھا تھا جس کا مطلع یہ ہے:

زعدلِ کاملِ خسرو زامنِ شاملِ سلطان
تذرو و کبک و گور و مور در گشتند در گیہان

دولت شاہ (ص ۷۳) سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جبلی نے بہرام شاہ کے دربار میں چار سال مداحی کی۔ لیکن حبیب گنج اور جامع مسجد بمبئی کے نسخوں میں کوئی ایسا کلام نہیں ملتا۔

۲۵۔ مخطوط انڈیا آفس۔ ق ۱۸۴ اب

۲۶۔ مخطوط انڈیا آفس۔ ق ۹۹ ب۔ اس کے چوتھے شعر میں بہرام شاہ کو "جمال ملک" کہا گیا

ہے ایک جگہ اور شاعر نے کہا ہے ؎

فرخندہ جمالِ ملک دین را
از جملہ ملوک برگزیدم
بی زار از این و آن گر او را
بہرِ کرم و ہنر گزیدم
رویم بادا فگار چون زر
گر خواجہ برائے زر گزیدم

۲۷۔ مخطوطہ ایضاً۔ ق ۵۷۔ الف۔ اس قصیدے کا نواں شعر پڑھ کر عرفی کا یہ شعر پڑھیے

کشیدہ فتنۂ معزول سر بزیرِ لحاف
دریدہ ظلم فراموش طبل زیر گلیم

۲۸۔ اس سے یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ سنائی شاعری میں عثمان مختاری کے شاگرد تھے۔ سنائی نے (دیوان۔ ق ۳۹ ب۔ بانکی پور) اس کی مدح بھی کی ہے:

نہ شود پیش دو خورشید و دومہ تارے تیر
کہ برد درۂ از خاطرِ مختاری تیر
مطلعِ شعرِ تو چون مطلع شمس است ولیک
جاہلان راچہ شبِ مظلم و چہ شمسِ منیر

۲۹۔ مخطوطہ ایضاً۔ ق ۲۰۔ الف۔ ب

۳۰۔ اورینٹل کالج میگزین (ص ۵۲۔۵۵، اگست ۱۹۳۷) میں پروفیسر شیرانی صاحب نے سوالک پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

۳۱۔ مخطوطہ انڈیا آفس۔ ق ۹۲ ب۔ اسی مخطوطہ (ق ۹۵۔ الف) میں ایک اور قصیدہ ہے جو شاعر نے غزنین سے ہندوستان کو روانہ ہوتے وقت پڑھا ہوگا۔

همایون رایتِ اعلیٰ همی رائے سفر دارد
زیک سو ہم عنانِ فتح و دیگر سو ظفر دارد
مبارک اوجِ تختِ او فلک را بر کنار آرد
نجستہ بازِ چترِ او جہان را زیرِ پر دارد
خداوندِ جہان بہرام شاہ آن خسروِ صفدر
کہ ملک از عزم و حزمِ او بسی تیغ و تبر دارد
دلِ کفار ازین عزمش چو حلقہ ست و عجب تراین
کہ حزمِ تنگ میدانش در آن حلقہ گزر دارد
خداوندا درین دفتر حسن رایک دو نقش آمد
کہ گاہش آن کند دل شاد و گاہ آن در خطر دارد
سعادت گویدش بر خیز چون در خانہ بنشیند
ضرورت گویدش بنشین چو کام از جائے بردارد
چو گردون فتنہ و ساکن چو دیدہ ساکن و فتنہ
زحالِ خویشتن و اللہ کہ بندہ آن خبر دارد

۳۲۔ایضاً۔ق ۱۱۵ب تا ۱۱۶ الف ۔اسی دوسری جنگ کے متعلق جس میں محمد ابو حلیم ہلاک ہوا تھا مسعود سعد سلمان (م ۵۱۵ھ۔۱۱۲۱ء) نے بھی ایک قصیدہ (دیوان۔ ص ۱۱۴،۱۱۵۔ طہران ۱۳۱۸) لکھا تھا:

کوسِ ملک آوازِ نصرت بر کشید
کفر و شرک از ہول آن سر در کشید
فخرِ شاہانِ جہان بہرام شاہ
شو سوے ہندوستان لشکر کشید
چون عروسِ شرمگین بد خواہِ شاہ
سرز شرمِ شاہ در چادر کشید

۳۳۔ مخطوطہ انڈیا آفس۔ق ۱۰۲ب تا ۱۰۳ب

۳۴۔ایضاً ۔ق ۱۸ب تا ۱۹ الف

۳۵۔ایضاً ۔ق ۴۳ الف۔ ۴۴ الف

۳۶۔ایضاً۔ق ۱۳۲ ' الف

۳۷۔ یہ قصیدہ مختلف نسخوں کے علاوہ راحت الصدور (ص ۱۹۳) میں بھی ہے اس کے ساتویں شعر میں "باز چترش" ہے۔اس کی مزید تفصیل ہمارے مضمون "معارف" (مارچ و اپریل ۱۹۴۴) میں دیکھیں۔

۳۸۔ راحت الصدور (ق ۔ ۷۵ الف) سے معلوم ہوتا ہے کہ چغری بیگ (م ۴۵۲ھ۔ ۱۰۶۰ء) کے عہد سے مرو سلجوقی دارالحکومت ہوگیا تھا۔ لیکن کلیات انوری (ص ۶۵۔ ۱۴۳) سے معلوم ہوتا ہے کہ نیشاپور رہے۔اسی طرح سید حسن کے ایک قصیدہ میں بھی نیشاپور ملتا ہے۔

ہیچ ابرے نہ جہدے از طرف نیشا پور

کہ ازین دیدہ بہ بغداد نہ باران آرد

(مخطوطہ انڈیا آفس ق۔ ۱۴' الف)

مرو اور نیشاپور کے لیے غزنین سے قدیم راستہ ایک ہی تھا اور وہ بامیان اور بلخ پر سے تھا۔ جیسا کہ ہمیں لین پول کے نقشے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کہ Sir.w.w Hunter کی کتاب A History British India Vol-1 کے صفحہ ۱۶ کے مقابل میں ہے۔

۳۹۔ مخطوطہ انڈیا آفس۔ق ۳۹(ب تا ۴۰ الف) ع دست گیر مارشید الدین بس ست یہ مصرع جو آگے مذکور ہے دراصل برٹش میوزیم کے نسخے میں ہے اور انڈیا آفس کے نسخہ میں صرف اس جگہ رشید الدین کے بجائے نصیر الدین ہے لیکن چونکہ اس کی کنیت ابو طاہر ہر نسخے میں مذکور ہے ۔ اس لئے ان مختلف القاب سے دھوکا نہیں کھانا چاہئے۔ راحت الصدور (ص ۱۶۷ وغیرہ) میں "شرف الدین" لقب ہے اور یہی معزی کے قصیدہ (بست مقالۂ

قزوینی ص ۵۹) سے معلوم ہوتا ہے۔ حبیب السیر (جزو چہارم۔ جلد دوم۔ ص ۱۰۰، ۱۰۱) میں
اسے "وجیہ الملک" بھی کہا ہے اس ابو طاہر سعد بن علی کا قیام مرو شاہجہان میں تھا جیسا کہ
معزی کے ایک مصرع (حواشی حدائق السحر ص ۱۳۲) سے معلوم ہوتا ہے۔

ع۔ فرمان بر توانس و جان در شہر مرو شاہجہان

۴۰۔ مخطوطہ انڈیا آفس۔ ق ۱۱۸ الف تا ۱۱۹ الف

۴۱۔ ایضاً ق ۴۰ ب۔

۴۲۔ راحۃ الصدور (ص ۱٦۷) میں ڈاکٹر محمد اقبال صاحب نے اس وزیر کے نام کی مختلف قرات نقل کی ہیں۔ یعنی یغمان، تغان، طغان، تغار، تقار، لیکن ہمارے شاعر کے اگلے قصیدے میں "تغری طغان" نام ملتا ہے، اور یہی صحیح ہو گا۔ برٹش میوزیم کے مخطوطہ 4514 VI کے ورق ۱۱۸ میں بھی یہی قرات ہے۔ صبح صادق (ج ۳۔ ق ۱۰٦٦ ب) میں لکھا ہے کہ وزیر ہونے پر اسے نظام الدین تغان بک کا خطاب ملا۔

۴۳۔ مخطوطہ انڈیا آفس۔ ق ۱۴۱ ب

۴۴۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی کتاب "خلافت اور ہندوستان" (ص ۲۱، ۲۲) سیاہ خلعت کے متعلق ملاحظہ فرمائیں۔

۴۵۔ مخطوطہ انڈیا آفس نمبر ۹۳۱۔ ق ۱۲۵۔ الف معلوم ہوتا ہے کہ سید حسن نے یہ قصیدہ معزی کی تقلید میں لکھا ہو گا کیونکہ اس کا ایک قصیدہ (انتخاب شعرائے متقدمین ۳۔ ق ۱۷٦ا۔ ب۔ حمیدیہ بھوپال، اس طرح شروع ہوتا ہے:

بفالِ فرخ و عزمِ درست و رائی صواب
سفر گزیدم و کردم سوی رحیل شتاب
بدان قضا چو رضا دادم اندر آن ساعت
نشستم از برِ دیو جہندہ ہم چو شہاب

۴٦۔ عراق میں محمود بن ملک شاہی کے دربار میں جب قوام الدین وزیر تھا اس وقت سنائی

(کلیات ۔ ص ۷۷۔۷۹ بمبئی) نے اس کی مدح کی تھی:

تا سرا پردہ زد بہ علّیین
قدرِ صدر اجل قوام الدین
شد عراق از نگارِ خامۂ او
خوش لقا چون نگار خانۂ چین
گرچہ صد کار داشتم در مرد
لیک بہرِ تو رفتم از غزنین

۴۷۔ لباب (ج ۱۔ ص ۲۸۱۔ ۲۸۲) میں لکھا ہے کہ اس موقع پر امام فخر الدین محمد بن محمود بن احمد نیشاپوری نے بہرام شاہ کی طرف سے سنجر کا دل صاف کرنے کو یہ دوبیتی پڑھی تھی:

گر آب دہی نہال خود کاشتۂ
ور پشت کنی بنا خود افراشتۂ
من بندہ ہمانم کہ تو پنداشتۂ
از دست میفکنم چو برداشتۂ

حبیب السیر (جزو چہارم ۔ ج ۲۔ ص ۱۰۲) میں عزالدین اصفہانی اور قوام الدین ابو القاسم ناصر کی دوبیتیاں بھی اسی وزن میں ہیں۔

۴۸۔ تاریخ فرشتہ (طبع لکھنو ص ۳۵) سے معلوم ہوتا ہے کہ محمود غزنوی کو بھی خلیفۂ وقت نے ایسا رایت بھیجتا تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی کتاب "دنیائے اسلام اور خلافت" بھی دیکھیں۔ اور توقیع کے لیے رسالہ الناظر (لکھنو۔ ستمبر و اکتوبر ۱۹۰۷ء) میں دیکھیں۔

۴۹۔ تاریخ بیہق کے صفحہ ۲۱۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی ظہیر الملک نے منصور بن محمد بن اسحٰق کا مرثیہ لکھا تھا۔ اور ص ۲۲۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لڑکے عمید خراسان محمد بن منصور (بیہقی) کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا یعنی وہ قصیدہ اس کی شہادت ۵۳۶ھ ۔ ۱۱۴۱ء کے بہت پہلے لکھا ہوگا۔ تتمہ صوان الحکمۃ فارسی ص ۷۲ لاہور (۱۹۳۰ء)

میں بھی اسی ظہیر الملک کا ذکر ہے۔ اور اس کے عربی ایڈیشن (۱۹۳۵ء) کی تعلیقات (ص۱۹۶-۱۹۸) میں اس کے متعلق تفصیل دی ہے۔

۵۰۔ مخطوطہ انڈیا آفس۔ ق ۶۲ (ب) تا ۶۳ (الف)۔ دولت شاہ (مصححہ براؤن۔ ص۱۵۶) نے لکھا ہے کہ یہ قصیدہ رفیع الدین لبنانی کا ہے۔ لیکن ہمارے کئی نسخوں میں یہ قصیدہ ملتا ہے اس لیے دولت شاہ پر اعتماد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نیز اس عہد اور اس ممدوح سے رفیع الدین کا تعلق نہیں ہے۔ مزید بر آنکہ بارہویں اور تیرہویں شعر میں شاعر اپنے سید ہونے کا اظہار کر رہا ہے۔ اس لیے وہ سید حسن ہی کا کلام ہے۔ دولت شاہ (ص۱۵۶) نے قصیدہ کے بارے میں لکھا ہے کہ "درمدح سید اجل فخر الدین زید بن الحسن الحسینی کہ از اکابرِ سادات رے است واحتشام واموال وضیاع او درملک بے نہایت بودہ"۔

۵۱۔ مخطوطہ انڈیا آفس۔ ق ۱۳۶ (ب)

۵۲۔ ایضاً ۔ ق ۱۰۹ (ب) تا ۱۱۰ (ب) حبیب گنج کے مجموعہ "مونس الاحرار" (ص ۱۰۷۷، ۱۰۷۴) میں ایک ممدوح ابراہیم بن حسن کی مدح میں سید حسن کا ایک ترکیب بند' قوافیِ مکرر میں ملتا ہے ممکن ہے کہ وہ بھی اسی زید بن حسن کا بھائی ہوگا۔ ہم یہاں صرف ضروری اشعار نقل کرتے ہیں:

آں دلبرے کہ خوبیِ بسیار یارِ اوست
دردا کہ در دلم ہمہ پیکار کارِ اوست
شخصم موی گشت عجب تر مگر کہ کرد
اشکم چو چشم چشمۂ آموی موی اوست

شاہِ ستارہ جاہ براہیم بن حسن
کاندر نبرد خصم چو ہوشنگ شنگ شد
شاہا نعال خنگِ تو ہر ماہ ماہ باد
اقبال راہ بہ پیش تو صد راہ راہ باد

ان اشعار میں ممدوح کو "شاہ" کہا ہے۔ شاید اسی لئے کہ وہ بڑا رئیس تھا۔

۵۳۔ مخطوطہ انڈیا آفس۔ ق ۵۲ الف۔ عمادی شہریاری (م ۵۷۳ھ۔۱۱۷۷ء) کا بھی ایک ممدوح (مخطوطہ علی گڑھ) ہے۔

اے دستِ تو جود را بہانہ
پای تو وجود را نشانہ
عبدالصمد اکرم الخلایق
سرمایۂ بختِ جاودانہ

۵۴۔ قریب قریب اسی زمانے میں سید حسن کو وہ شاگرد ملا ہوگا جو انڈیا آفس کے مخطوطہ نمبر ۱۹۳۱ کا مقدمہ نگار ہے اور جس نے اس مقدمہ میں لکھا ہے۔

"...... حقوقِ دینی و دنیاوی بیست سالہٴ وے ور ذمت من است و مدتِ مدید بود تا این ضعیف از فرط ولای آن شہید بہ غربت در خدمتِ او غربت را بر قربتِ اقارب اختیار کردہ بود و مولد و منشار او داع کردہ......"

شاعر کا انتقال جیسا کہ ہم آگے چل کر ثابت کریں گے ۵۵۶ھ۔۱۱۶۱ء) میں ہوا تھا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ شاگرد نے غربت میں یعنی خراسان میں قریب قریب اسی عہد میں اپنے استاد سے تعلق پیدا کیا ہوگا۔

۵۵۔ اس قصیدے کے پہلے مصرعے میں خیام سے توارد ہو گیا ہے۔

خیام کی دوبیتی ہے:

چشم زغمت بہ ہر عقیقی کہ بہ سفت
بر چہر ہزار گل ز رازم بہ شگفت
رازے کہ دلم ز جان ہمی داشت نہفت
اشکم بہ زبانِ حال با خلق بہ گفت

۵۶۔ اس عہد کے متعلق ایک دوبیتی ملتی ہے:

تشریفِ شہنشہ کہ بر شیراز افتاد
زان در فلک آوازہ در آواز افتاد
زان پس کہ چو آفتاب دم ساز افتاد
چون سایہ نہ دانم کہ چرا باز افتاد

۵۷۔ شاعر کے کلام میں دو ممدوح ایسے ملتے ہیں جن کا حال اور سال نہیں مل سکا۔ ایک کوئی خواجہ مخلص ہیں۔ ان کی مدح میں دو قطعے ہیں۔ پہلے قطعے میں سات شعر ہیں اور وہ اس طرح شروع ہوتا ہے۔

دلِ من از فراقِ خواجہ مخلص
خداوندا تو می دانی کہ خستہ است

دوسرا قطعہ دعائیہ ہے اور اس میں بارہ شعر ہیں:

چندان کہ در دوازدہ برج ست ہفت مرغ
اے مخلصِ قدیم ترا بخت یار باد

دوسرا ممدوح کوئی بادشاہ جمشید بن اسعد ہے جس کی مدح میں صرف پیرس کے مخطوطہ نمبر ۷۹۷ میں ایک قصیدہ ہے (ق ۸ ب ۹ الف)

چون لشکر نوروز کند عزم تخیّم
مرغانِ طرب بانگ بر آرند ترنّم
دارائی جہان پادشاہِ مشرق و مغرب
سلطان ملک مرتبت و اصل تحکّم
والائے ملک عادل جمشید بن اسعد
کش با ملکانِ ہمہ گیتی ست تقدّم

اگر واقعی یہ قصیدہ سید حسن ہی کا ہے تو اس ممدوح کو تاریخ نہیں جانتی۔

۵۸۔ مخطوطہ برٹش میوزیم ق۔ ۱۳۰

۵۹۔ مخطوطہ ایضاً ۔ق ۱۳۰ ب میں ردیف "می دہد" ہے اور انڈیا آفس (ق ۱۳۶۔الف) میں "می دہم" ہے۔

۶۰۔ مخطوطہ انڈیا آفس۔ق ۹۹۔الف

۶۱۔ایضاً۔ق۱۹(ب)الف تا۲۰(الف)

۶۲۔ تاریخ بہرام شاہی میں ہم تفصیل سے بحث کر چکے ہیں اس میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ خسرو شاہ کا بڑا بھائی دولت شاہ بھی اغلب ہے کہ ایسی ہی اسیری میں بطور ضمانت ۵۱۰ھ۔۱۱۱۷ء میں بہرام شاہ کی تخت نشینی پر سنجر کے یہاں رہا ہو۔اس کی واپسی اور "بندگی کردن" کا تذکرہ حدیقہ سنائی (ص۶۲۶۔۶۲۸ لکھنو ایڈیشن) میں ملتا ہے۔

۶۳۔ مخطوطہ انڈیا آفس۔ق۱۶(الف)

۶۴۔ایضاً۔ق ۸۲(ب) تا۸۳(الف)طبقات ناصری (راورٹی۔ص۱۱۱) میں بہرام شاہ کے لڑکوں کی فہرست میں دولت شاہ کا نام اول ہے۔سید حسن ق ۱۴۲(الف) نے بھی کہا ہے۔

دانم توبہ این بزگواری
فرزند مہین پادشائی
دولت شہ تاجور کہ دارد
میراث زعونِ مصطفائی

۶۵۔ایضاً۔ق۶۶(الف)

۶۶۔ایضاق۱۳۹(الف)اس محمد بن منصور قاینی کے متعلق ہم تفصیل سے تاریخ بہرام شاہی میں لکھ چکے ہیں۔جس سے معلوم ہو تا کہ وہ محمد بن منصور بن سعید بن احمد بن حسن میمندی ہے۔(یہ حسن میمندی سلطان محمود غزنوی کا وزیر تھا) یہ محمد بن منصور قاینی ضرور مفتی مشرق محمد بن منصور (حدیقہ۔ص۔۵۵۹ لکھنو وراحت الصدور ص ۴۷۳۔۴۷۵) سے مختلف تھا' محمد بن منصور قاینی کے متعلق عثمان مختاری (دیوان۔ق ۱۶۳/الف بانکی پور) کہتا ہے:

آنان که به اوصافِ شرف مذکور اند
وزرای و ضمیر مملکت را نور اند
از حرمتِ احمد حسن مہجور اند
زان در حسدِ محمد منصور اند

سید حسن نے ایک اور جگہ (مخطوطہ ایضاً ۱۲۲/الف کہا ہے:

ای سرور کردہ پادشاہت
اوجِ فلک ست پایگاہت
تا بخت بہ پیشِ تو میان بست
سوی رفعت کشادہ راہت
بر حق باشد کہ سعدِ افلاک
از چشم رضا کند نگاہت
حسن تو چو نام تو بود بس
با حسن فعال تو گواہت
واللہ کہ محمد ابن منصور
ہمچون پدرست نیک خواہت
با دولت پایدارِ تو بیش
عالم نہ رسد بہ دستگاہت
چون فصل خدای عرش کنیت
ای صدر جہان ہمہ پناہت

معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن منصور کو ہندوستان بھیج کر اس کی جگہ ابو نصر محمد اور پھر حسن ابن احمد (جس کا ذکر آگے آئے گا) کو غزنین میں صدر مقرر کیا گیا تھا۔

۶۷۔ مخطوطہ ایضاً۔ق ۵۹ (الف) اس نسخے میں ع قطبِ فلکِ دولت ابو نصر محمد ہے اور مذکورہ بالا

مصرع برٹش میوزیم کے نسخے کے مطابق ہے۔ سید حسن کے یہاں (برٹش میوزیم۔ق ۱۲۴ اب) ایک قصیدہ ابوالمعالی نصر اللہ بن محمد (بن عبدالحمید بن احمد بن عبدالصمد) کی مدح میں بھی ہے:

ای راحتِ روح و رامشِ تن
وصلِ تو طرب فزای شیون
از دوستیِ تو عقل غافل
دور از شدم بہ کامِ دشمن
آخر نہ منم غلامِ صدری
کا قبال شدہ ست زد مبرہن
خورشیدِ صفات ابو المعالی
کز رای ویست ملک روشن
نصر اللہ بن محمد آن کو
جان است و ہمہ جہانیان تن
کلکت بہ رہِ سخن نگاری
دستت بہ گہ عطیہ داون
زہرِ تنِ فضل راست تریاک
دردِ سر آز راست چندن

یہ نصر اللہ بن محمد یا تو وہی ابو نصر محمد ہے یا پھر اس کا بھائی ہے۔ یہ نصر اللہ بن محمد (جس کے متعلق ہم تاریخ بہرام شاہی میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں) بعد میں بہرام شاہ کے بیٹے خسرو شاہ (م ۵۵۵ھ۔ ۱۱۶۰ء) کا وزیر رہ چکا ہے۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے عبداللہ ابن المقفع کی کتاب "کلیلہ ودمنہ" کا ترجمہ عربی سے فارسی میں کیا تھا' لیکن علامہ ابن الفوطی کی مجمع الآداب (اورینٹل کالج میگزین صفحہ ۲۲ بابت مئی ۱۹۳۵ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ خود مجد الدولہ عبدالرشید بن مسعود بن محمود غزنوی اس سے پہلے "کلیلہ ودمنہ"

کا ترجمہ عربی سے فارسی میں کر چکا تھا۔

۶۸۔ مخطوطہ برٹش میوزیم۔ق ۱۲۱

۶۹۔ مخطوطہ انڈیا آفس۔ق ۹۰ (الف) تا (ب)

۷۰۔ ایضاً۔ق ۵۳ (الف)

۷۱۔ ایضاً۔ق ۸۸ (ب)

۷۲۔ ایضاً۔ق ۶۸ (ب) اس زمانے میں "صدر" کا خطاب "قوام الدین" کئی جگہ ملتا ہے اس قوام الدین حسن کے علاوہ بہرام شاہ کا ایک اور وزیر ابو نصر محمد (جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں) اس خطاب سے مخاطب ہے۔ سنجر کا وزیر "قوام الدین" ابو القاسم ان سب سے زیادہ مشہور ہے۔ یہ ترجیع بند (ق ۶۹) الف "نوروز" کے موقع پر لکھا گیا تھا:

سال و مہ عمرِ نو و شاہانِ تو
ہمچو این نوروز روز سور باد

۷۳۔ ایضاً۔ق ۱۳۸ (ب)

۷۴۔ ایضاً۔ق ۱۱۱ (ب)

۷۵۔ کرمان کے متعلق ہم تاریخ بہرام شاہی میں سیف الدین سوری کے حملے کے سلسلے میں تفصیل سے دے چکے ہیں۔ مختلف حوالے بھی وہیں ملاحظہ فرمائیں۔

۷۶۔ مخطوطہ ایضاً۔ق ۱۳۱ (ب)

۷۷۔ ایضاً۔ق ۴۵ (الف) مذکورہ بالا قصیدے کے پانچویں شعر میں احمد ابن عمر کو "صدر الدین" کہا ہے۔ اسی خطاب کا ایک شخص حدیقہ (ص ۴۰۸ بمبئی) میں ابو طاہر عمر بن ابو بکر بن محمد ہے:

صدرِ دین شمعۂ ائمہ عمر
کہ نیارد چنو زمانہ دگر

۷۸۔ مخطوطہ ایضاً۔ق ۳۰ (ب)

۷۹۔ مخطوطہ رام پور و برٹش میوزیم

۸۰۔ مخطوطہ انڈیا آفس ۔ ق ۱۲۸ (ب) کلیات انوری میں ایک جمال الدین "خطیب" (ص۔ ۲۲۲) ہیں جو آگے (ص ۲۴۷) اس طرح یاد کئے گئے ہیں:

صدرِ امم · امامِ طریقت جمالِ دین

لطفِ خدا و روحِ ہنر مایۂ دول

لیکن یہ کوئی دوسرے شخص ہیں کیونکہ انوری کا غزنین کو جانا ثابت نہیں ہے۔ اور ص ۴۳ کے حاشیے پر اسے خطیب رے کسی شارح نے لکھا ہے۔

۸۱۔ مخطوطہ رام پور

۸۲۔ لباب الباب۔ جلد دوم ص ۲۷۶ یہ رباعی 'With Hamour and Fancy of Parsia by M.N Kuke" کے صفحہ ۲۶ پر بھی منقول ہے۔

۸۳۔ مخوطہ انڈیا آفس۔ق ۷۲ (الف) تا ۷۵ (الف)

۸۴۔ ایضاً۔ق ۴۷ (ب) تا ۴۸ (الف)

۸۵۔ ایضاً۔ ق ۶۹ (ب) تا ۷۰ (الف) غالباً اسی بہار کے موقع پر یہ قصیدہ بھی لکھا ہوگا (ق ۷۱ الف)

بزرگ جشنِ ہمایون بہ ماہ فروردین

خجستہ بادا بر آفتاب روی زمین

علاء چترو کلاہ و بہاو افسر و تخت

جلالِ تیغ و نگین و جمالِ مسند و دین

ابو المظفر بہرام شاہ بن مسعود

کہ جان صورت وملک ست وروی دولت ودین

زمانہ قدرت شاہی اگر نگاہ کند

بہ چشم رافت و رحمت بہ بندۂ مسکین

اگرچہ ہمچو الف درجہان نہ دارد ہیچ
شود بہ دولتِ تو تاجدار ہمچون شین

۸۶۔ مخطوطہ برٹش میوزیم نمبر ۴۵۱۴۔ق ۱۲۵(الف)

۸۷۔ روحانی کا سوگند نامہ اس طرح شروع ہوتا ہے زہی بفکرتِ روشن ز چشمۂ حیوان۔ در آفرینشِ عالم دلت معما خوان۔ اس میں شاعر نے ایک دوسرے شاعر فرزدق کے متعلق شوخی کی ہے اور قسموں کے بعد کہتا ہے:

کہ در سرای فرزدق نہ بودہ ام ہرگز
مگر بہار و دی و تیر ماہ و تابستان

میرا خیال ہے کہ اسی سلسلہ میں سراجی (لباب الالباب جلد دوم صفحہ ۳۲۶) نے کہا ہے:

ماچو روحانی شدہ اوصاف او در چشمِ ما
ہمچو سیمین غبضت قوم فرزدق می نمود

روحانی کے متعلق ایک مختصر مضمون اورینٹل کالج میگزین اگست ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا ہے۔

۸۸۔ مخطوطہ انڈیا آفس۔ق ۷۵(ب) تا ۷۶(الف)

۸۹۔ مخطوطہ ایضاً۔ق ۱۱۹(ب) تا ۱۲۰(الف) اسی زمانہ میں یہ قصیدہ بھی کہا ہوگا۔ جس میں بہرام شاہ کے (تین) لڑکے بھی مذکور ہیں:

ای دورِ عدلِ تو سببِ دورِ آسمان
وی ہیچ دیدہ چون تو نہ دیدہ خدایگان
ہم نام تو ز ہمتِ نامِ تو بر فلک
سرسبز و سرخ روی چو سرو و چو ارغوان
تو سایۂ خدائی و تار روز حشر باد
در سایۂ ہمای سریر ترا مکان

چون ذرّہ اندلشکرِ منصور بی عدو
تو ہمچو آفتاب بہ حجت جہان ستان
تو آفتاب وش پسرانت چو اختران
تا حشر باد مہ ہمہ را در شرف قران
ہم چشمِ اختراں شدہ روشن بہ آفتاب
ہم روی آفتاب مبارک بہ اختران

۹۰۔ ایضاً۔ ق ۷۰ (الف) تا (ب)

۹۱۔ ایضاً ۔ ق ۱۰۴ (الف) تا (ب)

سنائی نے بھی بہرام شاہ کے شیر کے شکار کا اشارہ کیا ہے (حدیقہ ص ۷۳۳ بمبئی)

شہ چو شد بر شکار شیران چیر
شیرِ گردون شود ز شیری سیر

بہرام نے اپنے بھائی ارسلان (بمعنی شیر) کو بھی زک پہنچائی تھی۔

۹۲۔ مخطوطہ انڈیا آفس۔ ق ۸۲ (ب)

۹۳۔ ایضاً۔ ق ۸۰ (الف) تا (ب) عمادی کا قصیدہ مونس الاحرار (صفحہ ۶۹۴ حبیب گنج میں ملتا ہے اس پر بحث آگے آئے گی۔ وہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

ای بر سخن از مشک بعمدا زدہ خالی
مسکین دلِ من گشت زخال تو بحالی
حالی بہ جہان زار تر از حال دلم نیست
تا نیست دل آشوب تر از حالِ تو خالی

۹۴۔ مخطوطہ انڈیا آفس۔ ق ۸۳۔ ب

۹۵۔ ایضاً ۔ ق ۸۱ (الف) تا (ب) مذکورہ بالا قصیدے کے بارہویں شعر میں ایک "کوشک" کا ذکر ہے۔ معلوم نہیں وہ کونسا تھا۔ طبقات ناصری راورٹی ص ۲۲۴ میں

افغانستان کے (۱) کوشک ناخود اور (۲) کوشک سپید مذکور ہیں۔ ہرات کے پاس بھی ایک کوشک ہے اس قصیدے کا بیسواں شعر اور آگے والے قطعہ کا سترہواں شعر بہت ملتا جلتا ہے۔

۹۶۔ مخطوطہ ایضاً۔ ق ۱۱۲ (ب) ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ یہ اشعار شوال ۵۴۱ھ کے متعلق ارشارہ کرتے ہیں جبکہ ابو علی حسن ابن احمد کو وزارت ملی ہوگی۔ تیسرے شعر میں دوم شوال بھی ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے کہ وہی تاریخ (یعنی جمعہ ۷ مارچ ۱۱۴۷ء) اس تقرر کی ہوگی۔ کیونکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ شاعر اس وزیر کے تقرر کے وقت فوراً قصیدہ لکھتا ہے اس کا ایک شعر یہاں پھر نقل کیا جاتا ہے:

ازان بہ مدح تو کردم معاجلت کہ مگس
بہ سوی شہد کشاید زبان بہ شکر اوّل

۹۷۔ ایضاً۔ ق ۱۳۱ (الف) تا (ب) اس مرثیہ میں منتخب الملک کے بجائے شرف الملک شاید اس لئے کہ متوفی سلاطین (اور شاید امرا بھی) خاص خاص ناموں سے یاد کئے جاتے ملاحظہ ہو اورینٹل کالج میگزین مئی ۳۸ء

۹۸۔ ایضاً۔ ق ۳۳ (الف) تا (ب)

۹۹۔ ایضاً۔ ق ۲۸۔ ب

لباب الالباب (۲: ۴۱۵) میں ایک اور نجیب الدین لیکن وہ الاجل معز الاسلام نجیب الدین ابو بکر الترمذی الخطاط ہی لکھا ہے کہ ...... خط او چون در نشور و شعر او چون عقدۂ منظوم گوئی کہ سید حسن ازین دو بیت خط او راخواستہ است۔

ہر خط کہ او نویسد شیرین ازان بود
کان ہست صورت سخنان چو شکرش ......

۱۰۰۔ مخطوطۂ ایضاً۔ ق ۳۶ (الف) اسی کے آگے ایک بند ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حسین کا باپ زندہ تھا:

آن که باشد همه به رای پدر
جان نه خواهد مگر برای پدر
پای تا برسرِ زمانه نهد
تاج سر کرده خاکِ پای پدر

روحانی کا طویل ''سوگند نامہ'' جو ہم تاریخ بہرام شاہی میں نقل کر چکے ہیں۔ وہ بھی اسی حسین ابن حسن کی مدح میں ہے۔

۱۰۱۔ ایضاً۔ ق ۳۷ (ب) تا ۳۸ (الف)

۱۰۲۔ اسی ترجیع بند میں حسین کو تاج الدین بھی کہا ہے:

ای تاجِ دین سزد که حریمت حرم شود
دشمن چو شد مسخرِ تو دوست هم شود

اور آگے چل کر ''خلعت'' ملنے پر تہنیت پیش کی ہے

اے صدرِ ملک خلعتِ شاہت خجستہ باد
بر دامنِ تو دامنِ اقبال بستہ باد

۱۰۳۔ ایک اور ترجیع بند ملتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حسین (ق ۱۱۷۔ الف) باختر (بلخ) کی طرف کسی جنگ میں فاتح ہو کر آیا تھا:

باز گشته ز باخترِ منصور
بس نکو نام پیشِ شاه شده

۱۰۴۔ اسی سے ملتا جلتا قصہ مولانا روم کے والد کے متعلق بھی ہے۔

۱۰۵۔ مونس الاحرار (ص ۶۰۵) میں لکھا ہے کہ شاعر نے اس قصیدے کا نام ''تسقیر الضمیر'' رکھا تھا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ''صفیر الضمیر'' بہتر قرات ہے 'تذکرۂ دولت شاہ (۷۸۔ براؤن) میں خاقانی کا بھی ایک قصیدہ صفیر الضمیر کے نام سے موسوم بتایا گیا ہے۔ کلیلہ ودمنہ (مترجمہ نصر اللہ بن محمد بن عبدالحمید در ۵۳۹ھ۔ چاپ (میر نظام

ص۔ ۱۱۲) میں سید حسن کا یہ شعر ہے:

خون در تنم چو نافہ ز اندیشہ خشک شد
جرمم ہمیں کہ ہم نفسِ مشک اذفرم

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر نے ۵۳۹ھ سے پہلے یہ قصیدہ (یا اس کے کچھ اشعار) لکھ لیا ہوگا۔

۱۰۶۔ اس زمانہ میں حج کے راستوں کی تکلیفیں کیا کچھ نہ ہوں گی۔ جبکہ اس زمانہ میں کم نہیں ہیں سنائی نے اپنے دیوان (ص ۱۰۱، ۱۰۲ بمبئی) میں ایک حاجی کی سخت تکلیفوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کا نام احمد عارف لکھا ہے جو راستے سے واپس آ گیا ہے۔ ایک احمد یعنی مجد الدین نسفی (معارف مارچ ۴۶ء۔ ص ۱۸۶) ۵۵۲ھ میں حج سے واپسی پر ستر سے زیادہ ساتھیوں کے ساتھ قتل ہوئے۔

۱۰۷۔ خیال ہوتا ہے کہ عربی کا یہ مرجع (تضمینی شعر) مولانا روم نے سنائی کا سمجھ لیا ہے اس کے دوسرے مصرع کو وہ اس طرح لکھتے ہیں (کلیات شمس تبریز۔ ص ۶۳۶۔ طبع لکھنو ۱۳۰۲ھ)

ای سنائی رو مدد خواہ از روانِ مصطفا
مصطفیٰ ما جاء الّا رحمۃ للعالمین

۱۰۸۔ انڈیا آفس اور برٹش میوزیم والے دیوان اسی ترجیع بند سے شروع ہوتے ہیں۔ مونس الاحرار طبقات ناصری۔ جلد اول (مرتبہ عبدالحی حسینی۔ پنجاب یونیورسٹی ۱۳۲۸ ش) صفحہ ۷۹۔ ۸۰ میں یہ شعر ہیں:

سلم کالطاف الا لا الممجد
سلام کاصداق النبی المؤید
علی من تلقی عزہ ای غرہ
علی من ترقی مصعداً ای مصعد

(ص ۵۴۔ ۵۷ حبیب گنج) وغیرہ متعدد نسخوں میں یہ ترجیع بند منقول ہے۔

۱۰۹۔ حبیب گنج والے نسخے میں اوراق کے نمبر نہیں ہیں۔ اس لئے ویسا حوالہ نہیں دیا گیا۔ پروفیسر براؤن نے اس تاریخ کے باب پنجم میں سے شعرا کے تذکرے کا انگریزی ترجمہ "رائل ایشیاٹک سوسائٹی جنرل" میں شائع کیا تھا۔ سید حسن کا یہ تذکرہ اکتوبر ۱۹۰۰ء کے نمبر میں صفحہ ۷۴۸ پر ہے۔

۱۱۰۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمہ (۵۶۱ھ۔۱۱۶۶ء) کے متعلق بھی مناقب تاج الاولیا وغیرہ میں لکھا ہے کہ انھوں نے بھی دو شعر مزار اقدس پر پڑھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دست مبارک نکلا جس کو انہوں نے بوسہ دیا۔ وہ شعر یہ ہیں۔

یا رسول اللہ انظر حالنا
یا حبیب اللہ اسمع قالنا
اننی فی بحر ھم مغرق
خذ یدی سھل لنا اشکالنا

۱۱۱۔ تیسرے شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر کو پتہ چل گیا تھا کہ علاءالدین "جہان سوز" کے حملہ کی وجہ سے بہرام شاہ کبھی کا ہندوستان کو بھاگ چکا ہے۔ اس لئے کہا ہے:

آیم بہ بوم ہند و بیارم ثنای شاہ

میرے اس خیال کی تائید آگے ہو جاتی ہے اس کے لئے اگلا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

۱۱۲۔ شاعر کو یہ واقعہ معلوم ہوگا جبھی تو اس نے یہ قطعہ لکھا ہوگا

گفتم کہ من بہ میرم نہ بینم کہ بر شود
بر تختِ آلِ ناصرِ دین دیو غوری
من ہم کنم چون عنبر بو الفتح زیرِ خاک
بے روی شوم او سوری فرخندہ سوری
عمرم دراز گشت جز از اہل نور
دیدہ کناں نہ دیدم ازین گو نہ کوری

یہ قرات برٹش میوزیم کے نسخے کی ہے اور انڈیا آفس کے نسخے (ق ۱۴۰ب) میں آخر کے دو

شعر اس طرح ہیں:

(من؟) ہم کنم عبیر بو الفتح زیر خاک
بی روی شوم سوری فرخندہ سوری (سوری؟)
عمرم دراز گشت چرا تا ز اہل غور
دیدہ کنان نہ دیدم ازین گونہ کوری (کوری؟)

ان اشعار کی اصلاح کے لئے میں نے ملک کے متعدد اکابرین کو لکھا لیکن کہیں سے مدد نہ مل سکی۔ بہر حال دوسرے شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ سوری کے عہد یعنی ۵۴۵ھ کے اواخر میں جب علاالدین "جہان سوز" غوری نے غزنین کو تباہ کیا تھا اور اپنے بھتیجے غیاث الدین ابو الفتح اور شہاب الدین ابو المظفر کے سپرد غزنین کر دیا تھا اس وقت کا زمانہ یاد کیا جا رہا ہے۔

۱۱۳۔ اوپر کے دونوں ترجیع بند، ہمدان ہی میں کہے ہوں گے کیونکہ وہیں ملک شاہ بن محمود تخت نشین ہوا تھا۔ برٹش میوزیم کے مخطوطہ ۴۵۱۴ کے مقدمہ نگار تقی الدین محمد حسینی کاشی نے مقدمے میں لکھا ہے:

"...... بعد از توفیقِ حج و زیارت (سید حسن)...... بدار السلام بغداد روی نمود و مدتی در آن نواحی بواسطہ ء تعلقی کہ او را بہ تیر گر پسری واقع شدہ بود بماند...... چنان کہ مدتہای متمادی...... ابواب مخالطت میان سید و آن شوخ رعنا بنوعی مفتوح بود کہ مشامِ روزگار بوی کلفت و نسیمِ عدمِ میل و الفت بہ ہیچ وجہ از جانبین نمی شنود...... آخر الامر...... یکی از حاسدان چند حرفی بہ سمع آن فتنہ زمان رسانید و آن حریف پرکار را از ترکِ طرزِ اختلاطِ خود بدان عاشق صادق پشیمان گردانید...... سید مشار الیہ راضی بہ ہجران و صابر بہ حرمان گشتہ دل بر فراق نہادہ...... بہ این مضمون زبانِ ترنم کشادہ می گفت۔ رباعی

اے نورِ دو دیدہ ام چہ دیدی از من
کز ناز چو سرو سر کشیدی از من

چون طالع بر گشتہ زمن بر گشتی

چوں بختِ رمیدہ ام رمیدی از من

القصہ سلطان (مسعود بن محمود) در آن وقت سید را در دارالخلافہ دریافت و در اکرام و اعزازِ وی مبالغہ نمود و محفۂ زراندودی ترتیب دادہ سید مشارٌ الیہ را بجانب غزنین فرستاد و آن خواری کہ از معشوق دیدہ بود بہ عزت پادشاہی مبدل شد......" یہ ہیں سید حسن کے عشق کے حالات اگر محال نہیں تو قرین قیاس بھی نہیں ہے کہ تقریباً ستر سال کے بوڑھے کھوسٹ کو عشق چرآیا ہو اور وہ بھی ایسے زمانے میں جبکہ حج سے واپسی پر اس کے تقدس کا سکہ ایسا جما ہوا ہو۔

۱۱۴۔ مخطوطہ انڈیا آفس۔ق ۱۴ (الف) راحت الصدور ص ۱۸۹

۱۱۵۔ مخطوطہ انڈیا آفس۔ق ۱۸۵۔الف۔ب

۱۱۶۔ مخطوطہ انڈیا آفس۔ق ۵۰ (الف)

۱۱۷۔ مخطوطہ انڈیا آفس۔ق ۵۔ب

۱۱۸۔ مخطوطہ رامپور۔ مخطوطہ پیرس۔ق (۔الف۔ب)

۱۱۹۔ مخطوطہ انڈیا آفس۔ق ۱۴۱ (الف) انوری (کلیات ص ۵۹۴۔۵۹۵) کا بھی ایک ممدوح رئیس الدین تھا جس کا انتقال جلد ہو گیا تھا۔

کہ بود جز تو کہ سی سال زندگانی کرد

چو در گذشت بشد ماتمش تمام بشست

۱۲۰۔ یہ قصیدہ ایک دوسرے مطلع کے ساتھ بھی ملتا ہے:

ای رایت آفتاب و محلت بر آسمان

راضی ہمیشہ از تو خداوند خدایگان

ای بر ہزار میر و ملک تاج و افتخار

وی بادویست جد و پدر شاہ پہلوان

این بندہ سوی درگہِ عالی نہاد روی
تا از حوادثِ فلکی باشدش امان
بستہ میان بخدمتِ صدرِ رفیعِ تو
بکشادہ بر مدیح دل آویزِ تو زبان

لیکن اس میں ممدوح کا نام نہیں ہے اس لئے ممکن ہے کہ شاعر نے اتسز والے شعر کو نکال کر دوسرے مطلع اور مزید اشعار کسی دوسرے ممدوح کو پیش کر دیا ہو اور یہ عادت اس میں تھی بھی۔

۱۲۱۔ قاضی یا قاضی کے افسر کو بھی "صدر" کہتے تھے انوری (کلیات ص ۶۲۱) کہتا ہے:

قطعۂ صدر اجلّ قاضی قضاتِ شرق و غرب
آن کہ بر عالم نفاذ او قضای دیگر یست

اور عالم کو بھی اس زمانے میں صدر کہتے تھے۔ مثلاً وطواط نے ایک قصیدہ (مقدمہ حدائق السحر۔ف) میں "صدرالائمۃ" ضیاالدین بلخی کو خطاب کیا ہے۔

صدرا بعزِ تو کہ نہشتم بعمرِ خود
عرضِ کریم را بہوی در کف ہوان

۱۲۲۔ سید حسن کے عہد میں دو اور شخص اسی نام کے ہوئے ہیں۔ الجوہر المضیہ فی طبقات الحنفیہ (مرتبہ قرشی ج ۲۔ ص ۲۹۴) میں زین الدین عبدالجبار احمد ملتے ہیں جو پانچویں صدی میں مازندراں کے مفتی ہوئے ہیں لیکن وہ ہمارے شاعر کے ممدوح نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اس صدی سے ہمارے شاعر کا بہت کم تعلق ہے بلکہ آخری ربع میں تو پیدا ہی ہوتا ہے۔ دوسرے ہیں ابو محمد عبدالجبار بن ابو عبداللہ محمد بن احمد (تاریخ بیہق۔ ص ۲۱۶) جو نیشاپور کے مفتی تھے اور انھوں نے ۵۴۰ھ کے قریب انتقال کیا۔ لیکن چونکہ متن والے عبدالجبار کا وزیر ہونا زیادہ ممکن ہے (جیسا قصیدے سے معلوم ہوتا ہے) اس لئے وہ قصیدہ اسی سے متعلق ہونا زیادہ قرین قیاس ہے۔

۱۲۴۔ راحت الصدور (ص ۲۴۶) میں جو ترجیع بند ہے اس کا تیسرا بند رام پور کے مخطوطہ میں الگ ہے۔ جس سے یہ وہم ہو جاتا ہے کہ وہ سنجر کی وفات پر لکھا گیا ہوگا۔

۱۲۵۔ راحت الصدور ۱۳۰ ح) میں سید حسن کا پہلا مصرع دیا گیا ہے : ساقیا بادہ بدہ تا طرب از سر گیر ند لیکن ہمارے ہر مخطوطے میں متن والا ہی مصرع ملتا ہے۔

۱۲۵۔ یہ اشعار اسی سلسلے کے ساتھ برٹش میوزیم کے نسخے میں ہیں لیکن انڈیا آفس کے نسخے میں عربی کے چار شعر کے بعد فارسی کے چار شعر ہیں۔ پھر عربی کے پانچ شعر کے بعد فارسی کے چھ شعر ہیں۔ یعنی اس میں عربی کا آخر شعر نہیں ہے۔ جامعہ عثمانیہ اور پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب کے نسخے میں عربی کے شروع کے تین شعر ہیں لیکن فارسی کے ۴،۶،۹،۱۰ نہیں ہیں۔ برٹش میوزیم کے نسخے میں دوسرے شعر میں "افرغ القوت" ہے۔ انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کے نسخے میں ساتویں شعر میں "سکرنا" ہے اور دسویں شعر میں "فی حدق الدولۃ بہ" ہے لیکن مخدومی پرنسپل محمد شفیع صاحب نے ان مقامات پر جو قرات بہتر سمجھی تھی وہ متن میں لکھ دی انہوں نے خصوصاً عربی کے چھٹے شعر کی تصحیح بڑی خوبی سے فرمادی ہے وہ شعر بہت زیادہ مسخ ہو گیا تھا پہلے نسخے میں اس طرح تھا۔

مسموت الطرفی بدو بہ ۔ ملارین لدی الالحان

اور برٹش میوزیم کے نسخے میں اس طرح تھا۔ مستمعات الظفری بدو بہ ۔ مسارین الذی الالحان دیگر اشعار کی تصحیح اور اعراب میں قبلہ استاذی پروفیسر ضیاء احمد صاحب مدظلہ نے بڑی مدد فرمائی ہے۔ آٹھویں شعر میں شاید "عجب" بھی ہو سکتا ہے۔

۱۲۶۔ اس قصیدے کی صورت بھی بہت مسخ تھی۔ اس کی بھی قبلہ استاذی پروفیسر ضیاء احمد صاحب بدایونی مدظلہ نے تصحیح فرمادی ہے۔ یہ قرات برٹش میوزیم کے نسخے کے مطابق ہے۔ انڈیا آفس میں آخری مصرع "الی حین منقرض العالم" ہے اور عربی کے چھ شعر کے بعد فارسی کے چھ شعر ہیں۔

۱۲۷۔ لیکن پروفیسر نولدکہ کے مقالہ کا ترجمہ جو ڈاکٹر محمد اقبال صاحب نے کیا ہے اس کی مئی ۱۹۳۰ء (اورینٹل کالج میگزین) کی قسط کے صفحہ ۱۷ کے حاشیہ نمبر ۲ میں یہ عبارت ہے:
"زوالِ خلافت کے بعد مسلمان فرمانروا اکثر تعلیم سے عاری ہوتے تھے۔ لہذا یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ ہمیشہ ان تمام عربی اور فارسی قصیدوں کو سمجھ سکتے تھے۔ جو ان کی شان میں کہے جاتے تھے"۔

۱۲۸۔ تنقید شعر العجم (ص۲۱۶۔۲۱۷) میں اس طلبی کو غلط کہا گیا ہے اور اس کے دو سبب بتائے ہیں۔ اول تو یہ کہ علاءالدین اس سے صاف نہیں تھا۔ دوسرے یہ کہ اگر انوری نے شاعری سے علیحدگی ظاہر کی تو ایسا نہیں ہے کیونکہ وہ علاالدین کے بعد تک شاعری میں مصروف تھا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ قصیدہ صحیح ہو سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ چونکہ علاالدین اس سے صاف نہیں تھا اسی لئے دھوکا دے کر وہ بلانا چاہتا تھا اور انوری نے عارضی طور پر ضرور کچھ دن کے لئے شاعری بند کردی تھی۔ وہ خود (کلیات: ص۷۰۵) کہتا ہے: گرچہ در بستم درِ مدح و غزل یکبارگی۔ ظن مبر کز نظم والفاظ معانی قاصرم۔ یہ اشعار قوام الدین حسن بن ناصر الدین طاہر کے متعلق ہیں جو بقول تاریخ بیہق (ص۷۵) سلیمان شاہ (دریا ایام اسار سنجر) اور محمود خان کا وزیر رہ کر ۵۵۳ھ میں علیحدہ ہو کر بیہق میں سکونت پذیر ہو گیا تھا۔ غرض کہ محض اسباب مذکور کی بنا پر وہ واقعہ غلط نہیں کہا جا سکتا کسی اور سبب سے غلط ہو تو ممکن ہے۔

۱۲۹۔ ایک ممدوح "سعد الدین" ہے جو حج بھی کر آیا ہے اور شام کے کسی مقام میں ہے۔ جہاں شاعر اپنا کلام عراق سے بھیجا کرتا تھا:

قبول بین کہ درین پنج سال سعد الدین
بہ مہر و کین بر من یک غلام نفرستاد
بلند و پست حدیثِ مرا محل نہ نہاد
دروغ و راست بہ من یک پیام نفرستاد

ہزار گوہرِ ناسفتہ ہدیہ می کردم
بہ یک دو رشتہ برای نظام نفرستاد
من آن نیم کہ شکایت کنم معاذ اللہ
کہ سعدِ وقت سعادت تمام نفرستاد
چواز عراق فرستادہ ام دُرِ باقی
چرا بہ من زرِ شامی ز شام نفرستاد
چو کرد حج و زیارت سلیم باشد اگر
بہ سوی آلِ محمدؐ پیام نفرستاد

پہلے شعر میں شاعر نے شکایت کی ہے کہ پانچ سال سے ممدوح نے نظر التفات نہیں کی۔ ممکن ہے کہ یہ وہی شخص ہو جس کے بخل کی بنا پر انوری نے (کلیات ص ۱۴۷) ہجو لکھی تھی۔

۱۳۰۔ محمد بن ابراہیم نے تواریخ سلجوقی (ص ۳۳) میں رشید جامہ دار کو والیِ اصفہان لکھا ہے اور یہ اسے ملک محمد بن ارسلان شاہ کرمانی (المتوفی ۵۵۱ھ) کے آخر عہد میں ضرور حاصل تھا جیسا کہ کتاب مذکور کے (ص ۳۱) میں معلوم ہوتا ہے۔

۱۳۱۔ نزہت القلوب کا خلاصہ G.Le Strange نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی جرنل (اکتوبر ۱۹۰۲ء) میں شائع کیا تھا۔ اس کے صفحہ ۷۵۳ میں یہ اطلاع ملتی ہے۔ صفحہ ۷۵۳ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ صفحہ ۷۴۸ میں ہے کہ فرسخ ایک ''لیگ'' یعنی ایک گھنٹہ کی مسافت طے کرنے کے برابر ہے۔ لیکن مخدومی پرنسپل محمد شفیع صاحب نے ثابت کیا ہے (اورینٹل کالج میگزین ص۔۴۸ بابت اگست ۱۹۳۳ء) کہ وہ چار میل انگریزی کے قریب قریب ہے۔

۱۳۲۔ سنجر کا سال وفات راحت الصدور (ق ۶۷ب) میں ۵۵۱ھ ہے لیکن روضۃ الصفا (جلد ۴۔ ص ۱۱۳) میں ۲۶ ربیع الاول ۵۵۲ھ ہے اگر موخر الذکر تاریخ ہی زیادہ معتبر مان لی جائے تو محمود خان کی حکومت کے ساڑھے پانچ سال شعبان / جولائی ۵۵۷ھ ۱۱۶۲ء میں پورے ہوتے ہیں بلکہ ابن خلدون (ترجمہ ج ۱۴۔ ص ۲۲۶) نے صاف لکھا ہے کہ یہ خان محمود جب

نیشا پور میں داخل ہوا تو مویدّای ابہؔ نے رمضان ۵۵۷ھ تک عزت واحترام سے رکھا۔ اس کے بعد قید کر کے آنکھوں میں نیل کی سلائی پھروادی اور قید ہی میں اس نے انتقال کیا۔

۱۳۳۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم ہلاکو خان کے حملے کے پہلے (یعنی ساتویں صدی ہجری کے وسط میں) شاعر کی لاش جوین سے غزنین آچکی تھی لیکن دولت شاہ جس نے ۸۹۲ میں اپنا تذکرہ لکھا ہے، لکھتا ہے کہ "...... اکنون تر تیب شریف سید حسن در قصبہ آزادوار است ومعروف ...... ممکن ہے کہ دولت شاہ کو دھوکا ہوا ہو اور وہ قصبہ سبز وار کو آزادوار سمجھ بیٹھا ہو کیونکہ تاریخ بیہق (ص ۲۸۶) میں ایک دوسرے سید حسن کے متعلق "...... در میانِ بازار قصبہ سبز وار مشہد سید حسن بن حسین بن عیسی بن زید بن امام حسن بن امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہم السلام است"۔

۱۳۴۔ فرہنگ جہانگیری۔ جلد دوم۔ ص ۲۲۰ میں بھی سید حسن کا ایک مسخ شدہ شعر ملتا ہے:

گر ابروان بدیدی پای تو درکاب
تو بودی پیش شولک نواز دوان دوان

(لیکن یہ شعر ہمارے کسی نسخے میں نہیں ہے)

۱۳۵۔ "مباحثہ چکبست و شرر" والے معرکے میں یہ شعر کافی مشہور تھا۔ استاذی حضرت احسن مارہروی مرحوم نے بھی اپنے گرامی نامے (مورخہ ۲۵ مارچ ۱۹۳۹) میں یہ شعر نقل کیا تھا۔ یوں بھی یہ شعر اہل علم حضرات کے نوک زبان ہے۔

۱۳۶۔ مولانا روم نے (دیوان شمس تبریز۔ ص ۶۳۶۔ مطبوعہ لکھنو ۱۳۰۲ء) لکھا ہے۔

ای سنائی رو مدد خواہ از روانِ مصطفیٰ
مصطفیٰ ما جاء الّا رحمۃ للعالمین

اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ مصرع (شعر) سنائی کا سمجھ لیا ہے۔ لیکن یہ سید حسن ہی کا ہوگا۔ یہ شعر کحل البصر فی ولادت خیر البشر (طبع ہفتم۔ گلزار محمدی پریس۔ لکھنو) میں جگہ جگہ منقول ہے۔ "مولود سیدی" مطبع منشی ظہور الحق بہاری (ص ۷۰) وغیرہ

میں بھی منقول ہے۔

۱۳۷۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ دربار میں مسابقت کی وجہ سے حاسد بہت تھے دولت شاہ نے قطران کے حال میں لکھا ہے کہ وطواط اپنے معاصرین میں صرف قطران کو شاعر سمجھتا تھا۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اوّل تو قطران اس کا ہم عصر نہیں تھا۔ دوسرے یہ کہ وطواط کی حدایق السحر (جو عباس اقبال کی فاضلانہ تصحیح سے شائع ہو چکی ہے) میں قطران کے علاوہ وطواط کے معاصرین کا بھی کلام ملتا ہے تاہم یہ ضرور صحیح ہے کہ اس میں راحت الصدور (تالیف ۵۹۹ھ) والے شعرا نہیں ہیں اور اس نے کہا ہے:

از نظم من بہ خاکِ خراساں خزا نہاست
گر شخص من بہ خاکِ خراسان نمی رسد

(دولت شاہ۔ براؤن صفحہ ۸۹) لیکن حقیقت یہ ہے کہ کم از کم کمال کے عہد تک صرف خراسان ہی فارسی زبان اور شاعری کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا اور باقی علاقوں کی زبان قصباتی شمار کی جاتی ہے۔ اس کے لئے ملاحظہ ہو "تنقید شعر العجم" (ص۔ ۵۲۹) البتہ دولت شاہ نے معزی کے حال میں لکھا ہے کہ خاقانی نے معزی کو تسلیم کیا ہے لیکن وطواط کا منکر ہے اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ چہار مقالہ میں انوری کے ممدوح قاضی حمید الدین کی کتاب مقامات حمیدی کا ذکر ہے لیکن شعرا کی فہرست میں انوری کا ذکر نہیں ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ اس وقت تک مشہور نہ ہوا تھا۔

۱۳۸۔ "دیوان مسعود سعد سلمان" ۱۳۱۸ طہران۔ ص ۶۵، ۶۶ ۔ آصفیہ کے مخطوطہ ۱۲۹۔ ص ۴۴۳ میں دوسرے شعر میں "بیست" اور تیسرے شعر میں "بداشت ہے"

۱۳۹۔ مخطوطہ انڈیا آفس۔ ق ۲۰

۱۴۰۔ عثمان مختاری غزنوی (مجموعہ قصائد فارسی ۲/۴۵۔ ص ۲۰ حبیب گنج) نے بھی ایک قصیدہ ارسلان شاہ بن کرمان شاہ بن قاورد (م ۵۴۷ھ۔ ۱۱۴۲ء) کی مدح میں سفر کے متعلق لکھا تھا جس کے کچھ اشعار یہ ہیں:

رفتم بہ راہِ غزنین بر آب آہنین
خفتم بہ حد کرمان بر آتشیں سراب
لیکن مرا نمود چو داؤد و چون خلیل
آہن بری ز قوت و آتش تہی ز آب
دارای برّ و بحر و نگہبانِ ملک و دین
خورشید تخت و تاج و خداوندِ شیخ و شاب
بوالحارث ارسلان شہ کرمان شہ آن کہ ہست
اورا معز دولت و دین از فلک جناب

لیکن ابوالمعالی رازی (المتوفی ۵۴۱ھ۔ ۱۱۴۶ء ترجمہ اش در تعلیقات حدایق السحر۔ ص ۱۱۸ بعد کے) ایک قصیدہ (لباب ج ۲۔ ص ۲۲۸) میں ضرور سید حسن والی تمہید سے مشابہت ہے اس کا مطلع یہ ہے۔

خروش من ہمہ از چیست از نعیبِ غراب
کہ دور ساخت مرا از دیار واز احباب

۱۴۱۔ بعد میں راقم الحروف نے ثابت کیا ہے کہ عمادی غزنوی اور عمادی شہریاری ایک ہی شاعر ہیں۔ رسالہ معارف اعظم گڑھ فروری ۱۹۵۷ء۔

۱۴۲۔ محترمی پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب کے نسخے میں یہ دو شعر بھی ملتے ہیں:

سنائی را صلتہا بخش تا او ہم چنین مدحی
پرد ازد کہ ہمتا نیست اندر شعر اقرانش
فرو اندیش تا او را کہ قادر خاطری باشد
کہ در معنی و لفظ خوش مسلم کرد عثانش

آخری مصرع سے خیال ہوتا ہے کہ سنائی شاعری میں عثان مختاری کے شاگرد تھے۔ شاید اسی لئے سنائی نے عثان مختاری کی مدح کی ہے (دیوان۔ ص ۳۹۔ ب بانکی پور):

نہ شود پیش دو خورشید و دومہ تاری تیر
کہ برد ذرۂ از خاطر مختاری تیر
مطلع شعر تو چون مطلع شمس ست ولیک
جاہلان راچہ شبِ مظلم و چہ شمس منیر

۱۴۳۔اسی قصیدے میں ادیب صابر کا ایک شعر ہے:

گراین طرز سخن در شاعری مسعود را بودی
بجان صد آفرین کردی روان سعدِ سلمانش

لیکن آصفیہ (حیدر آباد) کے مخطوطہ ۹۳۶ کے صفحہ ۱۵ میں یوں ہے:

بدین حسن و طراوت شعر گر مسعود را بودی
ہزاران آفرین کردی روانِ سعدِ سلمانش

اس شعر سے خیال ہو سکتا ہے کہ جیسا کہ حافظ محمود خان شیرانی صاحب نے بھی (اردو جنوری ۴۳ء۔ ص ۷۳ بعد میں) فرمایا ہے کہ زمین کا موجد مسعود سعد سلمان ہی ہوگا۔ لیکن مجھے کسی مطبوعہ یا قلمی نسخے (مثلاً اورینٹل پبلک لائبریری۔ آصفیہ لائبریری۔ حیدر آباد وغیرہ) میں مسعود سعد سلمان سے منسوب اس زمین کا قصیدہ نہیں ملا۔ اس لئے خیال کرتا ہوں کہ ادیب صابر نے صرف طرز سخن یا "طراوت" کو یاد کیا ہے اس قصیدے میں ادیب صابر کا ممدوح علی ہے اور اسی کے مدح میں اس کا ایک قصیدہ ۳۲ شعروں کا (انتخاب دواوین شعرائے متقدمین نمبر ۳۔ ورق ۴۹۴ب۔ حمیدیہ لائبریری بھوپال میں) ملتا ہے جس میں اس نے معزی اور مسعود کو عزت کی نگاہ سے دیکھا ہے:

بہ مدح تو شعرا را تقدمی نہ نہم
بجز معزی و مسعود سعد سلمان را

روحانی غزنوی نے بھی اپنے سوگندنامے میں یاد کیا ہے:

سزا بود کہ برین شعر آفرین گوید
چراغِ روضۂ مسعود سعد بن سلمان

۱۴۴۔ جامی کا قصیدہ ہے:

معلم کیست عشق و کنجِ خاموشی دبستانش
سبق نادانی و دانا دلم طفلِ سبق خوانش

آصفیہ حیدر آباد کے مخطوطہ نمبر ۱۶۰ "مجموعہ اشعار سی ہزار" کے ص ۳۸ میں جامی کے جواب میں سہیلی کا یہ قصیدہ ملتا ہے:

معلم گر نہ عشق و پیر عقل آمد سبق خوانش
سرِ اندیشہ چینان چیست چون طفلِ دبستانش

اور اسی کے ص ۴۰ میں نظام استر آبادی کا یہ قصیدہ ہے:

معلم کیست پیرِ عقل و دل طفلِ سبق خوانش
سبق وارستگی ویرانۂ عزلت دبستانش

نجم الدین نسفی (۵۳۷-۱۱۴۲ء) نے بھی اسی زمین میں قصیدہ لکھا تھا۔ (معارف اپریل ۱۹۴۶ء۔ ص ۲۶۹) آصفیہ کے مجموعہ قصائد نمبر ۲۰۷ کے ق ۴۸ میں میرزا جلال اسیر کا یہ قصیدہ ہے:

کشد موہر تن نخجر تیر از شوق پیکانش
دود چون خون در اعضا لذّتِ بیداد مژگانش

دوسری بحر میں متعدد شعرا نے کہا ہے مثلاً ظہیر فاریابی:

زخوابِ خوش چو بر انگیخت عزم میدانش
مہ دو ہفتہ پدید آمد از گریبانش
زہی بنا کہ بہ کیوان رسید ایوانش
شکوہ ہشت بہشت است چار ارکانش
صباحِ عید مگر بود میلِ میدانش
کہ مہ زغالیہ بردوش داشت چوگانش

زہی بتانِ مغان شیوہ داد خواہانش
زد ستہای حنا بستہ گل بہ دامانش

۱۴۵۔ مونس الاحرار (ص ۹۲۲ بعد حبیب گنج) میں شمس الدین طبسی کا بھی ایک قصیدہ ۲۴ شعر کا ملتا ہے:

زہی کہ یافت ز آبِ رخ تو آب آتش
شدہ بہ پیشِ لبِ تو ز خجلت آب آتش
قوامِ عالم و خورشیدِ دین قوام الدین
کہ ضوی خنجر او دیدہ شد زخواب آتش

اگر صرف بحر اور ردیف والا کلام (جس میں قافیہ مختلف ہو) دیکھنا ہو تو ایسی تقلید کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیں۔ مسعود سعد سلمان (دیوان۔ ص ۴۹۳ طہران ۱۳۱۸) نے اپنے وطن لاہور کی یاد میں کہا تھا:

ای لاوہور ویحک بی من چگونۂ
بی آفتاب روشن روشن چگونۂ
ای آن کہ باغِ طبع من آراستہ ترا
بی لالہ و بنفشہ و سوسن چگونۂ
تو مرغزار بودی و من شیرِ مرغزار
با من چگونہ بودی و بی من چگونۂ
ناگہ عزیز فرزند از تو جدا شدہ ست
با درد او بہ نوحہ و شیون چگونۂ

سید حسن اپنے معشوق کی یاد میں پردرد لہجے میں کہتا ہے:

ای آرزوے دیدۂ بینا چگونۂ
وی یار و مونس دل تنہا چگونۂ

از ناز و نازکی اگر این جانیامدی
بامن یکی بگوی کہ آن جا چگونۂ
از وصل تو کہ نیست دریغا در آتشم
در ہجر من کہ ہست (و) مبادا چگونۂ
ای نورِ چشم مہر و گلِ بوستانِ حسن
ما بی تو در غمیم تو بی ما چگونۂ

لیکن بیٹے کا ماتم زیادہ دردناک لہجے میں فیضی کی زبان سے سنئے جس میں مسعود سعد سلمان کا قافیہ بھی ملتا ہے۔

ای روشنیِ دیدۂ روشن چگونۂ
من بی تو تیرہ روز تو بی من چگونۂ
ماتم سراست خانۂ دل در فراقِ تو
تو زیرِ خاک ساختہ مسکن چگونۂ
بر خار و خس کہ بستر و بالینِ خوابِ تست
ای یاسمین عذار سمن تن چگونۂ

نظیری نے بھی ایک بند میں یہی ردیف اختیار کی ہے۔اس کا مطلع یہ ہے:

ای شاہِ مصر دور ز کنعان چگونۂ
ای یوسف از جدائی اخوان چگونۂ

غالب کو ایک مصرع میں سید حسن سے توارد ہو گیا:

ای رہ نوردِ عالمِ بالا چگونۂ
ما بی تو در ہمیم تو بے ما چگونۂ
از سایہ در غم تو سیہ پوش شد ہما
ای خفتہ در نشیمنِ عنقا چگونۂ

زان پس کہ با تو آب و ہوای جہان نہ ساخت

در روضۂ جنان بہ تماشا چگونۂ

۱۴۶۔ لباب الالباب (ج ا۔ ص ۸۶۔۹۱) میں کمالی بخارائی کا بھی ایک قصیدہ ملتا ہے جو اگر سید حسن کے بعد نہیں تو اسی کے عہد میں لکھا گیا ہوگا۔ کیونکہ لباب (ج ۔ ص ۹۰) میں ہے کہ کمالی سنجر کا ایک ندیم تھا۔

زلفِ نگار گفت کہ از قیر چنبرم

شب صورت و شبہ صفت و مشک پیکرم

ترکیبم از شب است و ز روز ست مرکبم

بالینم از گلست و ز لالہ است بسترم

یا درمیانِ ماہ بود سال و مہ تنم

یا بر کران روز بود روز و شب سرم

جنبان تراز ہوائیم و لرزان ترم ز آب

تیرہ ترم ز خاک و ہمیشہ بر آذرم

لیکن یہ قصیدہ زلف کی زبان سے ہے اسی لئے دولت شاہ کا دعوی صحیح ہو سکتا ہے کہ سید حسن ہی نے (ذاتی) فخر والے قصیدے کی ابتدا کی۔

۱۴۷۔ یہ شعر مطبوعہ کلیات کمال (ص ۸۹ بمبئی) میں اس طرح ہے:

تنم زبیست ارچہ فزوں نیست می شود

گردونِ پیر از بن سی و دو چاکرم

۱۴۸۔ بیاض اشعار و نثر فارسی (۱۴ حمیدیہ۔ بھوپال) میں آذری کے قصیدے میں ۴۷ شعر ہیں۔

۱۵۵۔ خواجہ کرمانی کا بھی ایک قصیدہ فخریہ ہے جو اس طرح شروع ہوتا ہے (اورینٹل کالج میگزین۔ فروری ۱۱۴۵۔ ص ۱۴۶):

سطر یست ہر دو کون ز اوراقِ دفترم

حرفیست کاف و نون ز حرف محرّرم

عرفی نے بھی قصیدہ فخریہ اسی طرح شروع کیا ہے:

من کیستم آن سالک کونین مسیرم

کز بختہ جوہر قدس ست مسیرم

عراقی (۶۸۸ھ۔۱۲۹۰ء) نے بھی مدینہ منورہ پہنچ کر (تذکرہ میخانہ عبدالنبی۔ ۶۹) ایک قصیدہ لکھا تھا جس کا مطلع یہ ہے:

شہبازم و چو صیدِ جہان نیست در خورم

ناگہ بود کہ از کفِ لیاّم بر پرم

۱۵۰۔ ادیب صابر کا "سوگند نامہ" (مجموعہ قصائد فارسی۔ ص۱۴۸ حبیب گنج) جس طرح شروع ہوتا ہے:

دلم بہ مہرا سیر است و تن بہ عشق فدای

ہمی بہ گوش من آیدز لفظ عشق ندای

سیدہ بنت ناصر نے وطواط کا جواب (مجموعہ قصائد فارسی۔ ص۴۰۔۴۲ حبیب گنج) لکھا تھا:

زہی بقای تو در نامۂ ابد مسطور

زہی ثنای تو از خامۂ ازل مذکور

۱۵۱۔ سید حسن کے ایک قصیدے میں ایک شعر یہ ہے:

صدرِ جہانیان حسنِ احمد حسین

کش دست و دل بجود سوی بحر و کان فتاد

اس شعر کے دوسرے مصرع کے الفاظ کا توارد انوری کے مشہور قصیدہ کے مطلع میں دیکھئے:

گردل و دست بحر و کان باشد

دل و دستِ خدایگان باشد

اسی طرح سید حسن کا مطلع ہے:

طلوعِ خسروِ سیارگان بہ برجِ حمل
خجستہ باد ابر خواجۂ عمید اجل

اورانوری نے کہا ہے:

جرم خورشید چو از حوت در آید بہ حمل
اشہبِ روز کند ادہمِ شب را ارجل

۱۵۲۔ مجموعہ قلمی ۲۵، ۵۳، ۱۳۱۔ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد۔

خالد بن ربیع نے (لباب ۲۔ ۱۴۳) بھی کہا ہے:

دوستا بر دلم نہ تاوانی
کہ نکو تر ز ماہ تابانی

۱۵۳۔ دیوان جمال الدین (ص ۱۳۷، ۱۴۴، ۱۴۱) مطبوعہ تہران

۱۵۴۔ سید حسن کا ایک قصیدہ ہے:

زہی رونق ملک از سر گرفتہ
بہ یک تاختن ہفت کشور گرفتہ

۱۵۴۔ اس سے پہلے مصرع کے الفاظ پر غور فرما کر جمال الدین کا صرف مطلع پڑھ لیجئے:

زہی ملک و دین از تو رونق گرفتہ
ز تیغت جہان ملت حق گرفتہ

گو کہ اس میں قافیہ مختلف ہے لیکن پہلے مصرع کے الفاظ میں کچھ توارد معلوم ہوتا ہے۔ اور چونکہ جمال الدین نے کئی جگہ سید حسن کی تقلید کی ہے اس لئے خیال ہوتا ہے کہ بعض زمینیں گو کہ مختلف قافیہ کے ساتھ ہیں وہ سید حسن کے کلام کے پیش نظر ہونے کی وجہ سے اختیار کی گئی ہوں گی۔ مثلاً سید حسن شروع کرتا ہے:

رخش برمہ گلستان می نماید

بر آتش آبِ حیوان می نماید

اور جمال الدین کہتا ہے:

بہار امسال خوش تر می نماید

کہ از صد گو نہ زیور می نماید

سید حسن کا ایک قصیدہ ہے:

طلوع خسرو سیارگان ز برج حمل

خجستہ باد ابر خواجۂ عمید اجل

یگانہ منتخب ملک شاہ و تاج خواص

کہ برگزید ز خلقش خدائے عزو جل

اور جمال الدین کا ایک قصیدہ ہے:

ہزار منت و شکر از خدائے عزو جل

کہ سوی صدر خر امید باز صدر اجل

عقد العلی للوقف الاعلی (ص۔۴۸) میں بھی گرفتہ والی زمین میں ایک قصیدہ ملتا ہے:

۱۵۵۔ راحت الصدور (ص ۳۱۳) کے حاشیے پر سید حسن کا پہلا مصرع یہ ہے:

ع ساقیا بادہ بدہ تا طرب از سر گیرند

لیکن ہمارے پاس سید حسن کے جتنے نسخے ہیں ان میں یہی متن والا مطلع ہے۔

۱۵۶۔ یہ تو یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ رضی نیشاپوری (التوفی ۵۹۸ھ۔۱۲۰۲ء) نے بھی سید حسن کی تقلید کی ہے۔ تاہم اس کی ردیف اور بحر میں ضرور ایک قصیدہ شمس الدین محمد بن قیس کی المعجم (ص ۴۴۲) میں ملتا ہے۔ سید حسن کا قصیدہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

فسانہ گشت بہ یک بارہ داستانِ کرم

بریدہ شد پیِ حاجت ز آستانِ کرم

اور رضی کے قصیدہ کا مطلع یہ ہے:

کجاست نوبتِ احسان و روزگارِ کرم
چه وقت می شگفد بار نو بهارِ کرم

اسی طرح سید حسن کا ایک قصیدہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

یارب چه سوز بود که اندر جهان فتاد
سود حسود صدر جهان را زیان فتاد

اور مولف راحت الصدور (۳۵۳) کے ایک ترکیب بند کا ایک بند اس طرح شروع ہوتا ہے:

آه این چه محنت است که اندر جهان فتاد
آه این چه واقعه ست که ازناگهان فتاد

۱۵۷۔ علی گڑھ کے مخطوطہ میں یہ مصرع اس طرح ہے:

؎ گفتم بگوی هرچه توان یافت زینهار

لباب (ج ا۔ ص ۱۸۱) میں مجد الدین بن عدنان کا ایک قطعہ بھی اسی وزن پر ہے اس کا مطلع یہ ہے:

گر بنگرد به من نظرِ لطفِ شاهِ شرق
من جمله ساحران را درلعب بشکنم

اور سعد الدین اسعد بن شہاب کا قصیدہ (لباب ا۔۱۹۱) بھی اسی وزن میں ہے:

دل در برم زغصه بجان آمد از تنم
و ز دست تن بجان نخرد بازیک تنم

۱۵۸۔ المعجم فی معاییر اشعار العجم (ص ۳۰۱) میں بھی اس کا حوالہ ہے۔ لباب (ج ا۔ ص ۱۶۳) میں مختلف قوافی میں مجد الدین بن رشید کا ایک قطعہ ملتا ہے:

آن آصفِ دوم کنفِ خلق، عینِ ملک
کزوی محیط غرقهٔ تشویر می رود

اور اسی (لباب ا۔ ۱۳۰) میں دوسری بحر میں لیکن اسی ردیف کے ساتھ فخر الدین مبارک شاہ کا بھی ایک قطعہ ملتا ہے جو کسی قصیدے میں سے ہوگا۔

۱۵۹۔ عبد الغنی صاحب نے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۴۹ پر لکھا ہے کہ بہرام شاہ ۵۱۱ھ میں تخت نشین ہوا لیکن یہ غلط ہے۔ ہم تاریخ بہرام شاہی میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں کہ وہ ۵۱۰ھ میں غزنین میں داخل ہوا اور سنجر کی موجودگی میں تخت نشین ہوا۔ عبد الغنی صاحب نے اسی صفحہ پر ملک ارسلان کو بہرام شاہ کا عم زاد لکھا ہے لیکن یہ بھی غلط ہے۔ یہ دونوں بھائی تھے۔ اور مسعود سوم کے بیٹے تھے۔ عثمان مختاری نے (دیوان۔ ق ۷ ب۔ بانکی پور) کہا ہے:

ابر الملوک ملک ارسلان بن مسعود

طرازِ ملک جہان بادشاہِ ملک طراز

اور سنائی نے (حدیقہ۔ ص ۶۲۵۔ لکھنو) بہرام شاہ کے متعلق کہا ہے:

شاہ بہرام بن مسعود

کہ بنا زد بہ عدل او محمود

اس کے متعلق تفصیل تاریخ بہرام شاہی میں دیکھیں۔

۱۶۰۔ سنائی کا سال وفات اس زمانے میں بھی پروفیسر صاحب کا (ص ۲۶۲) ۵۴۷ھ لکھنا تعجب خیز ہے۔ ڈاکٹر ایتھے نے بوڈلین لائبریری کے فارسی مخطوطات کی فہرست (ص ۴۶۳) میں ثابت کردکھایا ہے کہ سنائی نے ۵۴۵ھ میں انتقال کیا اور اب ہر جگہ سنائی کے لئے بھی یہی سال ارجح سمجھ کر لکھا جاتا ہے۔ ہم نے معارف (ستمبر ۱۹۴۲ء ۔ ص ۱۹۴۔ ۲۰۰) میں حبیب گنج کے ایک نسخے سے ایک مزید ماخذ پر روشنی ڈالی ہے۔ بعد میں ابھی ڈاکٹر ہادی حسن صاحب کی کتاب "فلکی شروانی" (ص ۹۵) نظر سے گذری۔ اس میں بھی اس ماخذ پر بحث نظر آئی۔ لیکن اس میں سلسلے کے شعر نہیں ہیں۔ اس لئے ہمارا مضمون بھی ضروری ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ۵۴۴ھ کے بھی پہلے سنائی کا سال وفات ارجح قرار دیا ہے۔

۱۶۱۔ لیکن پروفیسر عبد الغنی صاحب نے اپنی کتاب The Pre Mughal Persian in

Hindusten(۱۰۴-۱۰۸ ح) میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ اشعار عباس ہی کے ہوں گے۔

۱۶۲۔ دقیقی کے قصائد کے بعض اشعار لباب (ج ۲۔ ص ۱۱، ۱۲) میں ہیں۔ تاریخ بیہقی بھی اس کے لئے دیکھیں۔ لباب (بحوالہ ایضاً) ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ دقیقی طوس کا باشندہ تھا لیکن پروفیسر نولدکہ (اورینٹل کالج میگزین فروری ۱۹۳۶۔ ص ۳) کو اس کے متعلق شک ہے .تعلیقات حدائق السحر (ص ۱۴، ۱۵) میں دقیقی کا ایک قصیدہ مختلف کتابوں سے متفرق اشعار کو جمع کر کے مرتب کیا گیا ہے۔ اس کی عاشقانہ تمہید اتنی دلکش ہے کہ آل سامان تو کیا آل سبکتگین کے عہد میں بھی بمشکل اس کی نظیر مل سکے گی۔ وہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

پری چہرہ بتِ عیار و دلبر
نگاری سرو قد و ماہ منظر
سیہ چشمی کہ تا رویش نہ بینم
سر شکم خونِ شد ست و بر مشجر

۱۶۳۔ دیوان ابوالفرج رونی (چاکینیا) ص ۱۴، ۱۵۔

۱۶۴۔ عربی کی تقلید میں خیالات کا تسلسل اس وقت کی شاعری کی ہر صنف میں عموماً موجود ہے۔ حقیقت نگاری زیادہ ہے۔ لیکن معشوق صنف قوی سے تعلق رکھتا ہے۔ تاہم شیرانی صاحب نے (ص ۳۳) ثابت کیا ہے کہ رودکی کا معشوق شعرائے قدیم و جدید کے برخلاف ہمیشہ صنف نازک سے تعلق رکھتا ہے۔ رودکی کے سلسلے میں یہ بھی کہنا مناسب ہے کہ فضلی صاحب نے (اردو۔ ایضاً۔ ص ۳۸۶) مولانا شبلی کی طرح رودکی کی ایک غزل یہ بھی نقل کی ہے۔ ؎ ای جان من از آرزوی روی تو تیر مان۔ لیکن شیرانی صاحب نے (ص ۱۷۔ ۳۵) ثابت کیا ہے کہ یہ اور اس کی طرح کا اور کلام بھی جو رودکی سے منسوب ہے وہ دراصل حکیم قطران کا ہے۔

۱۶۵۔ ہندی اثر سے مسعود سعد نے جو غزلیات شہوریہ' اسبوعیہ اور ایامیہ (در مدح ملک

ارسلان) لکھی تھیں اس کے متعلق تفصیل (اورینٹل کالج میگزین ۔ مئی ۳۸ء۔ ص ۶۷۔ اگست ۳۴) پنجاب میں اردو (ص ۳۹) میں دیکھیں۔

۱۶۶۔ لیکن پروفیسر نولدکہ (اورینٹل کالج میگزین۔ فروری ۱۹۳۰ء۔ ص ۱۴ح) نے عوفی کے اس قول پر کہ ابوشکور نے وہ مثنوی (پوری) لکھی تھی۔ یقین نہیں کیا۔

۱۶۷۔ اس کا تذکرہ ڈاکٹر صاحب نے اورینٹل کالج میگزین (اگست ۱۹۴۱ء) میں بھی کیا ہے۔ رباعی کے متعلق مزید بحث کے لئے مولانا سید سلیمان ندوی کی کتاب خیام' شیرانی صاحب کا ضمیمہ (تنقید شعر العجم) اور جناب اطہر ہاپوڑی کا مضمون "اردو" (اپریل ۱۹۴۵ء) میں ملاحظہ فرمائیں۔

۱۶۸۔ تشبیہات اور حسن تعلیل کا ایک اور مجموعہ اس "دوبیتی" میں دیکھئے:

از رنگِ لبِ تو لالہ پرتاب شدہ ست
نرگس ز پیِ چشم تو بی خواب شدہ ست
از رشک خطت بنفشہ در تاب شدہ ست
و ز آتشِ رخسار تو گل آب شدہ ست

اشاریہ

مرتبہ: پروفیسر لطیف اللہ

(اس اشاریے میں سب سے پہلے حضورپُر نور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم پاک تحریر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد حروف تہجی کے اعتبار سے انبیا علیہم السلام کے اسمائے گرامی کی ترتیب ہے، پھر حروف تہجی کے مطابق دیگر رجال کے نام ہیں۔)

محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔ حضور پُر نور، رسول اکرم۔ سرکار دو عالم۔ رحمتہ للعالمین۔ صدر الانبیا۔ سید اصفیا۔ نبی الانبیا۔ ساقی کوثر۔ پیغمبرؐ۔ مجتبےٰ علیہ الصلوٰۃ و التسلیم۔ ۷۔ ۱۰۔ ۱۲۔ ۱۵۔ ۳۸۔ ۵۴۔ ۱۲۴۔ ۱۲۵۔ ۱۲۶۔ ۱۲۷۔ ۱۲۸۔ ۱۴۰۔ ۱۶۰۔ ۱۸۰۔ ۲۰۸۔ ۲۰۹۔ ۲۱۰۔ ۲۵۹۔ ۲۶۰۔ ۲۶۱۔ ۳۲۱۔ ۳۲۲۔ ۳۲۹۔

آدم (علیہ السلام) ابوالبشر ۳۱۔ ۶۲۔ ۱۰۲۔ ۱۱۲۔ ۲۴۰

ابراہیم خلیل اللہ (علیہ۔السلام) حضرت ۷۳۔ ۷۴۔ ۱۱۸۔ ۱۲۳۔

ادریس (علیہ السلام) حضرت ۱۰۱۔

خلیل (علیہ السلام)۔ ملاحظہ فرمائیں ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام

داؤد (علیہ السلام)، حضرت ۱۰۱۔ ۱۵۰۔

سلیمان (علیہ السلام) حضرت ۸۳۔ ۹۵۔ ۹۹۔ ۱۰۱۔ ۱۰۲۔ ۱۵۰۔ ۱۹۴۔ ۲۵۷۔

عیسیٰ علیہ السلام، حضرت۔ مسیح ۴۳۔ ۶۲۔ ۸۴۔ ۸۶۔ ۱۰۱۔ ۱۰۳۔ ۱۰۶۔ ۱۰۸۔ ۱۰۹۔ ۱۲۲۔ ۱۲۹۔ ۱۳۷۔ ۱۴۶۔ ۱۴۷۔ ۱۹۲۔ ۲۵۴۔

موسیٰ (علیہ السلام) حضرت، کلیم اللہ۔ ۳۶۔ ۶۲۔ ۱۰۱۔ ۲۰۶۔ ۲۵۸۔

یوسف (علیہ السلام) ۳۱۔ ۱۰۳۔ ۲۰۰۔ ۲۴۰۔ ۲۵۸۔ ۲۸۵۔

(ا)

آذری، شیخ۔ ۲۱۔ ۲۰۷۔ ۲۰۸۔ ۲۲۶۔

آزاد بلگرامی۔ غلام علی آزاد، مولانا ۱۲۷

ابراہیم بن حسن ۱۷۷۔ ۱۷۸۔ ۳۰۹

ابراہیم غزنوی، سلطان۔ ۲۲۸

ابن اسفندیار۔ ۶۵

ابن الاثیر۔ ۱۴۵

ابن خلدون۔ ۳۲۸

ابن عثمان۔ ۶۱

ابن الفوطی۔ علامہ۔ ۲۹۹۔ ۳۱۴

ابو بکر بن حیدر کرمانی۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۱۸۱

ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) حضرت۔ ۱۰۱

ابو بکر نجیب الدین الترمذی الخطاط۔ ۳۱۹

ابو جعفر بن احمد بن محمد۔ ۲۳۲

ابوالحسن، برہان الدین علی بن ناصر۔ امام، بریاں گر ۱۹۔ ۶۸۔ ۱۳۶۔ ۱۳۷

ابوالحسن حسین، ملاحظہ فرمائیں ابوالحسن نجیب الدین حسین بن ابو علی حسن نجیب الملک

ابوالحسن شرف الدین ظہیر الملک البیہقی۔ ۵۳۔ ۳۰۸۔ ۳۰۹

ابوالحسن شہید بن الحسین بلخی۔ ۲۷۰

ابوالحسن ظہیر الدین علی بن عثمان بن نظام الملک ۶۵۔

۶۷۔ ۷۴۔ ۱۴۵
ابوالحسن علی ابن عمر (ابن عمران)
ملاحظہ فرمائیں ابوالحسن مجدالدین عمرانی
ابوالحسن کمال الدین بن احمد السمیری۔ ۶۷
ابوالحسن مجدالدین عمرانی ۵۷۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۱۔
۱۴۵۔ ۲۱۲۔ ۲۱۴
ابوالحسن نجیب الدین حسین بن ابوعلی حسن۔ نجیب
الملک ۱۱۲۔ ۱۱۳۔ ۱۱۵۔ ۱۱۶۔ ۱۱۷۔ ۲۱۰
ابوحفص بن احوص۔ ۲۷۰
ابوحلیم، محمد۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۴۰۔ ۳۰۵۔
ابوحنیفہ، امام۔ ۲۱۰
ابورجاغزنوی۔ ۲۹
ابوسالک گورگانی۔ ۲۷۰
ابوسہل علی۔ ۹۶
ابوشجاع ناصرالدین طوطی بن اسحاق، ملک طوطی۔ ۱۶۰
ابوشکور۔ ۲۸۷۔ ۳۴۳
ابوطالب تاج الدین بن دارست شیرازی ۶۸۔ ۷۴۔ ۱۴۵
ابوطالب مجدالدین بن نعمہ بلخی، سید۔ ۵۹
ابوطاہر شرف الدین سعد بن علی قمی۔ (رشیدالدین بھی
لقب تھا) ۴۵۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۷۴۔ ۲۶۱۔ ۳۰۶۔ ۳۰۷
ابوطاہر، عمر بن ابوبکر بن محمد۔ ۳۱۵
ابوالعلا گنجوی۔ ۳۰۰۔ ۳۰۱
ابوعلی حسن ابن احمد ابن حسین۔ شرف الملک ۷۵۔ ۷۹
۔ ۸۰۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۱۱۲۔ ۱۱۳۔ ۱۱۴۔ ۱۱۷۔ ۳۱۹
ابوالفتح غیاث الدین مسعود بن محمد بن ملک شاہ ۶۷۔ ۶۸
۱۳۱۔ ۱۳۲۔ ۱۳۵۔ ۲۰۳۔ ۳۲۲۔ ۳۲۳
ابوالقاسم ذخیرالدین زید بن الحسن۔ سید اجل ۵۳۔ ۵۴
۔ ۵۵۔ ۱۴۵
ابوالقاسم قوام الدین ناصر بن حسین الدرگزینی
الانساباذی۔ ۴۹۔ ۵۰۔ ۳۰۸۔ ۳۱۵۔
ابوالقاسم مجدالدین علی ۱۹۷۔ ۲۰۲
ابوالقاسم محمود بن محمد۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۶۷۔ ۱۶۸۔ ۱۶۹۔
ابوالقاسم نصیرالدین محمود بن مظفر۔ ۵۰
ابومحمد حسن بن ابونصر منصور قاینی۔ ۷۷۔ ۷۸
ابومحمد عبدالجبار بن عبدالجبار بن محمد ثابتی الخرقی۔ ۱۴۵۔
۱۴۶۔ ۱۴۷۔ ۳۲۵
ابومحمد قوام الدین بن ناصرالدین طاہر۔ ۱۶۱۔ ۱۶۲۔ ۲۵۲
ابوالمظفر شہاب الدین غوری۔ ۱۸۔ ۳۲۳
ابوالمعالی رازی۔ ۳۳۱
ابوالمعالی رازی۔ ۳۳۱
ابوالمعالی نصراللہ بن محمد۔ ۳۱۴
ابومنصور واہسوذان۔ ۱۹۵۔ ۱۹۶
ابونصر محمد بن احمد حسین بن احمد۔ ۲۶۲۔ ۳۱۳۔ ۳۱۴۔
۳۱۵
ابونصر جمال الدین احمد بن محمد بن سلیمان۔ صدرالاسلام
۸۹۔ ۹۰۔ ۹۱
ابونصر محمد بن مسعود بن مملان۔ ۱۹۵
ابونصر محمد بن محمد بن عبدالحمید۔ ۵۱۔ ۷۵۔ ۷۷۔ ۷۸۔
۷۹۔ ۸۰۔
اتسز بن محمد خوارزم شاہ۔ ۱۴۴۔ ۱۴۵۔ ۱۴۶۔ ۱۴۷۔
۱۹۸۔ ۱۹۹۔ ۲۵۰۔ ۳۲۵۔
احسن مارہروی۔ ۳۲۹
احمد بن حسین۔ ۸۲۔ ۳۱۳
احمد پیروز شاہ، سلطان۔ ۵۹
احمد بن عمر۔ (خازن)۔ ۸۷۔ ۱۷۴۔ ۳۱۵
ادیب صابر۔ ۲۳۔ ۱۹۲۔ ۱۹۶۔ ۲۰۲۔ ۲۱۰۔ ۲۵۵۔ ۳۰۱
۔ ۳۳۲۔ ۳۳۷
ارسلان خاں۔ ۳۴۔ ۱۵۱۔ ۳۱۸۔ ۳۴۱۔ ۳۴۳
ارسلان شاہ بن کرمان شاہ۔ ۳۳۰۔ ۳۳۱
ارغون ملک۔ ۱۹۰
اسلم فرخی، ڈاکٹر۔ ۹۔ ۱۰۔
اسعد، سعدالدین شہاب۔ ۳۴۰۔

اسیر، میرزا جلال اسیر۔ ۳۴۳

اطہر ہاپوڑی۔ ۳۴۳۔

افتخار احمد عدنی۔ ۹

اقبال احمد۔ ۱۰

الخان حسینی۔ ۵۳۔

الراشد عباسی، خلیفہ۔ ۱۳۱

المسترشد باللہ۔ خلیفہ۔ ۵۰

ام الفضل امامہ بنت حضرت امیر حمزہ۔ ۶۳

انوشرواں بن خالد۔ ۵۰

انوری۔ ۸۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۵۔ ۱۴۸۔ ۱۶۰۔ ۱۶۲۔ ۱۹۸۔ ۲۱۲۔ ۲۱۳۔ ۲۱۴۔ ۲۱۵۔ ۲۱۷۔ ۲۳۷۔ ۲۴۳۔ ۲۴۴۔ ۲۵۴۔ ۲۵۶۔ ۲۷۴۔ ۲۹۵۔ ۲۹۶۔ ۳۱۶۔ ۳۲۴۔ ۳۲۵۔ ۳۲۷۔ ۳۲۸۔ ۳۳۰۔ ۳۳۸

اویس قرنی۔ ۱۵۸

ایتھے، ڈاکٹر۔ ۳۴۱

(ب)

بارتولڈ۔ ۶۵

بتول، ملاحظہ فرمائیں فاطمہ رضی اللہ عنہا

براؤن۔ پروفیسر ۲۲۔ ۵۷۔ ۶۵۔ ۱۱۷۔ ۱۲۹۔ ۱۴۸۔ ۲۰۴۔ ۲۲۹۔ ۲۹۷۔ ۳۰۳۔ ۳۰۹۔ ۳۳۰۔

برہان الدین۔ ملاحظہ فرمائیں ابوالحسن برہان الدین علی بن ناصر

برہانی۔ ۳۰۰

بغراخاں بن ارسلان خان ۱۵۱۔ ۱۵۶۔

بوزابہ۔ ۶۸۔ ۱۳۵

بہاء۔ ملک الشعرا۔ ۲۲۹

بہاء الدین۔ ۱۸

بہاء الدین سام سوری۔ ۹۱

بہرام شاہ بن مسعود، ۷۔ ۸۔ ۹۔ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۲۔ ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱۔ ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۵۱۔ ۵۳۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۵۔ ۷۷۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۷۔ ۹۱۔ ۹۵۔ ۹۴۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۹۹۔ ۱۰۰۔ ۱۰۵۔ ۱۰۶۔ ۱۰۷۔ ۱۰۸۔ ۱۰۹۔ ۱۱۰۔ ۱۱۱۔ ۱۱۸۔ ۱۲۱۔ ۱۲۲۔ ۱۲۴۔ ۱۲۹۔ ۱۳۰۔ ۱۳۸۔ ۱۳۹۔ ۱۴۷۔ ۱۷۴۔ ۱۷۵۔ ۱۷۶۔ ۱۷۸۔ ۱۷۹۔ ۱۸۰۔ ۱۸۱۔ ۱۸۲۔ ۱۸۳۔ ۱۸۶۔ ۱۹۴۔ ۲۰۱۔ ۲۰۴۔ ۲۰۹۔ ۲۱۰۔ ۲۱۱۔ ۲۱۲۔ ۲۲۳۔ ۲۲۵۔ ۲۲۶۔ ۲۲۸۔ ۲۴۰۔ ۲۴۲۔ ۲۵۷۔ ۲۶۳۔ ۲۸۸۔ ۲۸۹۔ ۲۹۰۔ ۲۹۱۔ ۳۰۳۔ ۳۰۵۔ ۳۱۲۔ ۳۱۴۔ ۳۱۵۔ ۳۱۶۔ ۳۱۷۔ ۳۱۸۔ ۳۲۲۔ ۳۴۱

بیہقی۔ ۶۵

(پ)

پیغو ملک حسن بن علی، الملک المعظم۔ ۱۸۳۔ ۱۸۴

(ت)

تاج الدولہ ملاحظہ فرمائیں ابوالحسن نجیب الدین حسین بن ابو علی حسن۔ نجیب الملک

تاج الدین ابوطالب بن دارست شیرازی ملاحظہ فرمائیں۔ ابوطالب تاج الدین

تاج الدین بن ابوالقاسم ذخر الدین زید بن حسن ۵۵۔

تغری طغان بیگ (محمد بن سلیمان کاشغری) ۴۷۔ ۴۸۔ ۵۰۔ ۱۴۸۔ ۱۷۶۔ ۲۴۲۔ ۳۰۷

تقی اوحدی۔ ۱۵

تقی مدرس۔ ۹

تکش خاں خوارزم شاہ۔ ۲۹۹۔

(ٹ)

ٹیپو سلطان شہید۔ ۱۱

(ج)

جامی، عبدالرحمٰن جامی۔ مولانا۔ ۲۸۴۔۲۸۵۔۳۳۳
جبرئیل۔ جبرائیل، روح الامین۔ ۹۴۔۱۲۶۔۲۴۸۔ ۲۶۰۔۲۶۱
جبلی۔ عبدالواسع ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۳۰۳
جعفر طیار (رضی اللہ عنہ) حضرت۔ ۱۱۹
جمال الدین۔ ۳۳۸۔۳۳۹
جمال الدین احمد۔ ۵۱
جمال الدین خطیب۔ ۳۱۶
جمال الدین محمد۔ امیر، ظہیر الدولہ ۱۳۹۔ ۱۴۰۔ ۱۴۱۔ ۱۴۲۔۱۴۳
جمال الدین محمد عبدالرزاق اصفہانی ۱۵۔ ۲۱۔ ۲۰۲۔ ۲۰۴۔۲۰۵۔۲۱۴۔۲۱۵۔۲۱۶۔۲۹۹
جمال نقاش اصفہانی ۲۹۵۔
جمشید (شاہ ایران) ۱۵۸
جمشید بن اسعد۔ ۳۱۱
جی۔ اے۔ مدنی۔ ۹

(چ)

چغری بیگ۔ ۳۰۶

(ح)

حاتم طائی۔ ۱۰۲۔ ۱۴۰۔ ۲۰۹
حبیب اللہ خاں، امیر۔ ۱۷۰
حسان (رضی اللہ عنہ) حضرت۔ ۷۷۔ ۸۵۔ ۱۸۲
حسن۔ اشرف الدین حسن غزنوی، سید۔ ۶۔ ۷۔ ۸۔ ۹۔ ۱۱۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۷۔ ۱۸۔ ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۵۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۴۰۔ ۴۴۔ ۴۸۔ ۵۰۔ ۵۱۔ ۵۷۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۳۔ ۶۵۔ ۶۸۔ ۷۵۔ ۷۸۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۹۳۔ ۹۴۔ ۱۰۳۔ ۱۰۸۔ ۱۱۷۔ ۱۱۸۔ ۱۲۱۔ ۱۲۴۔ ۱۳۱۔ ۱۳۵۔ ۱۴۹۔ ۱۵۱۔ ۱۵۳۔ ۱۵۹۔ ۱۶۰۔ ۱۶۱۔ ۱۶۲۔ ۱۶۳۔ ۱۶۵۔ ۱۶۷۔ ۱۶۹۔ ۱۷۰۔ ۱۷۱۔ ۱۷۲۔ ۱۷۴۔ ۱۷۷۔ ۱۷۸۔ ۱۷۹۔ ۱۸۰۔ ۱۸۱۔ ۱۸۲۔ ۱۸۳۔ ۱۸۴۔ ۱۸۵۔ ۱۸۷۔ ۱۸۸۔ ۱۹۰۔ ۱۹۱۔ ۱۹۲۔ ۱۹۳۔ ۱۹۴۔ ۱۹۵۔ ۱۹۶۔ ۱۹۷۔ ۱۹۹۔ ۲۰۱۔ ۲۰۲۔ ۲۰۳۔ ۲۰۴۔ ۲۰۵۔ ۲۰۷۔ ۲۰۸۔ ۲۱۰۔ ۲۱۱۔ ۲۱۲۔ ۲۱۴۔ ۲۱۵۔ ۲۱۶۔ ۲۱۷۔ ۲۱۹۔ ۲۲۰۔ ۲۲۱۔ ۲۲۲۔ ۲۲۳۔ ۲۲۴۔ ۲۲۵۔ ۲۲۶۔ ۲۲۷۔ ۲۲۸۔ ۲۲۹۔ ۲۳۹۔ ۲۴۱۔ ۲۴۲۔ ۲۴۳۔ ۲۴۶۔ ۲۵۲۔ ۲۵۳۔ ۲۵۴۔ ۲۵۵۔ ۲۵۹۔ ۲۶۶۔ ۲۶۷۔ ۲۷۲۔ ۲۷۳۔ ۲۷۴۔ ۲۷۵۔ ۲۷۶۔ ۲۷۷۔ ۲۷۹۔ ۲۸۱۔ ۲۸۳۔ ۲۸۴۔ ۲۸۵۔ ۲۸۶۔ ۲۸۸۔ ۲۹۳۔ ۲۹۵۔ ۲۹۷۔ ۲۹۸۔ ۲۹۹۔ ۳۰۵۔ ۳۰۶۔ ۳۰۷۔ ۳۰۹۔ ۳۱۰۔ ۳۱۱۔ ۳۱۲۔ ۳۱۳۔ ۳۱۴۔ ۳۲۱۔ ۳۲۲۔ ۳۲۳۔ ۳۲۴۔ ۳۲۵۔ ۳۲۶۔ ۳۲۹۔ ۳۳۱۔ ۳۳۴۔ ۳۳۵۔ ۳۳۶۔ ۳۳۷۔ ۳۳۸۔ ۳۳۹۔ ۳۴۰
حسن، سید حسن۔ ۱۸
حسن، (علاؤالدین حسین کادادا) ۹۳
حسن، قاضی۔ ۳۰
حسن بن حسین بن عیسیٰ بن زید۔ ۳۲۹
حسن بن علی (رضی اللہ عنہ) امام۔ ۱۵۹
حسن بن لطف اللہ۔ ۱۴
حسن بن ناصر علوی، سید۔ ۱۷۔ ۱۸۔ ۲۸۹
حسین (حسن بن احمد کادادا) ۸۲
حسین بن ابراہیم علوی۔ ۴۰
حسین بن حسن۔ ۱۷۹۔ ۱۸۳۔ ۲۶۲۔ ۲۶۵۔ ۳۱۹۔ ۳۲۰
حسین بن حسین بن حسن۔ ۹۳۔ ۲۵۹
حسین بن علی رضی اللہ عنہ، حضرت امام، ۱۱۴۔ ۱۵۹
حسینی، عبدالحئی۔ ۳۲۱
حمد اللہ، مستوفی۔ ۱۶۸

حمزہ رضی اللہ عنہ، سید الشہدا، حضرت، امیر۔ ۶۲۔ ۶۳

حمید الدین، قاضی۔ ۳۳۰

حنظلہ بادغیسی۔ ۲۷۰

(خ)

خاقان محمود۔ ۶۴۔ ۶۵

خاقانی شروانی۔ ۱۹۸۔ ۳۳۰

خالد بن ربیع۔ ۳۳۸

خالد مالکی۔ ۱۵۸۔ ۱۶۰۔ ۱۶۱۔ ۱۶۲۔ ۱۷۵۔ ۱۸۲

خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ۔ ۱۵

خسرو ملک غزنوی۔ ۱۹۷

خسرو شاہ بن بہرام شاہ۔ معز الدولہ ۵۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۹۱۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۱۰۷۔ ۱۰۸۔ ۱۴۷۔ ۱۷۵۔ ۱۷۶۔ ۱۹۰۔ ۱۹۱۔ ۳۱۲۔ ۳۱۴۔

خضر (خواجہ) ۴۴۔ ۱۹۴

خلیلی، خلیل اللہ۔ ۱۷۰۔ ۱۸۱

خواجہ بونصر۔ ملاحظہ فرمائیں ابونصر محمد بن عبد الحمید۔

خواجہ کرمانی۔ ۳۳۶

خواجہ مخلص۔ ۳۱۱

خیام۔ عمر خیام۔ ۲۲۷۔ ۲۸۷۔ ۳۱۰

(د)

دقیقی طوسی۔ ۲۲۹۔ ۲۳۲۔ ۲۷۱۔ ۳۴۲

دولت شاہ (بن بہرام شاہ) ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۲۶۲۔ ۲۸۹۔ ۳۱۲۔

دولت شاہ سمرقندی۔ ۲۲۔ ۵۷۔ ۱۱۷۔ ۱۶۷۔ ۱۶۸۔ ۱۹۲۔ ۱۹۳۔ ۲۰۴۔ ۲۹۷۔ ۳۰۹۔ ۳۲۹۔ ۳۳۰۔ ۳۳۶

(ذ)

ذخیر الدین۔ ملاحظہ فرمائیں ابوالقاسم زید بن الحسن (سید اجل)

(ر)

راوری۔ ۷۔ ۱۸۱۔ ۳۰۳۔ ۳۱۲۔ ۳۱۸

رستم۔ (ایران کا داستانی پہلوان) تہمتن ۹۶۔ ۱۰۲۔ ۱۵۳۔ ۱۵۸۔ ۲۰۹۔

رشید جامہ دار۔ ۱۶۳۔ ۱۶۴۔ ۳۲۸

رضوی، مسعود حسن، پروفیسر۔ ۲۹۔ ۳۲۶۔ ۳۳۱

رضی نیشاپوری۔ ۲۵۴۔ ۳۳۹۔ ۳۴۰

رفیع الدین لبنانی۔ ۳۰۹

رکن الدین محمود خاں بن ارسلان خان بغراخانی ۲۲۔ ۱۴۸۔ ۱۵۰۔ ۱۵۱۔ ۱۵۸۔ ۱۵۹۔ ۱۶۰۔ ۱۶۱۔ ۱۶۲۔ ۲۹۵۔ ۳۲۷۔ ۳۲۸

روحانی غزنوی ابوبکر بن محمد بن علی۔ ۱۰۳۔ ۱۸۲۔ ۲۱۰۔ ۲۱۱۔ ۲۱۲۔ ۲۱۵۔ ۳۱۷۔ ۳۲۰۔ ۳۳۲۔

رودکی۔ ۲۲۹۔ ۲۳۲۔ ۲۷۱۔ ۲۹۶۔ ۳۴۲۔

رومی۔ جلال الدین رومی، مولانا
۶۔ ۲۷۴۔ ۲۷۵۔ ۳۲۹

رونی، ابوالفرج رونی
۲۲۸۔ ۲۳۷۔ ۲۳۸۔ ۲۹۵۔ ۲۹۶۔ ۲۹۷

رئیس الدین۔ ۱۴۳

(ز)

زہرا رضی اللہ عنہا۔ ملاحظہ فرمائیں فاطمہ رضی اللہ عنہا

زہرہ۔ (رقاصہ فلک) ۲۱۹۔ ۲۴۹

زید بن حسن۔ ملاحظہ فرمائیں فخر الدین زید بن الحسن الحسینی زین الدین عبد الجبار احمد۔ ۳۲۵

(س)

سبکی (صاحب طبقات الشافعیۃ الکبریٰ) ۱۴۷۔ ۲۵۷

سراجی۔ ۳۱۷

سعد الدین دراوینی۔ ۱۷۷۔ ۳۲۷

سعدی شیرازی۔ ۲۷۶ـ۲۸۰
سکندر (شاہ یونان)۔ (اسکندر) ۳ـ ۷۳ـ ۱۳۴ـ ۱۳۶ـ ۱۴۹
سلیمان شاہ بن محمود۔ ۸ـ ۱۴۳ـ ۱۶۲ـ ۱۶۵ـ ۱۶۶ـ ۱۶۷ـ ۱۶۸ـ ۱۶۹ـ ۲۵۲ـ ۲۵۳ـ ۳۲۷
سلیمان ندوی، سید، مولانا ۷ـ ۳۰۷ـ ۳۰۸ـ ۳۴۳
سنائی غزنوی، حکیم۔ ۶ـ ۷ـ ۱۶ـ ۱۹ـ ۲۸ـ ۲۹ـ ۳۰ـ ۵۱ـ ۵۸ـ ۶۸ـ ۱۳۷ـ ۱۸۹ـ ۲۷۴ـ ۲۷۵ـ ۲۷۹ـ ۲۸۶ـ ۲۹۵ـ ۲۹۶ـ ۲۹۷ـ ۳۰۰ـ ۳۰۱ـ ۳۰۳ـ ۳۱۸ـ ۳۳۱ـ ۳۴۱
سنجر، سلطان۔ ۲۳ـ ۲۴ـ ۲۵ـ ۲۶ـ ۲۷ـ ۲۸ـ ۳۰ـ ۳۲ـ ۳۳ـ ۴۳ـ ۴۴ـ ۴۷ـ ۵۰ـ ۵۱ـ ۵۲ـ ۵۳ـ ۵۹ـ ۶۴ـ ۶۵ـ ۷۲ـ ۷۴ـ ۹۳ـ ۱۲۹ـ ۱۳۷ـ ۱۳۸ـ ۱۳۹ـ ۱۴۱ـ ۱۴۴ـ ۱۴۸ـ ۱۴۹ـ ۱۵۱ـ ۱۶۲ـ ۱۶۹ـ ۲۰۲ـ ۲۲۶ـ ۲۶۱ـ ۳۱۲ـ ۳۱۵ـ ۳۲۷ـ ۳۲۸ـ ۳۳۶ـ ۳۴۱ـ
سوری۔ ملاحظہ فرمائیں سیف الدین سوری
سوزنی۔ ۲۳ـ ۳۰۱
سہیلی۔ ۳۳۳
سید اجل۔ ملاحظہ فرمائیں ابوالقاسم ذخیر الدین زید بن الحسن
سید محمد ملاحظہ فرمائیں محمد بن ناصر علوی
سیدہ بنت ناصر۔ ۳۳۷
سیف الدین سوری۔ ۸۲ـ ۹۰ـ ۹۱ـ ۹۳ـ ۹۴ـ ۹۶ـ ۹۸ـ ۱۰۹ـ ۲۸۸ـ ۳۱۵

(ش)

شاداں بلگرامی۔ ۲۳۳
شاہ بن حسن۔ ۵۳ـ ۵۵ـ ۵۶
شہنشاہ بن بہرام شاہ۔ معین الدولہ ۹۱ـ ۹۶ـ ۱۰۷ـ ۱۰۹ـ ۱۱۰ـ ۱۱۱
شبلی نعمانی، مولانا۔ ۲۴۲
شرف الدین محمد شفروہ۔ ۱۸ـ ۲۱ـ ۲۱۶ـ ۲۱۷
شرف الدین محمد غزنوی۔ ۱۶
شریف علوی محمد ابو شجاع۔ ۱۵۱
شالی دہستانی۔ ۱۹۷
شمس الدین طبسی۔ ۳۳۴
شمس الدین احمد بن منوچہر، شصت کلہ۔ ۲۹۵ـ ۲۹۶
شمس الدین محمد بن قیس رازی۔ ۲۵۳ـ ۳۳۹

(ص)

صدر الدین محمد نظام الملک بن مظفر ـ ۱۹ـ ۲۳ـ ۲۵ـ ۲۶ـ ۲۷
صدیقی، عبدالستار، ڈاکٹر۔ ۹

(ض)

ضیاء احمد بدایونی، پروفیسر۔ ۶ـ ۳۲۶
ضیاء الحق صوفی۔ ۲۳۵
ضیاء الدین بلخی۔ ۳۲۵
ضیاء الدین مودود احمد عصمی۔ ۵۹

(ط)

طغان ملک بن ملک موید آی آبہ۔ ۲۲۱ـ ۲۹۹
طغرل بن محمد بن ملک شاہ۔ ۵۰

(ظ)

ظہیر الحق محمد بن مسعود الادیب بن الزکی الغزنوی، الحکیم ۲۹۹
ظہیر فاریابی۔ ۳۳۳

(ع)

عباس (رضی اللہ عنہ) حضرت۔ ۶۱
عباس اقبال (ایرانی دانش مند) ۷ـ ۱۴۷ـ ۳۳۰

عباس مروزی۔ ۲۲۹۔ ۳۴۲

عباسی، عبدالصمد عباسی۔ ۶۱۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۳۱۰

عبدالحق، مولوی (بابائے اردو)۹

عبدالغنی، پروفیسر۔ ۱۹۲۔ ۲۲۵۔ ۳۴۱

عبدالقادر بدایونی۔ ۲۵۔ ۳۱۔ ۱۲۹

عبدالقادر جیلانیؒ، شیخ۔ ۳۲۲

عبداللہ ابن المقفع۔ ۳۱۴

عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت۔ ۱۰۱

عثمان مختاری۔ ۲۳۔ ۲۹۔ ۱۹۲۔ ۱۹۳۔ ۱۹۵۔ ۱۹۶۔ ۱۹۷
۔۲۲۸۔ ۲۵۶۔ ۳۰۱۔ ۳۰۳۔ ۳۱۲۔ ۳۳۰۔ ۳۳۱۔
۳۳۲۔ ۳۴۱

عراقی، فخرالدین عراقی۔ ۲۷۴۔ ۳۳۷

عرفی، جمال الدین عرفی۔ ۳۰۴۔ ۳۳۷

عزالدین اصفہانی۔ ۳۰۸

عزالدین طغرائی۔ ملاحظہ فرمائیں عزیزالدین طغرائی

عزیزالدین طغرائی۔ ۶۵

عسجدی۔ ۲۳۳

عطار، فریدالدین عطار، شیخ۔ ۲۷۵

علاؤالدین حسین سوری۔ جہاں سوز ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳۔
۱۲۴۔ ۱۳۰۔ ۱۳۸۔ ۱۳۹۔ ۱۶۰۔ ۲۲۲۔ ۳۲۳۔ ۳۲۷۔

علی احمد۔ ۶۷

علی بن عثمان۔ ملاحظہ فرمائیں ابوالحسن ظہیر الدین علی
بن عثمان

علی (کرم اللہ وجہہ) حضرت مرتضٰی، حیدر، بوتراب
۴۰۔ ۵۱۔ ۵۴۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۹۶۔ ۱۰۱۔ ۱۱۸۔
۱۵۳۔ ۲۰۴۔ ۲۰۸۔ ۲۵۵

عمادزوزنی۔ ۲۲۔ ۲۹۹

عمادی شہریاری۔ ملاحظہ فرمائیں عمادی غزنوی

عمادی غزنوی۔ ۲۳۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۱۰۸۔ ۱۴۷۔ ۱۸۹
۔۱۹۰۔ ۱۹۲۔ ۲۲۰۔ ۲۲۱۔ ۲۲۲۔ ۲۲۳۔ ۲۲۴۔ ۲۵۵۔
۲۹۵۔ ۲۹۶۔ ۳۰۰۔ ۳۰۱۔ ۳۱۰۔ ۳۱۸۔ ۳۳۱

عمارہ بن حضرت امیر حمزہؓ۔ ۶۲

عمر فاروق رضی اللہ عنہ۔ حضرت۔ ۵۱۔ ۱۰۱

عنصری۔ ۲۲۸۔ ۲۳۳۔ ۲۳۵۔ ۲۳۸۔ ۲۷۲۔ ۲۹۵۔
۲۹۶

(غ)

غازی (والی ہرات) ۱۸

غالب۔ اسداللہ بیگ خاں۔ ۲۲۷۔ ۲۸۵۔ ۳۳۵

غلام حسین ابن میر حسن علی۔ مرزا۔ ۱۷۰

غلام مصطفٰے خاں۔ ڈاکٹر۔ ۱۰

غوری۔ ملاحظہ فرمائیں، ابوالمظفر شہاب الدین غوری

(ف)

فاطمہ رضی اللہ عنہا، حضرت۔ ۱۱۴۔ ۱۱۸۔ ۲۰۴

فرخی۔ ۲۳۳۔ ۲۳۸

فخرالدین زید بن الحسن الحسینی۔ ۵۳۔ ۳۰۹

فخرالدین مبارک شاہ۔ ۳۴۱

فخرالدین محمد بن محمود بن احمد نیشاپوری، امام۔ ۳۰۸

فخرالملک۔ ملاحظہ فرمائیں مظفر فخرالملک بن نظام الملک

فردوسی۔ ۸۔ ۲۹۶۔

فرزوق (شاعر) ۳۱۷۔

فضلی۔ ۲۶۹۔ ۲۷۳۔ ۳۴۲

فلکی شیروانی۔ ۳۰۱

فیضی۔ ۸۔ ۲۸۴۔ ۲۸۵۔ ۳۳۵

(ق)

قاآنی۔ ۲۴۶

قطب الدین محمد سوری۔ ۹۱

قطران، حکیم ۱۹۵۔ ۱۹۶۔ ۱۹۷۔ ۱۹۸۔ ۳۳۰۔ ۳۴۲

قوام الدین حسن۔ ۸۶۔ ۱۴۸۔ ۱۶۱۔ ۱۶۲۔ ۳۰۷۔
۳۰۸۔ ۳۱۵۔ ۳۲۷

قوام الدین حسن بن احمد بن حسین، شمس المعالی
۸۲۔۸۳۔۸۴۔۱۷۹۔۱۸۰۔۲۴۶۔۳۱۳۔۳۳۷

(ک)

کرک پیٹرک۔۱۴۸
کمال الدین اسماعیل۔۲۱۔۲۰۶۔۲۰۷۔۲۲۶۔۲۹۹
کمالی بخارائی۔۲۹۷۔۳۳۶
کیخسرو۔۴۳۔۷۷۔۱۰۲۔۱۴۹۔۲۰۹

(گ)

گور خاں قراختائی۔۵۸

(ل)

لطیف اللہ، پروفیسر۔۱۰
لقمان حکیم۔۱۰۱
لین پول۔۳۰۶

(م)

مامون بن ہارون الرشید، خلیفہ۔۲۲۹
مانی (داستانی مصور)۔۱۱
مجد الدین، سید۔۹۳
مجد الدین احمد نسفی۔۳۲۱
مجد الدین بن رشید۔۳۴۰
مجد الدین عمرانی۔ ملاحظہ فرمائیں ابوالحسن مجد الدین عمرانی
مجد الدین بن عدنان۔۳۴۰
مجد الدولہ عبدالرشید بن مسعود بن محمود غزنوی۔۳۱۴
مجیر الدین بیلقانی۔۲۱۔۲۰۵۔۲۱۷۔۲۱۸۔۲۱۹۔۲۲۶
مجیر الدین محمد۔۵۳
محمد اقبال، ڈاکٹر۔۲۱۔۱۸۴۔۲۸۷۔۲۹۰۔۳۰۷۔
۳۲۷
محمد انیس اخوند، ملک۔۱۴
محمد بن ابراہیم۔۳۲۸
محمد بن سلیمان کاشغری۔ ملاحظہ فرمائیں تغری طغان بیگ
محمد بن مسعود غزنوی۔۲۱۔۱۵۰۔۱۵۱
محمد بن منصور بن سعید بن احمد بن حسن میمندی
ملاحظہ فرمائیں محمد بن منصور قاینی۔
محمد بن منصور بیہقی۔۳۰۸
محمد بن منصور قاینی۔۳۱۲۔۳۱۳
محمد بن منصور لاہوری۔۹۶۔۳۱۲
محمد بن ناصر علوی (سید محمد)۔۱۶۔۱۷۔۱۸۔۲۹۷۔
۲۹۸
محمد پادشاہ منشی۔۷۔۱۷۴
محمد خوارزم شاہ۔۱۵۰
محمد سلیمان قاضی۔۶۲
محمد شفیع، ڈاکٹر۔۹۔۷۔۱۴۷۔۲۹۹۔۳۲۶۔۳۲۸
محمد عوفی۔۱۶۔۱۸۔۹۳۔۲۰۴۔۲۲۹۔۲۸۷۔۳۴۳
محمد منصور۔ ملاحظہ فرمائیں ابو محمد حسن بن منصور۔
محمود بن محمد بن ملک شاہ۔۵۰۔۱۳۲۔۱۳۳۔۱۵۰۔۱۵۱
۔۱۵۲۔۱۵۳۔۱۵۴۔۱۵۵۔۱۵۶۔۱۵۷۔۱۶۲۔
محمود بن ملک شاہ۔ ملاحظہ فرمائیں محمود سلجوقی
محمود خاں بغراخانی۔ ملاحظہ فرمائیں، رکن الدین محمود خاں بن ارسلان خاں
محمود روباہی۔۱۹۳
محمود سلجوقی، سلطان۔۶۷۔۳۰۷
محمود شیرانی، حافظ، پروفیسر۔۲۹۔۱۴۸۔۱۶۰۔۱۷۸۔
۲۱۲۔۲۲۵۔۲۲۹۔۲۷۱۔۲۷۴۔۲۸۶۔۲۸۷۔۲۹۹۔
۳۰۴۔۳۳۲۔۳۴۲۔۳۴۳
محمود غزنوی۔ سلطان۔۲۳۳۔۲۷۲۔۲۸۸۔۳۰۸
مختاری غزنوی۔۲۲۰۔۲۹۷
مرزا قزوینی۔۲۲۹
مسعود بن ابراہیم، سلطان۔۱۹۳

مسعود بن محمود۔ ۳۲۴
مسعود سعد سلمان۔ ۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۸۴۔ ۲۴۲۔ ۲۵۵۔
۲۷۳۔ ۲۸۴۔ ۲۸۵۔ ۲۹۷۔ ۲۹۸۔ ۳۰۵۔ ۳۳۲۔
۳۳۴۔ ۳۳۵۔ ۳۴۲۔
مسعود سلجوقی، سلطان۔ ۱۲۴۔ ۱۴۴۔ ۱۴۵۔ ۱۶۲۔
۱۶۳۔ ۱۶۷۔ ۲۶۱
مسعود شاہ بن بہرام شاہ، سماء الدولہ۔ ۹۱۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۱۰۷
مظفر فخر الملک بن نظام الملک۔ ۱۹۔ ۲۳۔ ۲۹۸۔ ۳۰۱۔
۳۰۳
معزی۔ ۲۳۔ ۱۸۶۔ ۱۸۷۔ ۲۵۵۔ ۲۹۵۔ ۲۹۶۔ ۳۰۰۔
۳۰۱۔ ۳۰۶۔ ۳۰۷۔ ۳۳۰۔ ۳۳۲
معین الدین۔ ۱۳۳۔ ۱۳۵۔ ۲۶۲
مغیث الدین ملک شاہ بن محمود بن محمد بن ملک شاہ ۱۷۔
۱۳۲۔ ۱۳۴۔ ۱۳۵۔ ۱۳۶۔ ۱۳۷۔ ۱۴۴۔ ۱۴۵۔ ۲۶۱۔
۳۲۳
ملک شاہ بن محمود۔ ملاحظہ
مغیث الدین ملک شاہ بن محمود بن محمد بن ملک شاہ
ملک محمد بن ارسلان۔ ۳۲۸
منصور بن محمد بن اسحاق۔ ۳۰۸
منصور بن علی اسفزاری۔ ۱۸
منوچہر خاقان شروان۔ ۳۰۰۔ ۳۰۱
منوچہری۔ ۲۳۳۔ ۲۳۵
موید آی آبہ۔ ۱۴۹۔ ۳۲۹
مہذب الدین۔ ملاحظہ فرمائیں، منصور بن علی اسفزاری

(ن)

ناصر ابن حسن۔ ملاحظہ فرمائیں، ابوالقاسم ناصر بن حسین الدرکزینی۔
ناصر ابن علی۔ ملاحظہ فرمائیں، ابوالقاسم ناصر بن حسین
ناصر حسین۔ ۴۸۔
ناصر خسرو۔ ۱۹۵
ناصر علوی۔ ملاحظہ فرمائیں، محمد بن ناصر علوی
ناصر الدین طاہر بن فخر الملک۔ ۱۴۸۔ ۱۶۲
نجم الدین، کافی ملک۔ ۱۸۹
نجیب الدین جردبادقانی۔ ۲۱۷
نسفی۔ نجم الدین نسفی۔ ۳۳۳
نظام استرآبادی۔ ۳۳۳
نظام الملک محمد۔ ۳۰۱۔ ۳۰۳
نظامی عروضی سمرقندی۔ ۲۹۶
نصر بن احمد۔ ۲۳۲
نصر اللہ بن محمد۔ ۱۷۹۔ ۳۲۰
نظیری نیشاپوری، محمد حسن نظیری۔ ۲۸۵۔ ۲۹۲۔
۳۳۵
نور اللہ شوستری۔ قاضی۔ ۲۰۷
نوشرواں، کسریٰ۔ ۱۰۲۔ ۱۳۶۔ ۲۰۹۔ ۲۴۴
نولدکہ، پروفیسر۔ ۲۷۔ ۳۴۲۔ ۳۴۳

(و)

وطواط۔ رشید الدین وطواط ۲۳۔ ۶۵۔ ۱۰۸۔ ۱۴۷۔ ۱۹۲
۱۹۸۔ ۱۹۹۔ ۲۰۲۔ ۲۰۳۔ ۲۰۴۔ ۲۱۰۔ ۳۲۵۔ ۳۳۰

(ہ)

ہادی حسن، ڈاکٹر۔ ۹۔ ۳۰۱۔ ۳۴۱
ہلاکو خاں۔ ۱۰۷۔ ۳۲۹
ہنٹر ڈبلیو ڈبلیو، سر۔ ۳۰۶

(ی)

یاقوت۔ ۵۰
یعلی بن حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ۔ ۶۲
یمین الدین، امیر بار۔ ۱۶۳۔ ۱۶۴
یوسف بن ناصر الکاتب۔ ۱۸۹۔ ۱۹۸۔ ۲۲۴